لِسانُ القرآن

قُرآنِ حکیم کا توضیحی لُغت

جِلدِ دُوُم

مولانا محمّد حنیف ندوی

لسانُ القرآن

قرآن حکیم کا توضیحی لغت

لسان القرآن

قرآن حکیم کا توضیحی لغت

جلد دوم

مولانا محمد حنیف ندوی

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ۔ لاہور

جملہ حقوق بحق ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ محفوظ

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 068178
★ MAILSI ★

طبع = اوّل

تعداد = ۱۱۰۰

قیمت 90/- روپے

ناشر :- ملک فیض بخش
(معتمد)

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

طابع :- سویرا آرٹ پریس
۱۵- سر کلر روڈ لاہور

ح

ح ب ب

اَلْحَبُّ ۔ جمع حُبُوْبٌ وحُبَّانٌ : دانہ ۔ قرآن حکیم میں ہے :

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ (الانعام : ۹۵)

[بے شک اللہ ہی دانہ اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے]۔

اَلْحُبَابُ : دوستی ۔

اُمُّ حُبَابٍ : دنیا ۔

اَلْحَبَابُ : بلبلہ ۔

طَفَا الْحَبَابُ عَلَى الْمَاءِ : پانی کی سطح پر بلبلے تیرنے لگے ۔

اَلْحُبُّ : دل سے چاہنا ۔ لگاؤ رکھنا ، وہ جذبہ جو ہر عمل میں تحریک پیدا کرتا ہے اور اس میں لطف و تقدیس کے پہلو کو نمایاں کرتا ہے ۔

حَبَّهٗ : اس کو چاہا ۔

يَتَحَبَّبُ : وہ اس کو چاہتا ہے ۔

هُوَ يَتَحَبَّبُ اِلَى النَّاسِ : وہ لوگوں میں محبوب ہے ، یا اپنی محبوبیت و پذیرائی کے لیے کوشاں ہے ۔

فُلَانٌ يُحَابُّ فُلَانًا : فلاں فلاں کو چاہتا ہے ، اس سے محبت رکھتا ہے ۔

اَصَابَتْ فُلَانَةُ حَبَّةَ قَلْبِهٖ : وہ عورت اس کے سویدائے قلب میں سما گئی ۔

اِسْتَحَبَّ : ترجیح دی۔ قرآنِ حکیم میں ہے :

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ (النحل : ۱۰۷)

[یہ اس سبب سے ہوگا کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی]۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے دنیا بھی اہم ہے اور آخرت بھی۔ لیکن آخرت کو اس بنا پر ترجیح حاصل ہے کہ یہ حقیقی اور ابدی زندگی ہے۔ اس بنا پر چاہیے کہ انسان دنیا کی نشاط آفرینیوں سے صرف اسی حد تک بہرہ مند ہو جس حد تک کہ یہ اس اُخروی زندگی کی تکمیل و ارتقا میں ممد و معاون ثابت ہو سکیں۔ انھیں مقصود و غایت جان کر انھی کا ہو رہنا کسی طور پر بھی قرینِ دانش نہیں۔ کفار کی محرومی یہ ہے کہ یہ آخرت کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر کے اپنی تمام تر تگ و دو کو دنیا ہی کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ عارضی اور بے ثبات دنیا ہرگز اس لائق نہیں کہ کوئی شخص اس کے لیے اپنی سب توانائیوں کو صرف کر ڈالے اور آخرت یا دائمی زندگی کے لیے کچھ بھی نہ کر پائے، جس میں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کی ارزانیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

لفظ حب یا محبت کا اطلاق، دو واضح معنوں پر ہوتا ہے، یا تو اس کا تعلق دنیوی اشیا اور انسان کے مابین اس رشتے پر ہوتا ہے جو فی نفسہٖ اس لائق ہو کہ دلوں کو بھائے اور یا پھر اس کا تعلق اقدارِ حیات، معانی اور ان حقائق سے ہوتا ہے جن کو چاہنا خود زندگی کو چاہنا ہے۔

خدا، رسول، کتاب و سنت اور جو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کی غرض سے تجویز فرمایا ہے، اس معانی ہی کے قبیل سے ہیں۔ یہ اصول اور ایسے حقائق ہیں جن سے ہماری اخلاقی و روحانی زندگی کا تار پود تیار ہوتا ہے اور ہم سیر و سلوک میں اس لائق ہوتے ہیں کہ دائرۂ ناسوت میں رہتے ہوئے عالمِ لاہوت کے انوار و تجلیات کا مشاہدہ کر سکیں، اور قلب و نظر کے لیے جلا اور روشنی کا اہتمام کر سکیں، یعنی اپنی تاریک اور سمٹی ہوئی بشریت کو نہ صرف تا بہ سماک پھیلا سکیں بلکہ اس کو روح و باطن کے اجالوں سے مستنیر بھی کر سکیں۔ یہی وجہ ہے، قرآنِ حکیم میں اللہ و رسول کی محبت پر خصوصیت سے زور دیا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ (البقرہ : ۱۶۵)

[اور جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ کی محبت میں قوی تر ہیں]۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط

(التوبہ : ۲۴)

[آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے لڑکے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارے کنبے اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جن کے بگڑ جانے سے تم ڈر رہے ہو اور وہ گھر جنھیں تم پسند کرتے ہو یہ سب تم کو اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز (محبوب) ہے تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے]۔

ان آیات میں واضح طور پر اللہ اور رسول کی محبت کو مدارِ دین و ایمان ٹھہرایا گیا ہے، اور ان لوگوں کو عذابِ الٰہی کی وعید سنائی گئی ہے، جن کے دل اس جذبۂ پاک سے تہی ہیں۔

اللہ کی ذات جمال و کمال کا وہ پیکر ستودہ صفات ہے، جس کو دل سے چاہنا، جس سے قلبی رشتۂ محبت و تودد استوار کرنا، جس سے لو لگانا، اور جس کے حسنِ بے انتہا اور کمال بے کراں سے کسب نور کرنا انسانیت کا مقصودِ اصل ہے۔ اسی طرح آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی بشریت کے اس حُسن و کمال پر فائز ہے، جس پر ایمان لانا اور اس کو تمام رشتوں سے عزیز تر جاننا، عالمِ بشریت کے کمال اور بشریت کے ارتقائے روحانی کے لیے از بس ضروری ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ لیکن بُرا ہو سطحیت اور جہل و نادانی کا کہ کچھ لوگ تصوف دشمنی میں سرے سے اللہ و رسول کی محبت کو ضروری نہیں سمجھتے۔ ان کی رائے میں، اس محبت سے مراد صرف احکام الٰہی کو ماننا ہے اور بس۔

ان کو کون سمجھائے کہ اس محبت کے بغیر جو اللہ اور اس کے رسول سے قائم و استوار ہو ان کی تعلیمات و احکام کی پیروی کیوں کر ممکن ہے؟ اور اگر اس حقیقت سے قطع نظر کر کے یہ مان ہی لیا جائے کہ صرف احکام و مسائل کی پیروی و اطاعت ہی دین ہے تو سوال یہ ابھرتا ہے کہ پھر اسلام اور سیکولر نظام ہائے حیات میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔ یہی نہیں، اس ضمن میں یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ یہودی فقیہ اور فریسی کیا اسی گمراہی میں مبتلا نہ تھے کہ مسائل،

احکام، الفاظ و حروف اور قانون ہی دین کا حاصل ہے۔

یہ لوگ نادانستہ یا دانستہ دراصل ان کوتاہ نظر مستشرقین کی تائید کر رہے ہیں، جنھیں قرآنِ حکیم میں کسی ایسے اونچے روحانی تصور یا نصب العین کا سراغ نہیں ملتا جو دلوں کو حقیقتِ معجزہ کے قریب کر دے۔ ان کے نزدیک اس کتاب میں بلاشبہ احکام و مسائل کی بھرمار ہے، مگر قلب کی بالیدگی کا ذکر نہیں، روح کے ارتقا و تزکیہ کی کوئی صورت نہیں، نیز باطن کے لطائف و معارف کو اجاگر کرنے کا کوئی طریقہ پایا نہیں جاتا۔ اور قرآن میں مذکور احکام و مسائل بھی ان کے نزدیک یہودیت ہی کا ایک ارتقائی چربہ ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ح ب ر

اَلحَبرُ: بفتح حار۔ جوہری کا کہنا ہے بکسر حار زیادہ فصیح ہے۔ جیّد عالم، بہت صالح، خصوصیّت سے تورات کے اسرار و رموز کا شناسا۔ حضرت ابنِ عباس نے اس کے معنی ایسے عالم کے کیے ہیں جو یہودی فقہ پر عبور رکھتا ہو۔ قرآن حکیم میں ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ: ۳۱)

[انھوں نے اللہ کے ہوتے ہوئے اپنے علما اور مشائخ کو اپنا پروردگار بنا رکھا ہے]۔

غرض یہ ہے کہ یہودی صرف اس بات کے مکلّف تھے کہ حضرت موسیٰ کی اطاعت کریں، ایک خدا کو مانیں اور اس کی تعلیمات کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں۔ لیکن انھوں نے جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے تمام معاملات کو اپنے علما و مشائخ کے سپرد کر دیا اور اس حقیقت کو بھول گئے کہ مطاعِ مطلق صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی ہے اور علما و مشائخ کے ارشادات صرف اس وقت حجیت و استناد کا درجہ اختیار کرتے ہیں جب وہ تورات کی تعلیمات کے مطابق ہوں۔

حِبرٌ: کے معنی دراصل حسین نقش یا اثرِ جمیل کے ہیں۔ اور علما کو احبار اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی ان کی علمی خدمات دلوں میں دمکتی رہتی ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی کا قول ہے:

اعیانھم مفقودۃ و اثارھم فی القلوب موجودۃ۔

ان کی شخصیتیں اگرچہ مٹ جاتی ہیں لیکن ان کے آثارِ علمی دلوں پہ برابر مرتسم رہتے ہیں۔

حُبُوْرٌ : خوشی، مسرت اور شادمانی۔ کہا جاتا ہے۔ لَبِسَ حَبِیْرَ الحُبُوْر۔ اس نے خوشی اور مسرت کی منقش چادر اوڑھ لی، یعنی بدرجہ غایت خوش ہوا۔

اَلحَبَارُ : نشان، داغ، اثر۔ حَبَارُ الضَرب۔ مارپیٹ کا نشان۔

اَلمِحْبَرَۃ : دوات۔

الحُبَارىٰ : سرخاب۔

يَحْبُوْرٌ : ایک پرندہ۔

حَبَرَہٗ : اس کو خوش کیا، شادکام کیا۔

حَبِرَ : خوش ہوا۔ قرآن حکیم میں ہے :

اُدْخُلُوا الْجَنَّۃَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ۝ (الزخرف : ۷۰)

[تم اور تمھاری بیویاں خوش خوش جنت جا داخل ہو]۔

زجاج نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ جنت میں تا بہ حد مبالغہ تمھیں اکرام سے نوازا جائے گا۔

حَبَّرَ الْكَلَامَ ۔ الشِعْرَ، الخطّ : کلام، شعر یا اسلوبِ تحریر کو آراستہ کیا، سنوارا۔

كَلَامٌ مُحَبَّرٌ : آراستہ پیراستہ کلام، ایسا کلام جو عمدہ اور حسین ہو، جسے قصداً بنا سنوار کر پیش کیا جائے۔

طفیل غَنَوِی کو جاہلیت میں اسی بنا پر مُحَبِّر کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے اشعار میں حسن و خوبی پیدا کرتا تھا۔

ح ب س

اَلحَبْسُ : قید کرنا، روکنا۔

اَلحِبْسُ : وہ پتھر جو پانی کے بہاؤ کو روکنے کے لیے رکھا جائے تاکہ جمع شدہ پانی سے چارپائے اور انسان اپنی پیاس بجھا سکیں۔

حِبْسُ سَبَلَ : حرہ میں ایک مقام کا نام۔

اَلحُبسَۃُ : لکنت، عجز اظہار۔ المبرزؔ نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ کوئی شخص کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں پاتا۔

اَلمُحبَسُ : قید خانہ۔

اَلحبیس : وقف شدہ گھوڑا۔ مکہ میں ایک مقام کا نام۔

حَبَسَہٗ : اس کو روک رکھا، قید کر لیا۔

اَحبَسَ المَالَ : مال کو خدا کی راہ میں وقف کر دیا۔ قرآنِ حکیم میں ہے :

تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ (المائدہ : ۱۰۹)

[تو دونوں گواہوں کو بعد نماز روک رکھو]۔

سیاق قرآن میں ایک مخصوص واقعہ کا ذکر ہے، یعنی جب دورانِ سفر کوئی شخص دو گواہوں کے سامنے کوئی مالی وصیّت کرے اور خود مر جائے اور وارثوں کو شبہ ہو کہ گواہ صحیح صورتِ حال بیان نہیں کر رہے ہیں، تو چاہیے کہ ان گواہوں کو عصر کی نماز تک روک لیا جائے، اور بعد نماز مؤکد با قسم بیان لیا جائے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں درست ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مسجد کا احترام، نماز کی عظمت اور اللہ تعالیٰ کے روبرو خشیّت وخوف کا اظہار ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے مسلمان جھوٹ بولنے کی جسارت نہیں کرتا۔

ح ب ط

حَبَطٌ : زخم کا نشان۔ آماس بدھی۔ ابن سیدہ کے نزدیک وہ درد جو اونٹ کے پیٹ میں فاسد چارا یا گھاس کھانے سے پیدا ہوتا ہے۔ نیز پیٹ کا پھول جانا، ابھر جانا۔

اَلحَبَطُ : الحرث بن مازن بن تمیم کا نام۔ اَلحَبَطَاتُ : اس کی اولاد۔

حَبِطَ : بے کار ہونا، برباد ہونا۔

حَبِطَ دَمُ القتیل : مقتول کا خون بے کار گیا، یعنی قصاص کا حق جاتا رہا۔

حَبِطَ عَمَلُہٗ : اس کا عمل برباد ہوا، اکارت گیا۔ قرآن حکیم میں ہے :

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ز (المائدہ : ۵)

[اور جو کوئی ایمان سے انکار کرے گا اس کا عمل اکارت جائے گا]

علامہ راغب نے حبطِ اعمال کی تین صورتیں بیان کی ہیں۔

(۱) ایسے کام جو دین کے ہوں لیکن ان کو دنیوی اغراض کے لیے انجام دیا جائے۔

(۲) دین کے ایسے کام جن میں ایمان باللہ، اخلاص اور اللہ کی رضا جوئی کا جذبہ مفقود ہو۔

(۳) وہ امور جن کا نہ صرف عقبیٰ و آخرت سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ یہ سراسر مجرمانہ ہوں اور معاشرے کو معصیت پر ابھارنے والے ہوں۔ ممکن ہے ان اعمال کو بظاہر دینی رنگ دیا جائے اور ان کو مفید سمجھا جائے۔ میزان احتساب میں ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ہی اعمال کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝ (الفرقان: ۲۳)

[اور ہم ان کے کاموں کی طرف متوجہ ہوں گے جو یہ کر چکے ہیں، سو ان کو ایسا کر دیں گے جیسے پریشان غبار]

عند اللہ انہی اعمال کی قدر و قیمت ہے جو قرآن و سنت کے مطابق ہوں اور ان میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو مدِّنظر رکھا جائے۔

ح ب ک

حَبَكَ: باندھنا، کپڑے کو عمدگی سے بُننا۔

اَلْحُبْكَةُ: ازار باندھنے کی جگہ، ازار بند۔

اَلْحَبَكَةُ: ستو، انگور کی جڑ۔ کہا جاتا ہے:

مَا ذقنا عنده حَبَكَةً وَلَا لَبَكَةً: ہم نے ان کے ہاں کچھ نہیں کھایا، نہ ستو اور نہ ثرید۔

اَلْمَحْبُوكُ: جسے عمدگی سے تیار کیا گیا ہو۔

حبیکۃٌ: طریق، راہ، راستہ۔ جمع حَبَائِكُ۔ قرآنِ حکیم میں ہے:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝ اِنَّكُمْ لَفِىْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝ (الذاریات: ۷،۸)

[قسم ہے آسمان کی جس میں راستے ہیں کہ تم مختلف گفتگوؤں میں پڑے ہوئے ہو]

سیاقِ آیت میں احوال آخرت کا ذکر ہے۔

کانٹ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میں خدا کا انکار کب کر سکتا ہوں، جب کہ میں اپنے اوپر تاروں بھرا آسمان (STARRY HEAVEN) دیکھتا ہوں، اور اپنے اندر خیر و شر کے امتیاز پر مبنی نظامِ اخلاق (MORAL ORDAR) دمکتا ہوا پاتا ہوں۔ غرض یہ ہے کہ جو شخص بھی کائنات کے اس پہلو پر غور کرے گا کہ آسمان پر نجوم و کواکب اپنے مقررہ راستوں پر گردش کر رہے ہیں اور دیکھے گا کہ اس کی دل کی گہرائیوں میں اقدارِ حیات کا ایک سرچشمہ اُبل رہا ہے تو وہ مجبور ہو جائے گا کہ نہ صرف اللہ تعالیٰ پر صدق دل سے ایمان لائے، بلکہ اس کے عجائبِ قدرت اور خوارقِ حکمت کا بھی اقرار کرے۔ لیکن برا ہو جہل و نادانی کا کہ مشرکینِ مکہ، اگرچہ اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرت کے کرشمے اپنے گرد و پیش پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں، پھر بھی ان کو یقین نہیں آتا کہ اس کائنات کو منصۂ شہود پر لانے والی ذاتِ گرامی اس پر بھی قادر ہے کہ اس کو ایک وقتِ خاص تک وجود و بقا کے پیراہن سے آراستہ و پیراستہ رکھے اور پھر جب چاہے اس کو فنا کر کے ایک نئے عالم کی طرح ڈال دے اور انہی انسانوں کی ایک نئی بستی بسا دے، جو اس سے زیادہ حسین، اس سے زیادہ کامل اور زیادہ پاکیزہ ہو۔

ان مشرکین کے سامنے جب قیامت اور اُخروی زندگی کا ذکر ہوتا ہے تو یہ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگتے ہیں۔ کوئی سرے سے خدا ہی کا انکار کر دیتا ہے اور کوئی یہ کہتا ہے کہ مان لیا کہ خدا ہے مگر جب انسان کی ہڈیاں ہی گل سڑ کر مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو جائیں گی تو دوبارہ ان سے بھلا زندگی کی نمو کیوں کر ہو پائے گی۔ یہی شکوک و شبہات کا الجھاؤ ہے جس میں یہ مشرکینِ مکہ پڑے ہیں۔ اسی کو قرآن نے "قولِ مختلف" کہا ہے۔ یعنی ان کے شکوک نہ تو کائنات کے عقلی اور گہرے مشاہدے پر مبنی ہیں اور نہ ایمان باللہ کی ضیا افروزیوں پر۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت کے معاملے میں ان کی گفتگوؤں میں شدید درجے کا اختلاف اور الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ ورنہ بات صرف اتنی سی ہے کہ جس خدا نے زندگی کا یہ دبستان سجایا ہے، وہ زندگی کا اس سے کہیں زیادہ

شگفتہ اور مکمل ایک اور گلستان بھی سجا سکتا ہے، جس میں روح و جسم کے تمام تقاضوں کی تکمیل و اتمام کا اہتمام ہو یعنی ایسا گلستاں جس میں غم، خوف اور حزن ایسی کسی شی کا وجود نہ ہو۔

ح ب ل

حَبَلَ : رسّی سے باندھا۔

حَبَلَ الصَّیْدَ : شکار کو پھندے میں پھنسا کر پکڑا۔

حَبِلَتِ المَرأۃ : عورت حاملہ ہو گئی۔

اَلْحَبلُ : رسی، عہد، ذمہ، خلق۔

کہا جاتا ہے، ھو علی حبل ذراعک : وہ تمہاری دسترس میں ہے۔

کان بینھم حبالٌ فقطعوھا : ان میں دوستی کا عہد و پیمان تھا لیکن انھوں نے اس کو توڑ دیا۔

انہ لواسع الحبل : وہ وسیع اخلاق کا مالک ہے۔

حبل کا لفظ رسی کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے :

فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝ (اللہب : ۵)

[اس کی گردن میں ایک رسی ہوگی خوب بٹی ہوئی]۔

ام جمیل، بولہب کی بیوی کے بارے میں پیشین گوئی ہے کہ اسلام کے خلاف جو یہ سازشیں کر رہی ہے اور اپنی لگائی بجھائی سے جو مسلمانوں میں اختلاف و سوءِ ظن پیدا کر رہی ہے، اس کو اپنے انجام کی خبر نہیں، یہ خودکشی کر کے مرے گی۔ چنانچہ یہی ہوا، اس کی موت گلے میں رسی کا پھندا ڈال لینے سے ہوئی۔

رگ کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے :

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۝ (ق : ۱۶)

[اور ہم تو اس کی رگِ گردن سے بھی بڑھ کر قریب ہیں]۔

جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذاتِ پاک کے لحاظ سے مخلوق سے بائن، بالکل مختلف اور جدا ہے، لیکن اپنے بندوں سے اس کا تعلقِ علم و شفقت ایسا قریب تر ہے جیسے رگِ جان۔

عہد و ذمہ کے معنوں میں اس کا استعمال قرآنِ حکیم کی اس آیت میں دیکھیے:

ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ (آل عمران: ۱۱۲)

[ان پر بس دی گئی ہے ذلت خواہ کہیں بھی وہ پائے جائیں سوا اس کے کہ اللہ کی طرف سے کوئی عہد ہو یا لوگوں کی طرف سے کوئی عہد ہو]

یہود کے جرائم، ان کی سرکشی اور حرص و طمع کی داستانیں تاریخ کے صفحات میں ثبت ہیں۔ قرآنِ حکیم نے ان پر جو فردِ جرم عائد کی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اللہ کے حکموں کو ماننے سے انکار کیا۔ انبیا علیہم السلام کو ناحق قتل کیا۔ ہر دینی قانون و قاعدہ کو توڑنے اور بدلنے کی کوشش کی اور خصوصیت سے حدود اللہ سے بچاؤ اور انحراف کی وہ تمام تدبیریں اختیار کیں، جن سے کوئی قوم دین کی روح اور منطق سے قطعی محروم ہو جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم کی اس آیت میں بتایا ہے کہ ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے یہ ہمیشہ ذلت و خواری سے دوچار رہیں گے اور مارے جائیں گے۔ سوا اس صورت کے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں جن لوگوں کی حفاظت و صیانت کا ذمہ لیا ہے اور ان کو قتل سے محفوظ رکھنے کا حکم دیا ہے جیسے ان کے بڑے بوڑھے، عورتیں، بچے اور ان کے وہ علما و مشائخ جو لڑائی جھگڑے سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ یا اس صورت میں یہ قتل و جدال سے محفوظ رہ سکیں گے جب ان کی حفاظت و معاونت کا کسی دوسرے فریق سے معاہدہ ہو اور وہ ان کی مدد و نصرت پر ہر آن آمادہ ہو۔

حبل کا لفظ جب مضاف ہو اور اللہ مضاف الیہ ہو تو اس صورت میں اشارۃً اس کے معنی اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اور پیغام کے ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ہے:

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا (آل عمران: ۱۰۳)

[اور اللہ کی رسی سب مل کر مضبوط تھامے رہو]۔

ح ت م

حَتَمَ : واجب کرنا، لازم قرار دینا، مضبوط کرنا۔

اِنْحَتَمَ الْاَمْرُ : واجب ہوگیا، بات کا پورا کرنا ضروری ہوگیا۔

الحَاتِمُ : حاکم، فیصلہ کرنے والا۔ کالا کوا، جو جاہلیت میں فراق اور جدائی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

اَلْحُتْمَةُ : سیاہی۔

اَلْحُتَامَۃ : دسترخوان پر بچا کھچا چورا۔

اَلْحَتْمُ : قطعی فیصلہ۔ وہ بات جو ہو کر رہے، اس کے معنی خالص و حقیقی کے بھی ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے : ھو الأخ الْحَتْمُ وہ حقیقی بھائی ہے یا ھوَ وَلَدٌ حتم وہ سگا بیٹا ہے۔

قرآن حکیم میں یہ لفظ ایک ہی مرتبہ استعمال ہوا ہے، ارشادِ باری ہے :

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰی رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۚ (مریم : ۷۱)

[اور تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کا گزر اس تک نہ ہو، یہ آپ کے پروردگار پر لازم ہے جو پورا ہو کر رہے گا]۔

اس آیت میں دراصل ان لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کے آگے سر جھکانے کے بجائے تمرد و سرکشی کا اظہار کیا۔ ان سے کہا گیا ہے کہ تمھیں بہرحال جہنم میں وارد ہونا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہے جو بہرحال پورا ہو کر رہے گا۔

"پروردگار پر لازم ہے" سے مراد یہ ہے کہ اس کا یہ فیصلہ کہ ان لوگوں کا انجام جہنم ہے قطعی ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور بخششوں کا جواب اپنی روایتی شقاوت و محرومی سے دیا، اور اس فیصلے میں کوئی رد و بدل ہونے والا نہیں۔

تعبیر کا یہ انداز اس لیے صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات صمدیت ہر طرح کے لزوم و اضطرار سے مبرّا ہے۔ سوا اس لزوم کے جو وہ خود اپنے اختیار و ارادہ اور اپنی فطرت کے اقتضا سے اپنے اوپر عائد کرلے۔

ح ث ث

حَثَّ : آمادہ کیا، ابھارا، اُکسایا۔

حَثَّہٗ علی الامر : اس نے کسی امر یا بات پر اس کو آمادہ کیا۔

اِحتثّ، حثحث اور حَاثَّ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اَلحُثُّ : بھوسے کے ریزے۔

الحثاث : جلدی، تھوڑی نیند۔ کہا جاتا ہے :

ما اکتحل فلان حَثَاثاً۔ وہ چند لمحے بھی نہیں سو پایا۔ کم سویا۔

اَلحُثَیثُ : تیز۔ کہا جاتا ہے :

فَرَسٌ حثیث السیر : تیز رفتار گھوڑا۔ قرآن حکیم میں ہے :

یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّهَارَ یَطۡلُبُهٗ حَثِیۡثًا ۙ (الاعراف : ۵۴)

[ڈھانپ لیتا ہے رات سے دن کو وہ جلدی سے اس کو آلیتی ہے]۔

غرض یہ ہے کہ لیل و نہار کا نمود و اظہار اتنا باقاعدہ، نپا تُلا اور متعیّن ہے کہ جوں ہی دن گزرا، رات نے اس کو بلا کسی تاخیر کے آلیا۔ یہاں حثیث کا لفظ بطور تشبیہ کے استعمال ہوا ہے، یعنی جس طرح تیز رفتار گھوڑا وقت مقررہ پر اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح یہ رات دن کا نظام ہے کہ ادھر اندھیرا اچھٹا، صبح کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ اسی طرح دن کی روشنی نے اپنا سفر طے کیا، رات کی تاریکیوں نے اس کو آگھیرا۔ شب و روز میں کارفرما نظام کی یہ محکمی و استواری اس بات کا پتا دیتی ہے کہ یہ آپ سے آپ نہیں ہو پاتا ہے بلکہ اس کے پیچھے اللہ کی تسخیر و تدبیر کا کرشمہ جلوہ گر ہے۔

ح ج ب

حِجَابٌ۔ مفرد، جمع حُجُبٌ : پردہ، ہر وہ شی جو دو چیزوں کو الگ الگ کر دینے والی ہو۔ تعویذ، کنارہ، طرف۔ ایک اعرابیہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ روٹی کو درمیان میں سے

توڑ توڑ کر کھا رہا ہے۔ اس پر اس نے کہا:

عليك بحواجب الرّغيف: تمھیں پہلے روٹی کے کناروں کو کھانا چاہیے۔

حجابُ الشمس: آفتاب کی پہلی شعاعیں۔ یعنی آفتاب کے کنارے کی پہلی نمود۔

حجابُ القلب: جھلی جو پیٹ اور دل کے درمیان حائل ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے:

هتك الخوف حجاب خلبه: خوف وہراس نے اس کی اس جھلی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

حَوَاجِب: اوائلِ شئ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے:

لاحت حواجب الصبح۔ اوائل صبح کا ظہور ہوا۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (الشوریٰ:۵۱)

[اور یہ کسی بشر کا مرتبہ نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر ہاں یا تو وحی سے یا کسی آڑ سے]۔

اللہ تعالیٰ انبیا علیہم السلام سے تین طریقوں سے ہم کلام ہوتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کا فرشتہ آتا ہے اور براہِ راست اس کے پیغام کو ان تک پہنچا دیتا ہے۔ یا وحی کے ذریعے ان کے قلب میں پیغامِ الٰہی ڈال دیا جاتا ہے اور یا پھر یہ ہوتا ہے کہ کسی حجاب یا کسی شئ کے مادی ظہور کی آڑ میں اللہ تعالیٰ کی آواز ان تک پہنچ جاتی ہے۔

آنحضرت کی تشریف آوری کے بعد وحی و تنزیل کی یہ تینوں صورتیں ختم ہو گئی ہیں۔ دین مکمل ہو چکا ہے اور انسان کو رشد و ہدایت کے لیے جن مراحل سے گزرنا تھا، گزر چکا۔ اب اسلام ہی تہذیب و تمدن کا وہ آخری اور حسین امتزاج ہے جو قیامت تک کے لیے انسانی فکر و عمل کو تابش و ضو عطا کرتا رہے گا۔

حَجَبَ: روک دیا۔

تَحَجَّبَ وَاِحْتَجَبَ: چھپ گیا۔

اِسْتَحْجَبَ: حاجب بنایا، دربان مقرر کیا۔

اَلْحِجَابَةُ: دربانی۔

قَدِ اسْتَحْجَبَ المامون بِشراً وحسن الحُجْبَة۔ خلیفہ مامون نے بشر کو اپنا دربان مقرر

کیا اور وہ دربانی کے آداب کو خوب جانتا ہے۔

مَحْجُوْبٌ : محروم، جسے روک دیا گیا ہو۔ قرآنِ حکیم میں ہے :

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ (المطففین : ۱۵)

[ہرگز ایسا نہیں کہ جزا و سزا نہ ہو، یہ لوگ اس روز پروردگار کے دیدار سے روک دیے جائیں گے]۔

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے اللہ کے پیغامِ رشد و ہدایت کو دنیا میں نہ مانا۔ ان کے لیے بہت بڑی سزا یہ ہوگی کہ دیدارِ الٰہی کے فیوض سے یکسر محروم رہیں گے۔ جب کہ وہ خوش نصیب جنھوں نے اپنے رب کو مانا، اس کے حکموں پر عمل کیا، اور جب تک جیئے، رضاءِ الٰہی کے حصول ہی کی خاطر جیئے، اپنے رب کی جلوہ سامانیوں کو دیکھیں گے، اس کے دیدار سے مشرف ہوں گے اور اس کے قرب و حضوری کی لذتوں سے بہرہ یاب ہوں گے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ (القیامہ : ۲۱، ۲۲)

[کتنے ہی چہرے اس دن بشاش ہوں گے اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے]۔

ح ج ج

اَلْحَجُّ : اصل معنی تو قصد زیارت کے ہیں، لیکن عرفِ شرعی میں مناسکِ حج ادا کرنے کی غرض سے بیت اللہ کی طرف روانہ ہونے کے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ہے :

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ج (البقرہ : ۱۹۷)

[حج کے چند مہینے جانے بوجھے ہیں]

عرب چونکہ جانتے تھے کہ شوال، ذی قعد اور ذی الحجہ، تین ماہ مناسکِ حج کے لیے متعین ہیں اس لیے قرآنِ حکیم نے ان تین ماہ کی تعین ضروری نہیں سمجھی۔

ہر معاشرے کے کچھ شعائر و ارکان اور عبادات کے طور طریقے ہوتے ہیں جو اجتماعی زندگی میں نظم و ارتباط پیدا کرنے اور ان میں روحِ دینی کو زندہ و برقرار رکھنے کی غرض سے ضروری ٹھہرائے جاتے ہیں۔ حج بھی انھی میں سے ایک رکن اور اظہارِ بندگی و اطاعت کا ایک بہت ہی پیارا اور مفید انداز ہے۔ اس کا اصل مقصد توجہ الی اللہ کے نصب العین کو جذبات و یقین

کی سطح پر ابھارنا، اجتماعیت کے روح پرور نظاروں کو عملی سانچوں میں ڈھالنا، اور دور دراز اطرافِ عالم سے آئے ہوئے قافلوں کا باہم مل جل کر اپنے دینی، اجتماعی اور سیاسی مسائل کا جائزہ لینا ہے۔

اَلْحِجَّةُ : حج کا اسم، سال۔ جمع حِجَجٌ۔ قرآنِ حکیم میں ہے:

عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ج (القصص : ۲۷)

[اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو]۔

حضرت شعیب نے جب چاہا کہ اپنی ایک لڑکی کو حضرت موسیٰ کے نکاح میں دے دیں تو یہ شرط عائد کی کہ تمھیں آٹھ سال تک ہماری خدمت کرنا ہوگی۔ مقصد یہ تھا کہ اس عرصے میں ان کی تربیت ہو جائے اور یہ بہ چشمِ خود دیکھ لیں کہ پیغمبروں کے گھرانوں میں آداب و سلوک کا کیا انداز ہوتا ہے۔

اَلْحُجَّةُ : ایسی دلیل جو مقصد کو واضح کر دے۔ یہ مقصد صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ قرآنِ حکیم میں اس لفظ کو دونوں معنوں میں استعمال کیا گیا ہے:

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ج (الانعام : ۱۴۹)

[کہہ دیجیے پوری حجت (دلیل) تو اللہ ہی کی رہی]۔

مشرکینِ مکہ نے جہاں اپنے کفر کے لیے طرح طرح کے عُذر تراشے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم بھلا کیوں مشرک ہوتے، گویا ہم تو مشیتِ الٰہی کی وجہ سے مجبورِ محض ہیں۔ وہ اگر چاہتا تو ہم بھی ایمان کی حلاوتوں سے لطف اندوز ہو لیتے۔

قرآنِ حکیم نے اس نوع کی حجت بازی کو اٹکل اور تخمین قرار دیا ہے، کیونکہ انسان جب اپنی روزمرّہ کی زندگی اپنے اختیار، سوچ سمجھ اور اپنے ذوق و معیار کو ملحوظ رکھ کر ہر کام انجام دیتا ہے تو عقیدہ و ایمان کے بارے میں جبر و اضطرار کا بہانہ تراشنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

جبر و اضطرار کی بحث پرانی ہے۔ پرانی بھی ہے اور بہت پیچیدہ بھی، لیکن اس میں دو ٹوک اور واضح بات یہ ہے کہ خود ہم کیا محسوس کرتے ہیں، یعنی ہمارے شعور کا کیا فیصلہ ہے۔ کیا دو متبادل صورتوں میں ایک کو اختیار کرنے میں ہم اپنے کو مجبور و بے بس پاتے ہیں

یا مختار و آزاد۔

قرآنِ حکیم عقائد و مذاہب کو تسلیم کرتا ہے اور اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ انسان سے صرف اطاعت و رضا ہی کا مطالبہ کرتا تو کوئی بھی شخص سرکشی و سرتابی کی جرأت نہ کر پاتا۔ لیکن ایسی صورت میں انسان فکر و دانش کے داعیوں سے قطعی عاری ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا شمار ذوی عقل کے بجائے ان حیوانات میں ہوتا، جو صرف جبلّت کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ اور اصلی بات یہ ہے کہ مشرکین کا یہ عذر مشیت کسی تصوّر یا عقیدے پر مبنی نہ تھا بلکہ محض کٹ حجتی تھی۔ اسی بنا پر قرآن نے بجا طور پر ان سے مطالبہ کیا کہ تم اگر واقعی مجبور و بے بس ہو تو اس کے حق میں کوئی دلیل پیش کرو جو علم و ادراک کی کسوٹی پر پوری اُترے اور جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ انسان اپنی نشاط آفرینیوں میں آزاد نہیں:

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ط (الانعام : ۱۴۸)

[آپ کہیے کہ آیا تمھارے پاس ہے کوئی دلیل، ہو تو ہمارے سامنے اسے ظاہر کرو]

اور پھر جب یہ لوگ دلیل پیش نہ کر سکیں تو پوری حجت اللہ ہی کی رہی کہ انسان کو بڑی حد تک کسی عمل کے اختیار یا رد کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی قوموں کو ان کی بداعمالیوں کی سزا ملی اور عند اللہ انھیں موردِ عتاب ٹھہرایا گیا۔

جیسا کہ ہم نے کہا کہ لفظ حجت کا اطلاق کبھی کبھی ایسی دلیل پر بھی ہوتا ہے جو اثبات مدعا نہ کر سکے۔ قرآن میں ہے :

حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (الشوریٰ : ۱۶)

[ان کی دلیل ان کے پروردگار کے ہاں باطل ہے]۔

حَاجَّ : جھگڑا کیا، بے کار بحث کی۔ قرآن حکیم میں ہے :

وَحَاجَّهٗ قَوْمُهٗ ط (الانعام : ۸۰)

[اور ان کی قوم لگی ان سے جھگڑنے]۔

یعنی جب حضرت ابراہیم نے اس حقیقت کو پالیا کہ خدا ایک ہے اور اس کی اُلوہیت و ربوبیت میں کوئی بھی اس کا شریک و سہیم نہیں تو ان کی قوم بت پرستی جن کا شعار تھا ان

سے لڑنے جھگڑنے لگی۔ کہا جاتا ہے:

حاج خصمه فحجّهٗ: اس نے اپنے حریف سے بحث کی اور اس پر غلبہ پالیا۔

کانت بینهما مُحاجّة: ان دونوں میں چپقلش تھی۔

ح ج ر

اَلْحَجَرُ: پتھر۔ جمع احجار اور حِجارۃٌ۔ قرآن حکیم میں ہے:

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ج (البقرہ: ۲۴)

[توپھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے]۔

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن حکیم کو اللہ کا کلام نہیں مانتے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یا تو تم بھی ایسا ہی کلام پیش کرو جو اپنی فصاحت و بلاغت کے خوارق کے لحاظ سے معروف اور رشد و ہدایت کے لطائف کے نقطۂ نظر سے قرآن ہی کی طرح جامع ہو، ورنہ اس جہنم کا ایندھن بننے کے لیے تیار رہو جس کی شدتوں میں اضافہ کرنے کے لیے پتھروں کو خوب تپایا جائے گا۔

راغب کے علاوہ کچھ اور مفسرین نے یہاں پتھروں سے مراد یا تو وہ اصنام اور بُت لیے ہیں جن کی پرستش میں یہ لوگ دیوانہ وار مصروف رہے اور یا اس سے مقصود وہ پروہت اور مندروں کے مہتمم ہیں جو لوگوں کو بت پرستی پر آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ جہاں یہ لوگ اپنے کفر کی وجہ سے جہنم کا مزہ چکھیں، وہاں اپنے چہیتے بتوں اور بتوں کی دیکھ بھال کرنے والے بڑے بڑے موبدین کا حشر بھی دیکھ لیں۔

اس مفہوم کی تائید قرآنِ حکیم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ط (الانبیاء: ۹۸)

[بے شک تم خود اور جو کچھ تم اللہ کے سوا پوجتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہیں]۔

اَلْحِجْرُ: عقل و فہم اور مانع یا حاجز۔ قرآن حکیم میں ہے:

هَلْ فِیْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ ؕ (الفجر: ۵)

[یقیناً اس میں قسم ہے صاحبِ فہم کے لیے] ۔

اس کے معنی حرام و ممنوع کے بھی آتے ہیں ۔ قرآنِ حکیم میں ہے :

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ (الانعام: ١٣٨)

[اور کہتے ہیں اپنے خیال کے مطابق کہ فلاں فلاں مواشی اور کھیت ممنوع ہیں، انھیں کوئی نہیں کھا سکتا سوا ان کے جن کو ہم چاہیں] ۔

حاجز کے معنوں میں اس آیتِ کریمہ کو دیکھیے :

وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝ (الفرقان : ٥٣)

[اور دونوں کے درمیان ایک حجاب اور مانع قوی رکھ دیا] ۔

یعنی ایسی ندیاں اور دریا بھی ہیں جو ایک ہی سطحِ آبی سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ان میں بعض مقامات پر شیریں اور میٹھا پانی دستیاب ہے اور بعض مقامات پر تلخ اور کڑوا ۔

اَلحِجر : کے ایک معنی آغوش یا گودی کے بھی ہوتے ہیں ۔ کہا جاتا ہے :

نشأت فی حجر فلان میں فلاں شخص کی گودی میں پلا بڑھا ۔

استحجرَ الطّین : مٹی پتھر کی مانند سخت ہو گئی ۔

ح ج ز

حَجَزَ : روکنا، فاصلہ کرنا، حائل ہونا ۔ دو چیزوں کے مابین حاجز ہونا ۔

اِحْتَجَزَ : حجاز میں آیا ۔

الحُجزُ : جڑ، قبیلہ، کنارہ ۔

اَلحِجاز : عرب کا وہ حصہ جو شام و بادیہ کے مابین فراقہ ہے ۔ کمر بند ۔ اونٹ کو باندھنے کی رسی ۔

: روک، روکنے والا ۔ قرآن حکیم میں ہے :

فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝ (الحاقہ : ٤٧)

[پھر تم میں سے کوئی اس کی سزا سے بچانے والا (یا روکنے والا) نہ ہوتا] ۔

اس سے پہلے کی آیات میں آنحضرتؐ اور قرآن کے بارے میں یہ تصریحات مذکور ہیں کہ نہ تو آنحضرت شاعر و کاہن ہیں اور نہ قرآن ہی شاعری اور کہانت کی قسم کی کوئی چیز ہے، آنحضرتؐ اللہ تعالیٰ کے رسول اور پیغمبر ہیں اور قرآن رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ صحیفۂ رشد و ہدایت، جس میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیتِ کبریٰ کا تذکرہ اور کرشمے ہیں۔ اس کے بعد اس حقیقت کا بیان ہے کہ ایک جھوٹا مدعیِ نبوت و ولایت چاہے کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا رہے، اسے مہلت دی جاسکتی ہے۔ لیکن انبیا کی یہ شان نہیں کہ دین کے نام پر وہ اپنے خیالات و افکار کی ترجمانی کرتے پھریں۔ کیونکہ وہ اگر ایسا کرنا چاہیں گے تو انھیں فوراً ہلاک کر دیا جائے گا اور کوئی شخص ان کو اس سزا سے بچانے والا نہ ہوگا۔

جھوٹا مدعی نبوت و ولایت زیادہ عرصے تک زندہ رہے یا نہ رہے، اس آیت میں اس نکتے کی طرف ضرور اشارہ ملتا ہے کہ ان مدعیانِ نبوت و ولایت کا پیغام آخر کار پروان نہیں چڑھتا۔ ایک وقت ضرور ایسا آتا ہے جب ان کے جھوٹ اور تلبیس کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، یا کم از کم یہ اپنی دعوت و پیغام میں سراسر ناکام رہتے ہیں۔

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ج (الرعد: ۱۷)

[سو جھاگ تو نکما ہو کر جاتا رہتا ہے]۔

اور باقی رہنے والی چیز وہ ہوتی ہے جو نافع اور مفید ہو۔

ح د ب

حَدِبَ: کبڑا ہونا۔

حَدِبَ عَلَيْهِ و تَحَدَّبَ: اس پر اظہارِ شفقت کیا۔

اَلْحَدَبَةُ: کبڑاپن۔ بلند و مرتفع زمین۔

اَلْحَدَبُ: ابھری ہوئی جگہ۔ زمین کا بلند حصہ۔ قرآنِ حکیم میں ہے:

وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ (الانبیاء: ۹۶)

[اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں]۔

اس سے پہلے اس بات کا تذکرہ ہے کہ جب قومیں اپنی بداعمالیوں اور ایمان دشمنی کی وجہ سے ہلاک ہو جاتی ہیں، تو پھر ان میں حق کی جانب لوٹ آنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ قومیں مٹتی ہی اس بنا پر ہیں کہ دنیا میں اب ان کا کوئی انفرادی و اجتماعی کردار یا عقیدہ ایسا نہیں رہا جو ان کے وجود کو حق بہ جانب ٹھہرا سکے یا ان کی زندگی کا ضامن ثابت ہو سکے۔ ہاں ان کا رجوع قیامت کے روز البتہ ہوگا جب یہ اپنی توقعات کے خلاف سزا و جزا کے ایسے ہولناک مناظر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھیں گے، مگر یہ رجوع یا اپنے آپ میں لوٹ آنا اس وقت ان کے کسی کام نہ آسکے گا۔ اس روز سے پہلے جو واقعات ظہور پذیر ہوں گے، ان میں ایک یاجوج ماجوج کا ظہور بھی ہے۔ یہ قومیں سدِ ذوالقرنین کو پھلانگ کر میدانی علاقوں میں کود پڑیں گی اور تہذیب انسانی کو تباہ و برباد کر دیں گی۔

ان قوموں سے کون لوگ مراد ہیں۔ اس کی وضاحت دیکھیے یاجوج ماجوج کی تشریح کے ضمن میں۔

ح دث

اَلْحُدُوْثُ : کسی امر کا وقوع پذیر ہونا۔ کسی شی کا کتم عدم سے نکل کر وجود میں آنا۔ قدیم نہ ہونا۔

اَلْحَدَاثَةَ : آغاز، ابتدا، کہا جاتا ہے۔ فعل ذٰلک فی حداثة شبابه۔ اس نے یہ کام آغاز جوانی میں کیا۔

الحَدَثُ : نئی چیز، نئی خبر، نیا واقعہ، جواں سال، خلافِ سنت امر۔ جمع احداث، احداث الدھر: زمانے کے مصائب۔

اَلْاُحْدُوْثَةُ : فسانہ، کہانی، گھڑنت۔

اَلْحَادِثُ : نوپید، جو پہلے نہ ہو۔ فلسفہ و کلام کی اصطلاح میں وہ عرض یا جوہر جو قدیم نہ ہو۔

اَلْحَدِیث : ہر وہ بات جو سمع و وحی کے ذریعے انسان تک پہنچے۔ خبر، قصہ، ہم کلام۔ کہا جاتا ہے : ھُوحدیثه : وہ اس کا ہم کلام ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے : ھو سمیرہٗ

حَدَّثَ : بیان کرنا، تذکرہ کرنا۔

حَادَثَ : باہم گفت گو کی۔

مُحْدَث : تازہ بات، بدعت، کوئی امر جو پہلے واقع نہ ہوا ہو۔ قرآنِ حکیم میں ہے:

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ م بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ○ (الاعراف : ۱۸۵)

[غرض یہ کہ اس قرآن کے بعد یہ کس بات پر ایمان لائیں گے]۔

اس سے قبل مشرکینِ مکّہ کے اس شبہے کا جواب تھا کہ خدانخواستہ آنحضرتؐ جنون میں مبتلا ہیں، اس کے بعد اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ لوگ کیوں کائناتِ علوی وارضی پر غور نہیں کرتے، اگر یہ ذرا بھی فکر و تدبر کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے تو فوراً جان لیتے کہ جس خالق نے اس پوری کائنات میں نظم وارتباط کے قاعدوں کا لحاظ رکھا ہے، کیا وہ اس کائنِ اصغر انسان کی رہنمائی کے لیے کسی اصول اور قاعدے کی تعیین کو غیر ضروری جانتا ہے۔ اس کی ربوبیتِ عامہ کا یہ تقاضا ہے کہ وہ انبیا و رسل کو بھیجے تاکہ انسانی زندگی کی کامرانیوں کے لیے راہ و منزل کا تعین ہو پائے۔

گویا منصبِ نبوت کو عالمِ اصغر یعنی انسانی دنیا میں وہی حیثیت حاصل ہے جو عالمِ اکبر میں قوانینِ فطرت کو حاصل ہے۔ اس بارے میں قرآن کا اندازِ استدلال بالکل سائنسی اور استقرائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کہنا چاہتا ہے کہ اگر تمھیں فکر و تدبر کا یہ جچا تلا انداز ابلاغ پسند نہیں ہے جس کو اثباتِ مسائل کے لیے ہم نے قرآن میں اختیار کیا ہے تو تم اپنی تسکین و اطمینان کے لیے اور کس اسلوب یا استدلال کے منتظر ہو۔

قرآن حکیم میں ہے:

مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ ذِکْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ یَلْعَبُوْنَ ○ (الانبیاء : ۲)

[ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس جو بھی تازہ نصیحت آتی ہے، اسے اس حال میں سنتے ہیں کہ ہنسی کرتے ہوتے ہیں]۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ کفارِ مکّہ اس درجہ اپنی عیش کوشیوں میں مگن ہیں کہ قرآنِ حکیم

میں دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی جواب دہی کے بارے میں جب بھی کوئی تازہ نصیحت یا عبرت پذیری کا کوئی تازہ لمحۂ فکریہ ان کے سامنے آتا ہے تو یہ اس پر نہ صرف سنجیدگی سے غور ہی نہیں کرتے، بلکہ اُسے محض ہنسی یا کھیل تماشے کی بات سمجھتے ہیں۔

قرآن حکیم کا اعجاز دیکھیے کہ اس کا واسطہ گو ایسی ہی کج خو قوم سے پڑا جو دین کے معاملے میں قطعی بے حسی کا شکار تھی، تاہم یہی قوم جب سنبھلی تو قرآنی تعلیمات کی عَلَم بردار بن گئی۔

قرآن حکیم میں ہے:

اَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ ۝ (الضحیٰ: ۱۱)

[اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا تذکرہ بھی کرتے رہا کیجیے]۔

آیت کے مخاطب اوّل اگرچہ آنحضرتؐ ہیں، مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ ہر مسلمان کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے جو جو انعامات اس پر ہیں، ان کا تذکرہ کرنے میں بخل سے کام نہ لے۔ ان انعامات کو یاد کرتا رہے اور مزید انعامات کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰى لَهَا ۝ (زلزال: ۴-۵)

[اس روز زمین اپنی خبریں بیان کر گزرے گی۔ یہ اس لیے کہ اپنے پروردگار کا حکم اسے یہی ہوگا]۔

جب یہ طے ہے کہ ایک روز حساب و محاسبہ کی گھڑی آئے گی اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق سزا و جزا سے دوچار ہونا پڑے گا تو اس مرحلے پر قدرتاً یہ سوال ابھرتا ہے کہ ہر ہر عمل کے محاسبے کا انداز کیا ہوگا؟ قرآن نے یہاں صرف ایک طریق کا ذکر کیا ہے جو یہ ہے کہ یہ زمین جس پر خیر و شر کی معرکہ آرائیاں رہیں، جس پر مختلف قوموں اور تہذیبوں کی باہمی آویزش رہی، اس دن شہادت دے گی کہ کون برسرِ حق تھا اور کون باطل کا حامی۔ کس نے کیا کیا ظلم ڈھائے اور کس نے خیر اور نیکی کے قافلوں کو آگے بڑھایا۔ یہ زمین اس دن گویا ایسے پردے اور نقشے میں تبدیل ہو جائے گی جو ایک ایک جرم اور ایک ایک نیکی کی نشان دہی کرے گی اور ہر قوم اور ہر شخص اپنی آنکھوں اور کانوں سے سن اور دیکھ سکے گا کہ اس نے اُخروی زندگی کے لیے کیا کیا دھرا ہے؟ یہاں اس نکتے کی وضاحت ضروری ہے کہ ہم جو کچھ کرتے اور کہتے ہیں وہ سب اس کرۂ ارضی پر کہیں نہ کہیں محفوظ ہے۔ جس طرح ٹیلی وژن، ہماری آوازوں اور تصویروں

کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جو کرۂ ارض پر ہر طرف بکھری ہوئی اور منتشر ہوتی ہیں، ٹھیک اسی طرح قیامت کے روز ہمارے اعمال واقوال ایک نظام کے تحت جو فضائے ارضی پر پہلے سے مرتسم ہیں، اس روز نطق و کردار کی شکل میں ہمارے سامنے نمایاں ہو جائیں گے۔

ح د د

اَلحَدُّ : روک، مانع، دو ملکوں میں حدِّ فاصل، جرائم کی مقررہ اور غیر متبدل سزا، اللہ کا حکم، ضابطہ، تیزی۔

حدالسیف : تلوار کی دھار۔

حدالشراب : شراب کی تلخی و تیزی۔

دارہ، حَدُّ داری : اس کا گھر میرے پڑوس میں ہے۔

حَدَدٌ : امرِ ممنوع۔ اس کا ایک استعمال بے نیازی کے معنوں میں بھی ہے، کہا جاتا ہے: مالی عنه حدد یعنی میں اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

الحِداد : سیاہ ماتمی لباس پہننا۔

الحدید : لوہا، کاٹنے والی چیز۔ کہا جاتا ہے: سیف حدید یعنی کاٹنے والی تلوار، پڑوسی۔ کہا جاتا ہے: ھو حدیدی وہ میرا پڑوسی ہے۔

الحدّاد : لوہار، دربان۔

اِحْتَدَّ علیہ : وہ اس پر خفا ہوا۔ اظہار ناراضی کیا۔

حَدَّ : تیز کرنا۔

حَدَّدَ الارض : زمین کی سرحدیں متعیّن کیں۔

حَادَّ : دشمنی کی۔

اَحَدَّ الیہ النظر : اس نے اسے گھور کر دیکھا۔ قرآن میں لفظ حادّ اور حدید کے استعمالات۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ط (البقرہ : ۱۸۷)

[یہ اللہ کے ضابطے ہیں سو ان سے نکلنے کے قریب بھی نہ جانا]۔

اس آیت سے قبل اور بعد اللہ تعالیٰ کے احکام و نواہی یا ان ضابطوں کی تفصیل کا ذکر ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے اسلامی معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (المجادلہ : ۵)

[جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے رہتے ہیں یہ خوار ہوں گے جیسے ان سے قبل کے لوگ خوار ہو چکے]۔

یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے احکام کو نہیں مانتے اور ہمیشہ اس کے رسول کی مخالفت کے درپے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کی یہ معاندانہ کوششیں نہ صرف بار آور ہونے والی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کو بالآخر ذلت و رسوائی کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔

اور تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کا بول بالا ہوا اور کفر سرنگوں ہو کر رہا۔ اس لیے کہ حق و صداقت کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ انسانی اذہان و قلوب کو متاثر کرے اور باطل کا مقدر یہ ہے کہ وہ شکست سے دوچار ہو۔ قوموں کی تاریخِ عروج و زوال میں یہی وہ قانون ہے جو ہمیشہ جاری و ساری رہا۔

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝ (ق : ۲۲)

[سو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا۔ سو آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے]۔

غرض یہ ہے کہ یہاں جو کچھ آنکھیں دیکھتی ہیں وہ اگرچہ حقائق ہیں، فریب یا انخداع کی کرشمہ سازیاں نہیں، مگر حقائق اپنی پوری جلوہ آرائی کے ساتھ مکمل طور پر اس وقت چشم و ابرو کے احاطہ و ادراک میں آئیں گے، جب کشفِ غطا ہو گا۔ یعنی جب تعصبات اور غلط فہمیوں کے دل بادل چھٹیں گے اور جب جسم و مادہ کی رکاوٹیں دور ہوں گی اور روحِ انسانی مادیت و جسمانیت کی موجودہ آلائشوں اور زنجیروں سے آزاد ہو کر اپنی اصل صورت اور روپ میں نمایاں ہو گی۔ اس مرحلے پر ہر انسان اپنی آنکھ سے دیکھ لے گا کہ قرآنِ حکیم نے آخرت سے متعلق جن احوال و کیفیات کا ذکر کیا تھا، وہ برسرِ حق ہیں۔ لیکن اس وقت نگاہوں

میں بلا کی تیزی و براقی آجائے گی۔ لیکن کفار کو گناہ کی اس تیزی سے کچھ فائدہ نہ پہنچے گا کیونکہ یہ مرحلہ عمل کا نہیں احتساب کا ہوگا۔ مزاجب ہے کہ انسان اس دنیا میں روح کی آنکھ سے حقائق کا مشاہدہ کرے اور جسم و مادہ کی دیواروں سے نکل کر معانی اور حقائق کی دنیا میں در آئے، تعصبات کو خیر باد کہے اور حق کی محض اس لیے پیروی کرے کہ وہ حق ہے۔

ح د ق

حَدَق : گھیر لیا۔ احاطہ کیا۔

حَدَقَہٗ بعینہٖ : اس کو بغور دیکھا۔

حَدَّق الیّ، وَنظر الیّ بتحدیق : اس نے مجھ پر نظریں گاڑ دیں۔ بغور دیکھا۔

اَلْحَدَقَۃُ : آنکھ کی سیاہی۔

اَلْحَدَقُ : بیگن۔ کہا جاتا ہے :

هُمْ رُمَاۃُ الْحَدَقِ : وہ تیر اندازی میں بہت ماہر ہیں۔

اَلْحَدِیقَۃُ : وہ باغ جس کی چاردیواری ہو۔ جمع حدائق۔ قرآن حکیم میں ہے :

فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ج (النمل : ۶۰)

[اور اس کے ذریعے سے بارونق باغ اگائے]۔

اس آیت کا تعلق کائنات میں رونما ہونے والے ان شواہد سے ہے جو توحید پر دلالت کناں ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس میں جو حیات آفرین تصرفات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کی وجہ سے ہیں، ان میں کسی دیوی یا دیوتا کی رضا اور خوشنودی کا مطلق دخل نہیں۔ مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کے تخلیقی و تکوینی فیوض کا اثر ہے کہ ابر و سحاب کی تراوش سے زمین میں زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے، کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں اور باغوں پر رونق اور نکھار آجاتا ہے۔ اگر آفتاب میں مناسب حرارت نہ ہو، پانی میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ بادل یا ابر کی شکل اختیار کرے، زمین میں پذیرائی کی استعداد نہ ہو اور درختوں، پتوں اور شاخوں میں قوتِ نمو نہ پائی جائے، تو نہ بارش ہو اور نہ باغوں

اور کھیتوں میں بالیدگی اور رونق کی یہ بہار آفرین کیفیت جنم لے، یہ صرف اللہ تعالیٰ کا فیض ہے، کسی بت یا دیوتا کی قدرت کا کرشمہ نہیں۔ یہی وجہ ہے، اس آیت سے ذرا پہلے اللہ پوچھتا ہے:

ءَآللّٰهُ خَيْرٌ أَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ (النمل: ۵۹)

[آیا اللہ بہتر ہے یا وہ جنھیں یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں]۔

ح ذ ر

حَذِرَ: مجتنب رہنا، بچنا، چوکنا رہنا، پرہیز کرنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں ڈر اور خوف کے اسباب سے بیدار اور چوکنا رہنا خصوصیت سے شامل ہے۔

اَلحاذِر: مستعد، تیار، ڈرنے اور خطرہ محسوس کرنے والا۔

الحذیر: ڈرانے والا، آگاہ کرنے والا۔

اَلْمَحْذُوْرُ: امرِ ممنوع، جس سے پرہیز کرنا لازم ہو۔ ڈرنے کے لائق شے۔

ابوحَذِر: گرگٹ۔

حذار: کلمۂ انتباہ۔ ڈرو، بچو۔

حَذَر: خوف، ڈر۔ کہا جاتا ہے:

فَرَّ حَذَرَ الموت: وہ موت کے ڈر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ قرآن حکیم میں ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ صل (البقرہ: ۲۴۳)

[کیا تجھے خبر نہیں ان لوگوں کی جو اپنے گھروں سے نکل گئے تھے موت سے بچنے کے لیے]۔

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو جہاد سے ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے، لیکن موت و ہلاکت اُن کا مقدر تھا۔ اس لیے بہر حال مرے، مجاہد کی موت نہیں بزدل کی موت۔

اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان کو بالآخر موت کے آغوش میں جانا ہی ہے تو کیوں نہ اس کی موت کسی نصب العین کے لیے ہو۔

وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ط (النساء: ۱۰۲)

[اور اپنے بچاؤ کا سامان لیتے رہو]۔

یعنی عین جہاد میں جب دشمن سامنے ہو اور قتل و ہلاکت کا میدان گرم ہو، اس وقت بھی جب تم اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہونے لگو تو اپنے دفاع اور بچاؤ کے سامان سے غفلت نہ برتو۔

وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ (آل عمران : ۳۰)

[اور اللہ تم کو اپنے سے ڈراتا ہے]۔

مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکافاتِ عمل کا جو قانون مقرر کر رکھا ہے تم اس سے ڈرو۔

وَ اِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ؕ (الشعرا : ۵۶)

[اور ہم سب کو ان سے خطرہ ہے]۔

یہ فرعون کا قول ہے کہ چونکہ ہمیں موسیٰ کے مٹھی بھر متبعین سے خطرہ ہے اور یہ مسئلہ امن و امان کے قیام کا ہے اس لیے ان کو ختم ہی کر دینا چاہیے۔ اس آیت میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ہر فرعون نے اپنے دور میں اپنے اقتدار کے تحفظ کی خاطر مخالفین کو کچلنے کے لیے قریب قریب یہی اندازِ استدلال اپنایا اور اختیار کیا ہے کہ اہلِ حق کے اس گروہ سے اگرچہ تعداد کے اعتبار سے یہ کم ہے، ہمیں یہ خطرہ ہے کہ کہیں یہ ہمارے ایوان و در اور مسندِ اقتدار کو الٹ نہ دیں۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ○ (بنی اسرائیل : ۵۷)

[بے شک آپ کے پروردگار کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے]۔

ح ر ب

اَلْحَرْبُ : جنگ و جدل، سلب و نہب۔ کہا جاتا ہے :

حُرِبَ مَالُهٗ: اس کی دولت چھین لی گئی۔ حدیث میں آتا ہے :

اَلْحَرِيْبُ مَنْ حُرِبَ دِيْنَهٗ : دولت سے محروم وہ ہے جس کا دین اس سے چھن

گیا ہو۔

دار الحَرب : مشرکین کا ملک۔ یا وہ ملک جو اسلامی ملک سے برسرِ پیکار ہو۔

الحِرْبَار : گرگٹ۔

الحَرَبُ : ویل و ہلاکت۔

وَاحَرَبَا : کلمہ تعزیت۔ میت پر رونے کے موقعے پر بولتے ہیں۔

اَلمِحْرَاب : بہادر، گھر میں اچھی جگہ، صدر مقام، قلعہ، عمارت، غرفہ، حجرہ اور امام کے کھڑے ہونے کی جگہ، جمع محاریب۔ قرآن حکیم میں ہے:

اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ط (المائدہ: ۶۴)

[جب وہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتا ہے]۔

آیت کے مخاطب یا تو وہ یہودی قبائل ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہتے تھے، یا وہ تمام اہلِ کتاب ہیں جو مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ قرآن حکیم نے بتایا کہ ہر چند یہ لوگ اس بنا پر شرارتیں کرتے رہتے تھے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں محاذ آرائی کی آگ بھڑک اُٹھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ایسے حالات پیدا کر دیتا کہ یہ آگ بجھ جاتی، اور یہ اپنی شرارتوں میں کامیاب نہ ہو پاتے۔ اس آیت میں لڑائی بجائے خود ایک آگ ہے جس میں کودنے والے دونوں فریق، فاتح اور مفتوح اس کی مضرتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اسلام اس آگ سے محترز رہنے کی تلقین کرتا ہے اور اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ لڑنے سے زیادہ اس آگ کو بجھا دینا اور پُرامن حالات پیدا کرنے کی کوشش کرنا زیادہ قرینِ عقل و صواب ہے، مگر "جہاد" لڑائی نہیں۔ اس کے معنی حق کی مدافعت، مقتضیاتِ ایمان کی تائید اور رضائے الٰہی کے لیے اپنی عزیز ترین متاعِ حیات کو قربان کر دینا ہے۔ یہ نیکی جرأت اور کردار کا بلند ترین اظہار ہے، جس سے تہذیب و اقدار کی رفعتیں اُبھرتی اور پھیلتی ہیں۔ لڑائی اور جہاد میں فرق صرف نیت و مقصد ہی کا نہیں، طرزِ عمل کا بھی ہے۔ لڑائی کسی اخلاقی التزام کو نہیں مانتی جب کہ جہاد یکسر قاعدہ، قانون اور اخلاقیات کے تابع ہے۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِى الْمِحْرَابِ لا (آل عمران : ۳۹)

[اس حال میں کہ وہ حجرے میں نماز پڑھ رہے تھے] ۔

مراد حضرت زکریا ہیں جنھوں نے نماز میں حصولِ اولاد کی دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمالی۔

قرآن حکیم میں ہے :

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ (سبا : ۱۳)

[سلیمان کے لیے وہ چیزیں بنا دیتے جو انھیں بنوانا منظور ہوتیں مثلاً بڑی عمارتیں اور مجسمے] ۔

حضرت سلیمان کو بڑی بڑی عمارتیں اور عبادت گاہیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ مسجدِ اقصیٰ اور بیت المقدس ایسی رفیع المرتبت عمارتیں ان ہی کے ذوقِ تعمیر کی یادگاریں ہیں۔

ح ر ث

حَرَثَ الْاَرْضَ : زمین میں ہل چلایا۔

حَرَثَ الْمَالَ : دولت جمع کی۔

حَرَثَ النَّارَ : آگ کو کریدا۔

حَرَثَ الْقُرْآنَ : قرآن کو غور و تدبر سے پڑھا۔

حَرَثَتِ الْخَيْلُ الارض : گھوڑوں نے زمین کو پامال کیا۔

اَحْرَثَ الدَّابَّةَ : جانور کو چلا چلا کر دبلا کر دیا۔ ہلکان کر دیا۔

اَلْمِحْرَاثُ : ہل۔

اَلْحِرَاثَةُ : کھیتی باڑی۔

اَلْحِرَاث : کھیتی۔ مجازاً عورت کو بھی کہتے ہیں۔ وَكَيْفَ حَرْثُكَ کے معنی ہیں تمھاری بیوی کا کیا حال ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ص (البقرہ : ۲۲۳)

[تمھاری بیویاں تمھاری کھیتی ہیں]۔

یعنی جس طرح کھیتیاں، نباتات، غلّہ اور اناج پیدا کرتی ہیں، اسی طرح عورتیں، اولاد کو جنم دیتی اور پروان چڑھاتی ہیں۔ اس میں تشبیہ کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس طرح ایک کسان زمین سے محبت رکھتا ہے، اس کی دیکھ بھال اور حفاظت میں جان کھپاتا ہے اور ان تمام ضروریات کا خیال رکھتا ہے جس سے زمین کی قوتِ نمو میں اضافہ ہو، اسی طرح تمھیں بھی چاہیے کہ اپنی بیویوں سے محبت رکھو، ان کی حفاظت کرو اور ان کی ان تمام ضروریات کا خیال رکھو، جن کو پورا کرنے سے یہ بہترین اولاد کی تربیت کر سکیں۔ نیز یہ کہ جنسی التذاذ میں صرف اس بات کا خیال رکھو کہ اس سے مقصود نوعِ انسانی کی بقا و افزائش ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ○ (الشوریٰ: ۲۰)

[جو کوئی آخرت کی کھیتی کا طالب ہے ہم اسے اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو کوئی دنیا کی کھیتی کا طالب ہے ہم اسے دنیا میں سے کچھ دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہ ہوگا]۔

دراصل کشتِ حیات ایک ہی ہے، اس کا ایک کنارہ دنیا ہے اور دوسرا آخرت۔ قرآنِ حکیم نے دونوں کو الگ الگ اس بنا پر بیان کیا ہے تاکہ زندگی کے دو واضح نقشوں کی نشان دہی کی جا سکے۔ ایک نقشہ یہ ہے کہ انسان کی طلب و سعی کا محور و محرک صرف ادنیٰ خواہشات مادی ہوں۔ دوسرا یہ کہ اس نقشے کو آخرت کے تصور و ایمان کی ضو فشانیوں میں ترتیب دیا جائے۔ جو شخص صرف دنیا پر ایمان رکھتا ہے، وہ کوتاہ نظر ہے۔ وہ نہ صرف دنیا کی بہت سی حسرتوں سے محروم رہتا ہے بلکہ آخرت کی نعمتوں میں سرے سے اس کا کوئی حصہ ہی نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو ایمان بالآخرت کی نعمت سے مالا مال ہے اس کا دامنِ فکر و عمل نہ صرف اس عالم کی شادمانیوں سے پُر ہوتا ہے بلکہ آخرت و عقبیٰ کی بہرہ مندیوں سے بھی اسے نوازا جاتا ہے۔

ح ر ج

حَرَجٌ : گناہ، مضائقہ، قلب و نظر کی تنگی - کہا جاتا ہے:

وَقَعَ فی الحَرَجِ : گناہ میں اُلجھ کر رہ گیا - گناہ کی تنگی میں پھنس گیا۔

اَوقعنی فی الحَرَجِ : اس نے مجھے مشکل میں ڈال دیا۔

ظُلْمُكَ عَلَیَّ حَرَجٌ : تم پر ظلم کرنا مجھ پر حرام ہے، میرے لیے مشکل ہے۔

لا حَرَج : کوئی مضائقہ نہیں - کہا جاتا ہے:

حَدِّثْ عَنِ الْبَحْرِ وَلَا حَرَجَ : سمندر کے بارے میں جو چاہو کہو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں - یعنی اس کی وسعتوں سے متعلق ہر نوع کی مبالغہ آرائی جائز ہے۔

حَرِجَ الرجل : وہ گناہ گار ہو گیا، اس نے گناہ کا ارتکاب کیا۔

حَرَجَ انیابه : اس نے غصے سے دانت پیسے۔

تَحَرَّجَ : گناہ سے کنارہ کش رہا۔

الحِرْج : گناہ، شکار میں کتے کا حصہ۔

اَلْحَرِج : جنگ جُو، جو لڑائی سے منہ نہ پھیرے - قرآن حکیم میں ہے :

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط (الحج : ۷۸)

[اس نے تمھیں برگزیدہ کیا اور اس نے دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں کی]۔

یعنی یہ ملتِ ابراہیمی، یہ دعوت توحید اور یہ دین جس کا نام اسلام ہے، فطرت کا کوئی انوکھا کرشمہ نہیں۔ تمھارے ہاں یہ سب چیزیں جانی بوجھی ہیں، پھر اس کے ماننے میں تم کیوں متامّل ہو - یہ دین تمھاری ہی تاریخ ارتقا کی ایک کڑی ہے اور تمھاری ہی روایاتِ توحید کی تکمیل ہے۔ اس میں کوئی الجھاؤ، فکر و نظر کی تنگی اور ایسی بات مذکور نہیں جس کو تمھارے قلب و ضمیر کی شگفتگی، کشادگی اور انشراح قبول نہ کر سکے۔ پھر اس کے آگے سر تسلیم خم کر دینے میں ہچکچاہٹ کی وجہ کیا ہے؟ یہ دین ازحد آسان، فہم و ادراک کے قرین اور فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔ مزید برآں اس کو مان لینے سے جسم و روح کی نشاط آفرینیوں میں کوئی

کمی یا تنگی واقع نہیں ہوتی، اس لیے تمھیں چاہیے کہ اس کے مخاطبِ اوّلین ہونے کی حیثیت سے اس کو تسلیم کرنے میں سبقت اور پہل کا ثبوت دو، نہ یہ کہ اس کا انکار کرو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ٥ (النسار: ٦٥)

[سو آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ لوگ ایمان دار نہ ہوں گے جب تک کہ یہ لوگ اس جھگڑے میں جو ان کے آپس کا ہو آپ کو حکم نہ بنالیں اور جو فیصلہ آپ کر دیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا پورا تسلیم کر لیں]۔

اس آیت میں حرج محسوس نہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت بحیثیت رسول کے چونکہ حکم ہیں اور منشارِ ربوبیت کے مطابق رشد و ہدایت میں تنہا حجت و استناد کے حامل ہیں اس لیے جب کسی نزاعی یا غیر نزاعی مسئلے کے بارے میں وہ فیصلہ صادر فرمادیں تو ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان نہ صرف اس فیصلے کو مانیں بلکہ ان کے قلب و ضمیر اور نفسیات کی گہرائیوں میں اس کی صحت و استواری سے متعلق اس درجہ یقین جلوہ گر ہو کہ کوئی الجھاؤ، شک اور جھجک ان کی خوئے رضا و تسلیم میں نہ در آئے اور اس فیصلے کو اس طرح سے مان لیں جس طرح کہ ماننے کا حق ہے۔

ح ر د

حَرِدَ : غضب ناک ہونا۔

حَرَدَ : منع کرنا، ہاتھ روک لینا، ارادہ کرنا، تنہا رہنا۔

اَسَدٌ حارد : غضب ناک شیر۔

اَلحَرِید : قوم سے الگ تھلگ رہنے والا۔

حاردت النَاقَةَ : اونٹنی کا دودھ کم ہوگیا۔

حاردت السنۃ : سال میں بارش کا کم ہونا۔

حَارَدَ فُلَانٌ : عطاو سخا کے بعد ایک دم بخل اختیار کرنا۔ قرآن حکیم میں ہے :

وَغَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قٰدِرِیْنَ ۝ (القلم : ۲۵)

[اور اپنے کو اس نہ دینے پر قادر سمجھے]۔

مفسرین نے حَرْد کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ مجاہد کے نزدیک اس کے معنی اس سوچے سمجھے عہد کے ہیں جو ان لوگوں نے آپس میں کیا۔ عکرمہ نے اس کا ترجمہ غیظ و غضب کیا ہے۔ یعنی ان لوگوں نے نہایت خفگی کے عالم میں یہ کیا کہ کل باغ میں کوئی حاجت مند اور مسکین داخل نہ ہونے پائے۔ شعبی کے نزدیک حرد کا مطلب یہ ہے کہ مساکین کے بارے میں انھوں نے جس بخیلانہ روش کا اظہار کیا اس پر انھوں نے سمجھا کہ ہمیں پورا پورا اختیار ہے کہ باغ میں کسی فقیر کو داخل نہ ہونے دیں۔

قرآن حکیم نے اس آیت میں قریشِ مکہ کو ایک تاریخی مثال سے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ جو قوم اللہ کی نعمتوں پر شکر گزار نہیں ہوتی اور اپنے مال و دولت میں غربا اور مساکین کو شریک نہیں گردانتی، اس کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

بات یہ تھی کہ ایک گروہ جو اچھے خاصے شاداب ہرے بھرے باغ کا مالک تھا، اپنے دل میں یہ سمجھ بیٹھا کہ یہ سب ہماری اپنی محنت و تدبیر کا کرشمہ ہے کہ انگوروں کا یہ باغ اب کی خوب پھلا پھولا ہے۔ اس لیے کل جو ہم انگور سمیٹنے کے لیے جائیں گے تو ہمیں یہ طے کرلینا چاہیے کہ اس میں قرب و جوار کے غربا و مساکین کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس پروگرام کی کامیابی پر ان کو پورا پورا یقین تھا، اس لیے انھیں ان شاءاللہ کہنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس دنیا میں ہماری کامیابی و کامرانی کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا دستِ شفقت بھی کارفرما ہوتا ہے۔

ان کے اس غرور و ادعا کی ان کو یہ سزا ملی کہ جب وہ صبح صبح باغ میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کسی آفتِ سماوی نے باغ کو تباہ کردیا ہے۔ اس پر ان کی آنکھیں کھلیں اور اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

ح ر ر

حَرَّ - اَلْیَوْمُ : آج کا دن گرم ہے۔

یومٌ حارٌ : شدید گرمی کا دن۔

رَجلٌ حرّان : بہت پیاسا۔

الحریۃُ : شرافتِ نفس، آزادی، کسی چیز کا خالص ہونا۔

حربۃ القوم : قوم میں شریف ترین انسان۔

اَلحُرورِیۃ : شریف النفس ہونا، حروری یا خارجی ہونا۔ کہا جاتا ہے :

لیس من الحُرورِیۃ ان تکون حروریۃ ؛ شرافت یہ نہیں کہ تم حروری یا خارجی ہوجاؤ۔

حَرَّرَ العبد : غلام کو آزاد کیا۔

حَرَّر الکتاب : کتاب لکھی، کتاب کو بنا سنوار کر تحریر کیا۔

مُحَرَّرٌ : آزاد، کنیسہ کی خدمت کے لیے وقف۔

اِستَحَرَّ : گرم ہوا۔

اِستَحَرَّ القتال : گھمسان کا رن پڑا۔ لڑائی نے شدت اختیار کرلی۔

اَلحُرَّۃُ : آزاد عورت، شریف عورت۔

اَلحَرِیرُ : ریشم، باریک اور نرم کپڑا۔ قرآن حکیم میں ہے :

الحَرُور : دھوپ، ظل کی ضد۔

اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ ط (المائدہ : ۸۹)

[یا غلام آزاد کرنا]۔

قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ یا تو دس مسکینوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلا دیا جائے یا انھیں کپڑا دیا جائے یا غلام اور باندی کو آزاد کر دیا جائے۔

اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے "غلامی" کو ایک مسئلے کی حیثیت عطا کی اور معاشرے میں اس کے ازالے کی کئی صورتیں متعین کیں۔ جب کہ تمام پہلے مذاہب نے نہ صرف غلامی کی تائید کی بلکہ اس کو ہمیشہ ہمیشہ باقی رکھنے کی تلقین کی۔

وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ ط (التوبہ : ۸۱)

[اور کہنے لگے کہ ایسی گرمی میں (گھر سے) مت نکلو]۔

منافقین نہ صرف غزوۂ تبوک میں خود شریک نہ ہوئے بلکہ لوگوں کو یہ کہہ کر روکتے رہے کہ میاں، اس بلا کی گرمی میں بھلا گھروں سے نکلنے اور معرکۂ جہاد میں شریک ہونے کا کیا تُک ہے لیکن انھوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ جس عذاب سے یہ دوچار ہونے والے ہیں وہ اس سے کہیں شدید ہے۔

رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا (آل عمران : ۳۵)

[عمران کی بیوی نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں نے تیرے لیے نذر مانی ہے اس بچے کی جو میرے پیٹ میں ہے کہ وہ آزاد رکھا جائے گا]۔

اس قصے کا تعلق حضرت مریم کی والدہ کی اس آرزو سے ہے کہ اگر میرے ہاں بچہ پیدا ہو تو میں اسے دنیا کے کام کاج سے آزاد کر کے ہیکل سلیمانی کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گی۔

اس دور میں یہودیوں میں یہ عام رواج تھا کہ کچھ دین دار لوگ ایسے رہیں جو دنیا کے جھمیلوں سے آزاد رہ کر اپنی زندگی کو کنیسہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ اسی رواج نے بعد کے عیسائیوں میں ایک باقاعدہ ادارے کی شکل اختیار کر لی جو کلیسا کی زیرِ نگرانی عیسائیت کی اشاعت و فروغ کے لیے کام کرتا۔ آج بھی ایسے عیسائی راہب اور راہبات دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں جو شادی بیاہ کی ذمے داریوں سے آزاد رہ کر اہلِ کنیسہ کی ہدایت پر عیسائیت کی تبلیغ کے لیے شب و روز کوشاں ہیں۔

اسلام کا منشا بھی یہی ہے کہ مسلمان علما اور دانش ور ایک عالمی ادارہ اور جماعت کی شکل میں اپنے کو منظم کریں اور اسلام کی اشاعت کے لیے دنیا کے گوشوں اور کونوں میں پھیل جائیں اور اپنے کردار و علم سے یہ ثابت کر دیں کہ اس دور میں تنہا یہی وہ دین ہے جو ہماری فکری و عملی تشویش کو دور کر کے اطمینان کی دولت سے انسانوں کو مالا مال کر سکتا ہے۔ لیکن اس غرض کے لیے راہبانہ زندگی اختیار کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ اسلام جد و جہد، عمل اور زندگی کے ہر گوشے میں جہاد و سعی کا حامی ہے۔ فرار اور کنارہ کشی کا حامی نہیں۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ (فاطر: ۲۱)

[نہ سایہ اور نہ دھوپ]۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک غیر مسلم فاسق و فاجر اور مُسلم و مومن پاک باز میں وہی فرق رونما ہے جو اندھے اور دیکھنے والے میں ہے، جو تاریکی اور روشنی میں ہے، سایہ اور دھوپ میں ہے۔ کیونکہ اسلام فکر اور بینائی کو جلا دیتا ہے۔ تاریکیوں کو دور کرتا اور روشنی کو پھیلاتا ہے۔ زندگی کی تپش سے نجات دلا کر سایہ کی ٹھنڈک اور آسودگی بہم پہنچاتا ہے۔ جب کہ کفر تعصبات پیدا کرتا ہے، فکر و نظر کی تاریکیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور انسان کو آسودگی کے بجائے مصائب و آلام کا ہدف ٹھہراتا ہے۔

یہاں علم بدیع و بلاغت کے نقطۂ نظر سے پوری آیت میں جو حسن تقابل رونما ہے وہ صرف لفظی نہیں، معنوی بھی ہے۔ اسلام کو "ظل" قرار دینا اور کفر کو "حرور" یا دھوپ کی تپش قرار دینا ایک ایسی تمثیل ہے جس کی حقیقت وہ قومیں خوب جانتی ہیں جو گرم ممالک میں دوپہر کی قہر آلود تپش سے آشنا ہیں۔ جنھوں نے کبھی راہ و منزل کی تلاش میں دشت و صحرا میں جان جوکھوں میں ڈالی ہے اور پھر جب اچانک ان کو راستے میں شجر سایہ دار مل گیا ہے تو انھیں کس قدر راحت و مسرت کا احساس ہوا ہے۔ ٹھیک اسی طرح رہروانِ حق و صداقت جب کفر کی محرومیوں اور شدتوں سے تنگ آکر ایمان کی شاداب وادیوں میں قدم رکھتے ہیں تو انھیں بے پایاں مسرت حاصل ہوتی ہے، جیسے انھیں دھوپ اور تپش سے دوچار ہونے کے بعد آسودگیٔ خاطر کی ایک صورت میسر آگئی ہو۔

ح ر س

حَرَسَ : حفاظت کی، نگہداشت کی۔

اِحْتَرَسَ : محفوظ رہا۔ رات میں چوری کی۔ چوری کا معنی زیادہ تر حجازیوں کے ہاں رائج ہے۔

چنانچہ حارس جہاں محافظ کو کہتے ہیں وہاں اس کا اطلاق چور پر بھی ہوتا ہے۔

حَرْسٌ : زمانہ۔ کہا جاتا ہے :

مَضٰی علیہ الحَرْسُ - اس پر ایک زمانہ گزر گیا۔ راغب کا کہنا ہے کہ لفظ کے اصل مادے میں زمانے کا مفہوم داخل نہیں۔ یہ معنی مقتضائے کلام سے پیدا ہوا ہے۔

اَلحَرَسَان : شب و روز۔

اَلحِرَاسَة : حفاظت۔

اَلمُحْرَس : محافظ۔

حَرَسُ الملك : بادشاہ کا محافظ۔ قرآن حکیم میں ہے :

وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًاۙ (الجن : ۸)

[اور ہم نے آسمان کی تلاشی لینا چاہی تو ہم نے اس کو شدید پہرے اور شعلوں میں بھرا پایا]۔

اسلام سے پہلے کاہنوں کا ایک ذریعۂ علم یہ بھی تھا کہ جنّات انھیں آسمان کی باتیں اندازہ و تخمین سے بتا دیتے۔ لیکن جب اسلام آیا تو وحی اور تدبر کے سوا علم و عرفان کے یہ تمام دروازے بند کر دیے گئے جن کا تعلق محض ظن و وہم سے تھا۔ اسی حقیقت کو جنّات کی زبان سے یوں بیان کیا گیا ہے کہ اب جو آسمان کی طرف ہم پرواز کرتے ہیں تو راہ میں شدید پہرہ محسوس کرتے ہیں، اس لیے راز کی کوئی بات ہم پر افشا نہیں ہو پاتی۔

یہ قرآن کی زبان ہے اور اب فضا پر کمندیں ڈالنے والے سائنس کی زبان میں اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں کہ چاند سے ادھر فضا میں بے شمار شہاب ثاقب اور چکر کاٹنے والے آتشیں پتھر پائے جاتے ہیں جو اکثر پرواز میں حائل ہوتے ہیں۔

ح رص

حَرَصَ : اس میں دو الگ الگ معانی پائے جاتے ہیں۔ ایک پھاڑنا، چھیلنا، اور دوسرے شدتِ آرزو، لالچ یا دل سے چاہنا۔ کہا جاتا ہے :

حَرَصَ القصّارُ الثوبَ : دھوبی نے کپڑا دھونے میں پھاڑ ڈالا۔

اصابتهُ حَارِصَة : اُسے ایسا زخم لگا جس نے جلد کو پھاڑ ڈالا۔

اَلحَارِصَةُ : ایسا بادل جو برس کر زمین کی اوپر کی سطح کو کھُرچ یا چھیل دے، یعنی زمین کو صاف کر دے۔

چاہنے، آرزو کرنے، شدت سے چاہنے اور لالچ کرنے کے معنوں میں یوں کہا جاتا ہے۔

حَرَص علی الشیٔ : اس نے شی کے حصول میں لالچ سے کام لیا۔

وَمَا اَحْرَصکَ علی الدنیا : تو دنیا کے معاملے میں کس درجہ حریص اور لالچی ہے۔

اَلحِرص : لالچ ۔ قرآن حکیم میں ہے :

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ (التوبہ : ۱۲۸)

[بے شک تمھارے پاس ایک پیغمبر آئے ہیں تمھاری ہی جنس میں سے ۔ جو چیز تمھیں مضرت پہنچاتی ہے انھیں بہت گراں گزرتی ہے، تمھاری بھلائی کے حریص ہیں]۔

یہاں حریص کا لفظ اچھے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جہاں تک پیغمبر کا تعلق ہے، وہ دل سے نوعِ انسانی کی بھلائی، فلاح و بہبود اور ہمدردی کے لیے اپنے دل میں شدید تڑپ رکھتے ہیں، اس لیے ان کی تعلیمات میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے نوعِ انسانی کو ضرر لاحق ہو۔ قرآن حکیم میں ہے :

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوةٍ ج (البقرہ : ۹۶)

[اور آپ انھیں زندگی پر حریص سب لوگوں سے بڑھ کر پائیں گے]۔

اس آیت میں یہودیوں کی نفسیات کا صحیح تجزیہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ دنیا طلبی میں اس درجہ حریص ہیں کہ کوئی دوسری قوم اس عیب میں ان کی شریک و سہیم نہیں۔ نسلی تقدیس کے یہ حامی کسی روحانی، اخلاقی یا انسانی فضیلت کے قائل نہیں۔ حتیٰ کہ یہ آخرت پر بھی اعتقاد نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک صرف دولت، اقتدار اور قومی و نسلی بقا ہی وہ اقدار ہیں جن کے لیے انھیں کوشاں رہنا چاہیے۔ قرآن حکیم کا یہ نفسیاتی تجزیہ کس درجہ صحیح ہے، اس کی تصدیق نہ صرف ان کی پوری تاریخ سے ہوتی ہے بلکہ آج بھی ان کی حرص و ہوا کے چرچے سارے عالمِ انسانیت میں ان کی رسوائی پر شاہدِ عدل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ح ر ض

اَلحُرض : عقیدے کا بگاڑ، عقل کی خرابی یا جسم کا نقص۔ کہا جاتا ہے :

نُهِکَ فلان حَرَضًا : وہ جسم کے کسی مرض سے جان بلب ہو گیا۔

اَلْحُرَضُ : بے فیض انسان ۔ وہ شخص جس کو کوئی غم یا تشویش گھلا دے یا دُبلا کر دے۔

اَلْحُرُضُ : اشنان ۔ ایک گھاس جس سے عرب کھانے کے بعد ہاتھ دھوتے تھے۔

اَلْحِرِضَةَ : گھٹیا انسان، جس کو کوئی منہ نہ لگائے ۔ جو کسی مجلس میں بیٹھنے کے لائق نہ ہو۔

اَلْحُرُضَة : وہ شخص جو خرید کر گوشت نہ کھائے۔

حَرَّضَ : آمادہ کیا ۔ کسی عیب یا نقص کو دور کرنے کے لیے برانگیختہ کیا، اُبھارا یا اکسایا۔

قرآن حکیم میں ہے :

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا (یوسف : ۸۵)

[بولے تم تو واللہ سدا یوسف ہی کی یاد میں لگے رہوگے ، یہاں تک کہ جان بلب ہو جاؤ گے] ۔

حضرت یوسف کے بھائیوں نے جب دیکھا کہ حضرت یعقوب بیٹے کے غم میں ہلکان ہو رہے ہیں تو جھنجلا کر کہا کہ اگر آپ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو اس حد تک غم واندوہ کو اپنے اوپر طاری کر لینا چہ معنی دارد۔ یوسف آخر ایک بیٹا ہی تو ہے ، گم ہو گیا ہے تو اس صدمے سے اپنی جان کو تو ہلکان نہ کیجیے ۔ حضرت یعقوب کا جواب یہ تھا کہ یہ غم صرف ایک باپ کا غم ہی نہیں جو بالکل فطری اور تقاضائے شفقت کے عین مطابق ہے، بلکہ ایک پیغمبر کا غم ہے، جس کا بیٹا بھی اس منصب پر فائز ہونے والا ہے اور اس سے اصلاح اور رشد و ہدایت کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ (یوسف : ۸۶)

[میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے] ۔

وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ٥ (النساء : ۸۴)

[اور آپ مسلمانوں کو بھی آمادہ کرتے رہیے] ۔

یعنی جہاں آپ بجائے خود احقاق حق اور اللہ کے بول کو بالا کرنے کی خاطر جہاد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں وہاں مسلمانوں میں بھی جہاد کی روح پھونکتے رہیے ۔ کیونکہ جو قومیں جہاد کی اہمیتوں سے ناآشنا رہتی ہیں، ان میں زندہ رہنے کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں ۔ یعنی کسی قوم کے

زندہ رہنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ ہر اس چیلنج کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہے، جو اس کے وجود، تشخص اور عقیدہ و نظریہ کو خطرے میں ڈال دینے کا باعث ہو سکتا ہے مسلمان اپنے دین کے اعتبار سے امن پسند ہے، صلح جُو ہے اور انسان دوستی کا سب سے بڑھ کر علم بردار ہے۔

ح ر ف

اَلْحُرْف : یہ لفظ اپنے استعمالات میں تین معنوں پر بولا جاتا ہے (۱) کنارا، سرا یا کسی شی کی حد۔ (۲) عدول و انحراف اور (۳) زخم کا صحیح اندازہ کرنا۔ قرآنِ حکیم میں ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ج (الحج : ۱۱)

[اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اللہ کی پرستش کنارے پر کھڑا ہو کر کرتا ہے]۔

اس سے مقصود منافقین ہیں جنھوں نے اسلام اوپری دل سے قبول کیا ہے۔ وہ گویا کنارے پر کھڑے ہیں۔ اگر اسلام کی اطاعت میں کوئی مادی منفعت نظر آئے تو اسے اختیار کر لیتے ہیں، اگر آزمائش اور امتحان کا مرحلہ درپیش ہو تو بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

عدول و انحراف کا استعمال عام ہے۔ جیسے

حَرَفَ اِنْحَرَفَ : ایک جانب کو جھک گیا۔ وعدہ سے پھر گیا یا منحرف ہو گیا۔ اسی کو قرآن میں باب تفعیل کی صورت میں یوں استعمال کیا گیا ہے۔

ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ (البقرہ : ۷۵)

[پھر اس میں تحریف کر دیتے ہیں بعد اس کے کہ اسے سمجھ چکے ہیں]۔

تحریف کے یہاں دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ کلامِ الٰہی کے الفاظ و حروف کو یہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ صحائف انبیا کی تعبیر و تفسیر میں بددیانتی سے کام لیتے ہیں۔ جس شخص نے کبھی بائیبل کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس تنقید پر نظر ڈالی ہے، جس کا اظہار ان صحائف کے بارے میں اہل علم و تحقیق نے پوری ذمہ داری سے کیا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ یہودیوں نے ان مقدس کتابوں میں کیا کیا خرافات داخل کر دی ہیں۔ قرآن

کا اعجاز دیکھیے کہ محققین بائیبل کے لفظی مطالعہ کے بعد آج جس نتیجے پر پہنچے ہیں، قرآن نے اس سے بہت پہلے اس کی نشان دہی کر دی تھی۔

تیسرے معنی کی مثال لفظ مِحراف ہے۔ یہ اس سلائی کو کہتے ہیں جس سے زخم کی گہرائی معلوم کی جاتی ہے۔ اس لفظ کے کچھ اور استعمالات بھی ہیں۔ مثلاً :

اَحْرَفَ : غربت کے بعد تونگر ہونا۔

اِحْتَرَفَ : کوئی پیشہ اختیار کرنا۔

اَلْحُرُوْفُ : بدبختی۔

اَلْحِرْفَةُ : پیشہ۔

اَلْمُحَارَفُ : بدنصیب۔

ح رق

اَلْحَرَقُ : جلن۔ دھوبی کی غفلت سے کپڑے کا پھٹن۔ کہا جاتا ہے :

وَفِی الثَّوبِ حَرَقٌ : کپڑے میں پھٹن ہے یعنی دھوبی نے کپڑے کو زور سے پٹخ کر پھٹن پیدا کر دیا ہے۔

اَلْحُرْقَةُ : گرمی۔

اَلْحُرَاقُ : کھاری پانی۔

حَرَقَهٗ : اس کو جلا ڈالا۔ کہا جاتا ہے حَرَّقَهٗ بِاللَّوْمِ، اس نے اس کو اس درجہ ملامت کی کہ اس کا دل جل بھن کر کباب ہو گیا۔

اِحْتَرَقَ : جل اٹھا۔

فَرَسٌ حُرَاقٌ : تیز خرام گھوڑا۔ جس کی تیز رفتاری سے آگ کے بھڑک اٹھنے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔

اَلْحَرِيْقُ : آگ، آگ کی بھڑک۔ شعلہ۔ قرآن حکیم میں ہے :

لَهٗ فِی الدُّنْيَا خِزْیٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۵ (الحج : ۹)

[ایسے شخص کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور قیامت کے دن اسے ہم جلتی آگ کا عذاب چکھائیں گے]۔

اس آیت کا تعلق ابوجہل ایسے لوگوں کے اس شیوۂ نخوت و غرور سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جلالت قدر کے باب میں اگرچہ انھیں کچھ علم نہیں اور نہ ان کے پاس انسانی رشد وہدایت کا کوئی دستور ہی ہے، تاہم یہ شکوک وشبہات کو ابھارنے کی خاطر عامۃ الناس میں بحث ونزاع کا بازار گرم رکھتے ہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں بھی رسوائی ان کا مقدر ہے اور آخرت میں بھی یہ آگ کے شعلوں کا لقمہ بنیں گے۔

قرآن حکیم میں ہے:

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ٥ (الانبیاء: ٦٨)

[بولے ان کو تو جلادو اور اپنے ٹھاکروں کا بدلہ لو اگر تمھیں کچھ کرنا ہے]۔

حضرت ابراہیم نے جب مصر میں نعرۂ توحید بلند کیا اور ان کے سامنے ان آلیہ کی توہین کی تو نمرودیوں کے حلقے میں ہل چل مچ گئی۔ انھوں نے اپنے ٹھاکروں اور دیوی دیوتاؤں کے جھوٹے وقار کے خلاف اسے چیلنج سمجھا۔ خود فرعون کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اس کا عرش اقتدار زلزلے کی زد میں ہے۔ اس لیے کہ جب لوگ ایک اللہ کی عظمت سے آشنا ہو جائیں گے تو ان میں لامحالہ شرف انسانی کا خوابیدہ جذبہ جاگ اُٹھے گا اور اس صورت میں کوئی انسان، کوئی دیوتا اور مندر اس قابل نہیں رہے گا کہ لوگ اس کے آگے سر بہ سجود ہو کر انسانیت کی تذلیل کا باعث ہوں۔ یہ قدرتی بات تھی کہ عوام وخواص اس نعرۂ انقلاب پر بھڑک اٹھیں اور اپنے دستور و روایت کے مطابق یہ تجویز کریں کہ ایسے شخص کو زندہ آگ میں جھونک دیا جائے جو ہمارے خداؤں کی کھلے میدان میں تذلیل کرتا ہے۔

بات صرف حضرت ابراہیم اور ان کے حریفوں کی نہیں۔ تاریخ نے بارہا یہ عبرت ناک منظر دیکھا ہے کہ کچھ باضمیر لوگوں نے اپنے دور کی دینی و علمی گمراہیوں کا جب بھی پردہ چاک کیا ہے عوام اور مفاد پرست طبقے نے ہمیشہ ان کے لیے طرح طرح کی اذیتوں کا اہتمام کیا ہے۔ کلمۂ حق کا اظہار اور اس کی پاداش میں سخت ترین سزا و عقوبت کی تجویزیں آخر کس زمانے میں ساتھ نہیں رہیں۔ لیکن قابل غور یہ حقیقت ہے کہ آخر آخر میں بول بالا حق ہی کا رہا اور یہ تکلیفیں اور اذیتیں سچائی کی راہ کو کسی طور پر کبھی روک نہ سکیں، حق ہمیشہ پھلا پھولا اور باطل ہمیشہ

سرنگوں اور پژمردہ رہا۔

ح ر ک

حَرُكَ : ہلا۔

حَرَّكَهٗ : ہلانا، حرکت دینا، کہا جاتا ہے :

حَرَّكَنِیَ الامر : مجھے اس معاملے نے پریشان کر دیا، میرے سکون کو اضطراب سے بدل دیا۔

اَلحُرِكُ : سبک اندام اور سبک خاطر غلام۔

اَلحَارِكُ : دونوں کندھوں کے مابین بالائی حصہ۔ کہا جاتا ہے :

رَكِبَ حارِكَ البعیر : اونٹ کے دونوں کندھوں کے درمیان کے بالائی حصے پر سوار ہوا۔

اَلحَراكُ : حرکت، سکون کی ضد۔ کہا جاتا ہے، لاحراكَ بِہ، اس میں حس و حرکت نہیں رہی۔

قرآن حکیم میں ہے :

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ (القیٰمہ: ۱۶-۱۷)

[آپ اس کو (یعنی قرآن کو) جلدی جلدی لینے کے لیے اس پر زبان نہ ہلایا کیجیے، یہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کا جمع کر دینا اور اس کا پڑھوانا]۔

آیت کے معنی یہ ہیں کہ جب جبریل امین قرآن کی آیات آپ کو سنائیں تو آپ فرطِ شوق اور اندیشۂ سہو و نسیان سے ان آیات کو زیرِ لب دہرایا نہ کیجیے بلکہ دل جمعی سے صرف سنا کیجیے۔ کیونکہ ان آیات کو آپ کے سینے میں بحفاظت جمع کر دینا، اور اس کو ٹھیک ٹھیک قرأت کے انداز میں ڈھال دینا ہمارا ذمہ ہے، آپ کا نہیں۔ آپ مطمئن رہیے کہ جن آیات کو آپ فی الحال سن رہے ہیں وہ حفظ و صیانت کے دائرے سے کبھی باہر نہیں ہونے پائیں گی اور یہ کبھی نہیں ہو پائے گا کہ وحی کے بارے میں سہو و نسیان کے بشری تقاضے آپ پر قابو پا سکیں۔ اسی یقین دہانی کو دوسری جگہ یوں بیان فرمایا گیا :

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝ (الاعلیٰ : ۶)

[ہم آپ کو قرآن پڑھا دیا کریں گے، پھر آپ اسے نہ بھولیں گے]۔

یہ صحیح ہے کہ پیغمبر سے تقاضائے بشری کے تحت بھول چوک کا صدور ہو سکتا ہے، لیکن وحی و تنزیل کے دائرے میں سہو و نسیان کی دخل اندازیاں ممکن نہیں، کیونکہ اگر پیغمبر کی ذات میں اس امکان کو مان لیا جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ دین کی کلی حفاظت وصیانت کا دعویٰ مشکوک ہے۔

ح ر م

حَرِمَ، حَرَمًا وحَرَامًا : روکنا، منع کرنا، محروم کر دینا۔

حَرَّمَ الشَّیٔ : حرام ٹھہرایا، ممنوع قرار دیا۔ عادتًا یا طبیعت کے اقتضا سے کسی چیز سے باز رہنے پر بھی حرام کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

حَرَّمَ الصَّلٰوۃَ : تحریمہ باندھا۔

جِلْدٌ مُحَرَّم : وہ چمڑا جو کمایا یا رنگا نہ گیا ہو۔

سَوْطٌ مُحَرَّم : وہ کوڑا جو نرم نہ کیا گیا۔

مُحَرَّم : قمری سال کا پہلا مہینہ۔ وہ بدوی جو شہری زندگی سے آشنا نہ ہو۔

تحَرَّمَ بہٖ : باہمی تعلقات کی وجہ سے حرمت کا قائم ہونا۔

اِحْتَرَمَہٗ : احترام کیا۔

اِحْتَرَمَ الشَّیٔ : اِس شی سے محروم ہو گیا۔

اَلْحَرِیْمُ : مُحرِم کا کپڑا۔ وہ شی جس کو حرام ہونے کی وجہ سے چھونا ممنوع ہو۔ بیوی۔

اَلْحُرْمَة : جس چیز کا ادا کرنا ضروری ہو۔ ذمہ۔

مَحَارِم : خوف و اندیشہ کے مقام۔ باخطرات، جمع مَحْرَم۔ کہا جاتا ہے:

سَریٰ فی محارم اللیل : اس نے رات کے خطرات کے باوجود سفر کیا۔

حلال و حرام کے سلسلے میں دو باتیں اصولاً سمجھ لینا چاہئیں۔ ایک یہ کہ زندگی جہاں آزادیٔ فکر سے تعبیر ہے وہاں اس آزادی کے کچھ حدود و تقاضے بھی ہیں۔ اس کے لیے کچھ پابندیوں کو قبول کرنا بھی ضروری ہے، یعنی زندگی کے دائرے میں جہاں ارادہ و ذوق کی حکم رانی کو ماننا

گیا ہے، وہاں کچھ منہیات کا خیال رکھنا بھی لازم ہے، کیونکہ اس کے بغیر خود زندگی کی تگ و تاز جاری نہیں رہ سکتی - شرائع میں کچھ چیزوں کا حلال و مباح ہونا اور کچھ چیزوں کا ممنوع اور حرام ہونا اسی اصول پر مبنی ہے - دوسرے یہ کہ شرائع جن چیزوں کو حرام ٹھہراتی ہے، ان میں کوئی نہ کوئی مضرت بہرحال موجود ہوتی ہے، چاہے اس کا تعلق صحتِ انسانی سے ہو، چاہے اخلاق و روحانیت سے ہو، اور چاہے انسان کی اجتماعی زندگی سے ہو - یہ الگ بات ہے کہ یہ مضرّت کبھی پنہاں ہوتی ہے اور کہیں ظاہر و باہر -

ہمیں ایک مسلمان کی حیثیت سے صرف یہ دیکھنا ہے کہ شریعتِ اسلامی نے کن امور کو جائز ٹھہرایا ہے اور کن امور کو ناجائز یا حرام - جائز امور کو اختیار کرنا چاہیے اور حرام اور ناجائز سے دامن کشاں رہنا چاہیے - ہمیں اس کھکھیڑ میں نہیں پڑھنا چاہیے کہ ہر حرام شی کی علّت اور کنہہ دریافت کرتے پھریں - بالخصوص ماکولات میں جو چیزیں حرام ہیں، ٹھیک ٹھیک ان کی علّتِ حرمت جاننا ہمارے بس کا روگ نہیں، اس معاملے میں ہمیں ذوقِ نبوت، شرائع کا تسلسل اور قرآن و سنت کی تصریحات پر یقین رکھنا چاہیے، اس سے زیادہ کے ہم مکلّف نہیں - کیونکہ ہماری چھان بین اور تحقیق و تفحص کا اصل تعلق طبیب سے ہے نسخے اور اس کے اجزا سے نہیں - اس لیے جب ہم نے براہین و دلائل کی روشنی میں آنحضرت کو طبیبِ حاذق مان لیا تو اس بات کی مطلق ضرورت نہ رہی کہ اجزائے نسخہ کی موزونیت پر غور کرتے پھریں - اگرچہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ اسلام کی ہر بات حکمت و مُصلحت انسانی پہ مبنی ہے -

قرآنِ حکیم میں ہے:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۚ (البقرہ : ۱۷۳)

[اس نے تو تم پر بس مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو غیر اللہ کے لیے نامزد کیا گیا ہو حرام کیا ہے] -

یہاں لفظ انما "کا لفظ بمعنی" بس " حصر کے لیے نہیں بلکہ محض ان مزعومات کی تردید کے لیے ہے جن کی بنا پر مشرکین مکہ اور بنی اسرائیل نے بعض حیوانات کو خواہ مخواہ حرام ٹھہرا لیا تھا -

قرآن حکیم میں ہے :

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ج (الانعام : ۱۵۱)

[آپ کہیے میں تمھیں پڑھ کر سناؤں وہ چیزیں جو تم پر تمھارے پروردگار نے حرام کی ہیں، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہو]۔

یہاں اَلَّا میں لا صرف نفی کے لیے نہیں بلکہ تاکید کے لیے ہے۔ معنی یہ ہوں گے کہ شرک حرام ہے، شرک نہ کرنا حرام نہیں۔ "و بالوالدین" کا تعلق اگر "ما حرّم" سے ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عقوقِ والدین حرام ہے جو "احسان"، یا حسن سلوک کی ضد ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہاں "اوصیٰ" کا لفظ محذوف مانا جائے۔ یاد رہے کہ قرآن اور ادبِ عربی میں حذفِ فعل کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں اور اس حذف کو بلاغت کے تقاضوں کے منافی نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی تائید اسی آیت کے سیاق سے بھی ہوتی ہے، جس میں یہ مذکور ہے :

ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ (البقرہ : ۱۵)

[اس کا تم کو اللہ نے حکم دے رکھا ہے]۔ قرآن حکیم میں ہے :

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ (القصص : ۱۲)

[اور ہم نے موسیٰ پر اجنبی دائیوں کو پہلے ہی حرام کر رکھا تھا]۔

فرعون نے جب حضرت موسیٰ کو لے پالک کی حیثیت سے قبول کر لیا تو مشکل یہ پیش آئی کہ وہ کسی دایہ کا دودھ لینے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اس میں تدبیرِ الٰہی کا اقتضا یہ تھا کہ تمام اجنبی راستوں کو آزما لینے کے بعد بالآخر وہ اس طرح مجبور ہو جائیں کہ دایہ گری کی خدمت ان کی والدہ سے لی جائے۔ یہاں "تحریم" کے معنی شرعی تحریم کے نہیں بلکہ ان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے جو عدم آمادگی کا میلان پیدا کر دیا، قرآن نے اس کو تحریم سے تعبیر کیا۔ گویا حضرت موسیٰ نے یوں کسی دوسری دایہ کا دودھ پینے سے انکار کر دیا جیسے یہ حرام ہو۔

قرآن حکیم میں ہے :

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (تحریم : ۱)

[اے نبی جس چیز کو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے اسے آپ کیوں حرام کر رہے ہیں]۔

یہاں بھی لفظ تحریم شرعی معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ مجازاً ہوا ہے۔ جب ایک بیوی کی رضاجوئی کی خاطر آپؐ نے شہد استعمال نہ کرنے کا عہد کیا تو یہ بات عنداللہ اس لحاظ سے انتباہ کی موجب ہوئی کہ کہیں مسلمان اس کو شرعی معنوں میں حرام نہ سمجھ لیں۔ تحریم کا لفظ یہاں اجتناب یا دست کشی کے مجازی معنوں میں اس لیے ہے کہ پیغمبر نہ صرف حلال و حرام کے حدود کو پہچانتا ہے بلکہ حلّت و حرمت کے مسائل میں بجائے خود حجت و استناد کے درجے پر فائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس شے کو پیغمبر حلال ٹھہرا دیں وہ حلال ہے اور جس کو حرام قرار دیں وہ حرام ہے۔ قرآنِ حکیم سے اس کی یوں تائید ہوتی ہے:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (الاعراف: ۱۵۷)

[اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں جائز بتاتا ہے اور ان پر گندی چیزیں حرام رکھتا ہے]۔

یعنی اگر وحی و تنزیل کے آغوش کا پروردہ ذوقِ نبوت حلال و حرام کے فرق کو نہیں جانتا تو اور کون جانے گا۔ کہنا یہ ہے کہ یہاں بحث تحلیل و تحریم کی نہیں، بلکہ اس بات کی ہے کہ اگرچہ ہر مسلمان کو یہ حق ہے کہ کوئی مباح اور جائز شے استعمال نہ کرے یا ہمیشہ کے لیے اپنے اس حق سے دست بردار ہو جائے، لیکن آنحضرت کا چونکہ ہر عمل مسلمانوں کے لیے واجب الاحترام ہے، اس بنا پر آپ کو اپنا یہ حق اس بنا پر استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا کہ آپ کے بعد آنے والے مسلمان کہیں سچ مچ امتناعِ اختیاری کو شرعی امتناع نہ قرار دے لیں۔

ح ر ی

حَرَی الشیٔ: کسی شی کا قصد کیا، کسی شی کو چاہا۔ یہ فعل لفظ حَرًا سے نکلا ہے جس کے معنی پہلو یا کنارے کے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ کسی شی سے قصد و عزم سے تعرض کیا۔ حرا کے معنی صحن کے بھی ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: نزلت بحراہ۔ میں اس کے صحن میں اُترا۔

حَرِیٌّ: لائق، سزاوار، مناسب۔ کہا جاتا ہے: هُوَ حَرِیٌّ بکذا۔ وہ اس کا اہل ہے، اس کا سزاوار ہے۔

تَحَرّی : کسی شی کو پانے یا معلوم کرنے کی غرض سے قصد و عزم کو پوری طرح حرکت میں لانا، پالینا، ڈھونڈ نکالنا۔ قرآن حکیم میں ہے :

فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝ (الجن : ۱۴)

[تو جس نے اسلام قبول کر لیا تو اس نے تو بھلائی کا راستہ ڈھونڈ نکالا] ۔

جنات کے ایک گروہ سے متعلق ہے کہ اس نے قرآن سنا تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اور ان میں کے بعض نے تو کھلم کھلا اس عجیب و عظیم کتاب سے وابستگی اختیار کر لی۔ اسلام قبول کیا اور پکار اُٹھے کہ ہم نے اس سے پہلے ایسا پُر تاثیر کلام نہیں سُنا۔ قرآن کے نقطۂ نظر سے اسلام کو مان لینے کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے نجات اور سعادت کی راہ پر قدم رکھ دیا اور جس حقیقت کا انھوں نے اعتراف کیا، یا جس شئ کے اختیار کرنے میں ان کے قصد و ارادہ نے ان کی دست گیری کی، وہ فی نفسہٖ سعادت، کامیابی اور کامرانی کا راستہ ہے۔ غرض یہ ہے کہ ان کے سامنے دو مختلف راہیں تھیں، یا تو مکہ والوں کی طرح قرآن کو سننے کے باوجود نہ مانتے اور بدستور کفر و شرک کی زنجیروں میں جکڑے رہتے اور یا پھر طوق و سلاسل کی اسیری سے رہائی پاکر جرأت مندانہ اقدام کرتے اور اسلام کی سچائیوں کو بہ دل تسلیم کر لیتے۔ انھوں نے یہ دوسری راہ اختیار کی، اور اس طرح اس راہ کو پا لینے میں کامیاب ہوئے جو انسانی فلاح و بہبود کی ضامن و کفیل ہے۔

ح ز ب

حَزَبَ : لاحق ہونا، پہنچنا۔ قرآن حکیم کا کوئی مقررہ جزو پڑھنا۔ کہا جاتا ہے، کَمْ حِزْبُكَ تم روزانہ کتنا قرآن پڑھتے ہو؟

حَزَبَهُ الْغَمُّ : اُسے غم پہنچا۔

حَزَّبَ الْقَوْمَ : قوم کو اس نے فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیا۔

حَازَبَ : مدد کرنا، کہا جاتا ہے۔ فلانٌ يُحَازِبُ فلانًا فلاں شخص نے فلاں شخص کی مدد کی۔

اَلْحِزْبُ : گروہ، جتھا، پارٹی۔ جن کے خیالات و افکار میں ہم آہنگی پائی جائے، ورد، حصہ۔ قرآن حکیم میں ہے :

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (المائدہ : ۵۶)

[اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں سے دوستی رکھے گا، سو بے شک اللہ ہی کا گروہ غالب ہے]۔

اس آیت سے ایک خاص گروہ کی نشان دہی کرنا مقصود ہے جو ہمیشہ باطل اور جھوٹ کے مقابلے میں کامیاب رہے گا۔ یہ وہ گروہ ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت و ولا کا جذبہ موجزن ہے جس کا اللہ کے رسول سے تودد و عقیدت کا رشتہ و تعلق استوار و محکم ہے اور جو اپنی تمام تر ہمدردی، تعاون اور دوستی کو مسلمانوں پر نچھاور کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ یہ گروہ قرآن کی اصطلاح میں "حزب اللہ" یا اللہ کا گروہ ہے۔

ایک دوسری آیت میں حزب الشیطان کا ذکر ہے۔ ارشاد باری ہے:

اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (المجادلہ : ۱۹)

[خوب سن لو کہ شیطان کا گروہ ٹوٹے ہی میں پڑ کر رہنے والا ہے]۔

حزب الشیطان سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس سے قبل کی آیت میں ان کی نشان دہی یوں کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلب و ذہن پر شیطان کا غلبہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہیں۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کی محبت اور یاد سے تہی ہیں، یعنی جو اس روحانی لذت سے ناآشنا ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے، جو اس کے احکام کو مان لینے سے اور اس کے ذکر سے رطب اللسان رہنے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر عطا ہوتی ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص اللہ کی دوستی سے محروم ہو جاتا ہے تو اس کے دل میں اس کے رسول اور اس کے بندوں سے بھی اس کا رشتہ و تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ یہی وہ خسارہ یا ٹوٹا ہے جس سے یہ گروہ ہمیشہ دوچار رہتا ہے۔

ح ز ن

اَلْحُزْنُ وَالْحَزَنُ: غم و اندوہ، زمین کی صلابت و سختی۔ جمع اَحْزَان۔ کہا جاتا ہے:

مَا اَشَدُّ حُزنه وحزنه : اس کا غم و اندوہ کس درجہ شدید ہے۔

اَحْزَنَہٗ حِزانك : تیری جدائی نے اسے غمزدہ کر دیا۔

اَرْضٌ حَزْنَۃٌ : سخت زمین۔

صَوْتٌ حَزِیْنٌ : غمگین آواز، دھیمی اور نرم آواز۔ رجل حزین، غمزدہ انسان۔

حزانۃ : اہل و عیال، جن کی تکلیف اپنی تکلیف بن جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے:

هٰٓؤُلَاۗءِ حَزَانَتُكَ : یہ تیرا اہل و عیال ہے۔

تَحَزَّنَ، تَحَازَنَ، اِحْتَزَنَ : غمگین ہوا، دردمند ہوا۔ قرآن حکیم میں ہے:

اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ج (التوبہ: ۴۰)

[جب کہ وہ اپنے رفیق سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کرو بے شک ہمارے ساتھ ہے]۔

یہ غارِ ثور کا واقعہ ہے۔ آنحضرتؐ جب حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اس میں قیام پذیر رہے تو دشمنانِ دین نے ان کا تعاقب کیا اور جب وہ تلاش و جستجو میں غار کے دہانے تک پہنچ گئے تو قدرتی طور پر حضرت ابوبکرؓ کو خلجان ہوا کہ کہیں یہ لوگ آنحضرتؐ کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ یہ خلجان یا غم دین کے تحفظ کے بارے میں تھا، اپنی ذات کے عدم تحفظ کی وجہ سے نہ تھا۔

حزن کی یہ کیفیت جو کسی عقیدے، جذبے اور ہمدردی کے بنا پر ہو، کمزوری نہیں بہت بڑی خوبی ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرتؐ نے حوصلہ افزائی کے انداز سے فرمایا: ہمیں کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، ہم تو حق کے مبلغ ہیں اور حضرتِ حق کی نصرت و تائید ہمارے ساتھ ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ آلِ عمران میں یوں بیان فرمایا:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (آل عمران: ۱۳۹)

[اور نہ ہمت ہارو اور نہ غم کرو تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن رہے]۔ قرآن حکیم میں ہے:

فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (البقرہ: ۳۸)

[تو جو کوئی پیروی میری ہدایت کی کرے گا سو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہی ہوں گے]۔

ابن آدم سے خطاب ہے کہ اگر تم نے ہدایاتِ الٰہی کی پیروی کی تو ہر طرح کے حزن و خوف

سے نجات حاصل کرو گے۔ غرض یہ ہے کہ اسلام چونکہ ہر دور میں زندگی کی زلف و کاکل کو سنوارنے کے لیے آتا ہے، اس لیے ایک شخص جب ان ہدایات پر عمل پیرا ہو جاتا ہے جو انبیا کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہیں تو اس میں زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر صحیح فیصلے تک پہنچ سکے۔ وہ بہت سے ان احزان و ہموم سے محفوظ ہو جاتا ہے جو غلط روی سے ابھرتے ہیں۔ لیکن کچھ غم ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا تعلق یکسر فطرت کی طرفہ طرازیوں سے ہوتا ہے۔ جب اس نوع کے تکالیف و مصائب کا سامنا ہو تو اسلامی نقطۂ نظر سے دو نوع کے طرزِ عمل اختیار کرنے ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ فرد او رمعاشرہ یہ دیکھے کہ ان تکالیف کو کیوں کر کم یا ختم کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان مساعی کے دوش بدوش مردانہ وار صبر و تحمل اور برداشت سے کام لے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی مصلحتِ تکوینی قرار دے۔ کچھ غم البتہ ہماری روحانی اور اخلاقی زندگی کے ارتقا کے لیے بے حد ضروری ہیں جن کو بہر حال باقی رہنا چاہیے۔ مثلاً بنی نوع انسان کی محبت اور ان کی فلاح و بہبود کا غم، اعلیٰ اقدارِ حیات اور علم و دانش کو فروغ دینے اور آگے بڑھانے کے ضمن میں ابھرنے والے مشکلات کا غم۔ انسانی معاشرے کو خوب سے خوب تر کی منزل تک پہنچانے کے سلسلے میں پیش آنے والی الجھنوں کا غم یا اللہ سے دوری کا غم اور اس کی رحمتوں سے محرومی کا غم۔

مقصد یہ ہے کہ اگر غم اپنا نہ ہو، دوسروں کا ہو، اصولوں اور زندگی کے پیمانوں کے فقدان کا غم ہو تو یہ بجائے خود صدا لذتوں کا باعث بن جاتا ہے۔

ح س ب

حَسَبَ : شمار کرنا، گننا۔

حَسِبَ : گمان کرنا، خیال کرنا۔

حَسُبَ : شریف النسب ہونا۔ حَسِیْبٌ شریف الاصل۔

حَاسَبَ : حسابات کی جانچ پڑتال کرنا۔

اِحْتَسَبَ گمان کرنا، شمار کرنا۔ کہا جاتا ہے: فلان لا یحتسب فلاں کسی شمار میں نہیں۔

اِحتسب وَلَدہ : اس نے اپنے جوان بیٹے کو کھو دیا، یعنی جوانی ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اِحتسبَ عند اللہ خیرا : اس نے اللہ تعالیٰ سے خیر کی امید رکھی۔

حَسَبٌ : شرافت، خاندانی افتخار، عدد، اندازہ - کہا جاتا ہے: فلان لاحَسَبَ لہٗ ولانَسَبَ

اس کو نہ خاندانی افتخار حاصل ہے اور نہ نسبی شرافت۔

ھٰذا حسبہ : یہ اس کے لیے کافی ہے۔

اِعمَل علیٰ حسبِ ما اَمَرْتُکَ : وہی کرو جس کا میں نے حکم دیا ہے۔

حِسَابٌ : شمار - اندازے سے زیادہ - کہا جاتا ہے:

اعطاہ عطاءً حسابا : اس نے اس کو اندازے سے زیادہ دیا۔

اَلْحِسْبَۃُ : ثواب، اجر- وہ ادارہ جو احتساب پر مامور ہو۔

اَلْحُسْبَانُ : حساب، اندازہ - عذاب، مصیبت، آفت۔

قرآن حکیم میں ہے:

الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝

(العنکبوت: ۱-۲)

[الف - لام - میم - کیا لوگوں نے خیال کیا ہے کہ محض یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوٹ جائیں گے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے]۔

غرض یہ ہے کہ ایمان لے آنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لائے ایک طرح کی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ کیونکہ جب کسی شخص یا معاشرے نے اسلام کے اسلوبِ حیات کی حقانیت کا اقرار کر لیا اور ان تمام عقائد و اعمال کو ٹھکرا دیا جو معاشرے میں پہلے سے رائج ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حق و باطل، صحیح اور غلط، اور اس نظامِ حیات میں جو ہمہ خیر و خوبی ہے اور اس اسلوبِ زندگی میں جو ہمہ ضلالت و گمراہی ہے، باقاعدہ لڑائی چھڑ گئی اور حق و صداقت کے خلاف باطل اور جھوٹ کی تمام قوتیں صف آرا ہو گئیں۔ یہ آزمائش کا وہ مرحلہ ہے جس میں صاحبِ اطمینان لوگوں کو بغیر کسی گھبراہٹ کے استقامت و عزیمت کا ثبوت دینا چاہیے اور ڈٹ کر باطل کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ کسی بھی سچائی کو چاہے یہ علمی سچائی ہو، چاہے دینی اور اصلاحی،

مان لینا درحقیقت جھوٹ سے نبرد آزما ہونے کا اعلان کرنا ہے۔ یہ لڑائی صرف عقائد اور اقدار کی لڑائی نہیں ہوتی جس میں بہرحال صلح ومفاہمت کا امکان پایا جاتا ہے بلکہ اس باطل کے ساتھ مفاد پرست طبقے کا مفاد وابستہ ہوتا ہے جس سے دست بردار ہونے کے لیے یہ ہرگز تیار نہیں ہوتے۔ اس بنا پر حق کے خلاف باطل کی سازش اور محاذ آرائی کا پیدا ہوجانا قدرتی امر ہے۔ تاریخ کے اوراق کو الٹ کر دیکھو، جب بھی کوئی نئی روشنی ابھر کر سامنے آئی اور چونکا دینے والا انکشاف رونما ہوا، سپرہ چشم آنکھوں کو ناگوار ہوا اور اس کے خلاف ایک مہم کا آغاز ہوگیا۔ اس لیے ضروری تھا کہ اسلام کے خلاف بھی۔ دشمنی کی آگ بھڑکتی اور مسلمانوں کو تخویف وتعذیب کے گوناگوں کوائف سے دوچار ہونا پڑتا۔ آیت کا مقصد مسلمانوں کو تاریخ کے اس ناگزیر عمل سے آگاہ کرنا اور ان کے حوصلوں کو بلند کرنا ہے اور اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ حق کا بالآخر بول بالا ہوتا ہے اور باطل بہرحال مٹ کر رہتا ہے۔

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ (بنی اسرائیل : ۸۱)

[بے شک باطل تھا ہی مٹنے والا]۔

قرآن حکیم میں ہے:

قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ (الزمر : ۳۸)

[کہہ دیجیے میرے لیے تو اللہ کافی ہے توکل کرنے والے اسی پر توکل کرتے ہیں]۔

قریش مکہ خدا کے ساتھ دیوی دیوتاؤں کو بھی حاجت روا مانتے تھے اور یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کی مخالفت سے زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔ اس آیت سے ان کے اس عقیدے کی تردید مقصود ہے۔ غرض یہ ہے کہ ان کے بس میں نفع ونقصان کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے کہ کسی کو تکالیف میں مبتلا کرنے یا کسی کو تکالیف سے نجات دلائے۔ جس نے اللہ تعالیٰ پر تکیہ کیا، اس کی قدرتِ کاملہ پر بھروسہ کیا اور جو اس کی بتائی ہوئی راہوں پر چلا، کامیابی وکامرانی اس کا مقدر بن گیا۔ یہ اللہ کے ذمے ہے کہ اپنے بندوں کے لیے کامیابی کے اسباب فراہم کرے۔ ان کی ضرورتیں پوری کرے اور ہر تکلیف اور دکھ میں ان کی رہنمائی کرے۔ شرط یہ ہے کہ بندوں کو اس پر پورا پورا بھروسہ ہو اور اس کی بتائی ہوئی راہوں پر یہ گام زن ہوں۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَاللّٰہُ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ۝ (البقرہ : ۲۱۲)

[اور اللہ جسے چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا رہتا ہے]۔

سیاقِ آیت میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ مال و دولت کی فراوانی اس بات کی دلیل نہیں کہ مال دار اور متمول انسان مرتبہ و درجہ کے لحاظ سے بھی خوش نصیب ہے۔ اس خوش نصیبی کا تعلق یکسر تقویٰ اور کردار کی پاکیزگی سے ہے، دولت و رزق کی فراوانیاں قطعاً اللہ تعالیٰ کی اس مشیّت کے تابع ہیں جو تکوینی اور اکتسابی ذرائع پر مبنی ہیں۔

"بغیر حساب" کے معنی یہ نہیں کہ اس کی عطا و دین کے کچھ پیمانے یا اصول نہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ وہ کبھی کبھی تمھارے اندازوں سے کہیں زیادہ دولت سے ان لوگوں کو بھی نوازتا ہے جو تقویٰ و کردار کے حامل نہیں ہوتے، لہٰذا دولت و ثروت کی کثرت کی وجہ سے کفر پر رشک نہ کرو اور نہ اس کو فضیلت و برتری کا معیار ٹھہراؤ۔

قرآن حکیم میں ہے:

اَلشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ ۝ (الرحمن : ۵)

[سورج اور چاند حساب کے پابند ہیں]۔

یعنی آفتاب، چاند اور تمام کواکب فلکی، اپنی چال اور منازلِ طلوع و غروب کو طے کرنے میں ایک حساب، انداز اور ٹلکے بندھے طریق کے پابند ہیں۔ ان میں ذرہ برابر کمی بیشی اور بڑھاؤ اور گھٹاؤ کا کوئی فرق پایا نہیں جاتا۔ یہ ایسی ریاضیاتی حکمتوں اور استواریوں کو لیے ہوئے ہیں جنھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ کس زبردست مہندس اور ریاضی داں کی عقل کامل نے انھیں تخلیق کیا اور فضائے آسمانی کی پنہائیوں میں پھیلا رکھا ہے۔ کانٹ نے سچ کہا تھا کہ تاروں بھرا آسمان اور ذہن و قلب میں پنہاں اندیشہ و فکر کی وسعتیں صرف حیران کن ہی نہیں، ایمان افروز بھی ہیں۔ قرآن حکیم میں ایک دوسری جگہ یہی لفظ اس سے مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے:

وَیُرۡسِلَ عَلَیۡهَا حُسۡبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ (الکھف : ۴۰)

[اور اس پر کوئی آسمان سے تقدیری مصیبت اتارے]۔

اس کے سیاق میں دو شخصوں کا قصہ مذکور ہے، جن میں ایک مومن ہے اور دوسرا کافر، ایک اللہ پر بھروسا رکھتا ہے اور دوسرا اپنے شگفتہ و شاداب باغ اور اس کی آمدنی پر نازاں ہے۔ مومن کا کہنا ہے کہ اللہ کو مانو اور دولت و ثروت کی کثرت پر نہ اتراؤ، ہو سکتا ہے تمہارے باغوں اور کھیتوں پر کوئی آفت نازل ہو اور یہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائیں۔

ح س د

حَسَدٌ : زوالِ نعمت کی آرزو۔ یعنی کسی کے عہدہ و منصب یا دولت و ثروت کے بارے میں یہ چاہنا کہ یہ اس سے محروم ہو جائے اور پھر اس کے لیے باقاعدہ سازش، تدبیر اور جتن کرنا۔ اس کے مقابلے میں غبطۃ کا لفظ ہے جس کے معنی رشک کرنے کے ہیں۔ رشک اور حسد میں نفسیاتی فرق یہ ہے کہ حاسد تو دوسروں کی آسودہ حالی و کامیابی پر کڑھتا ہے اور غابط خوش ہوتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ وہ بھی ان کامرانیوں سے بہرہ مند ہو جائے۔

حَسَدَ : حسد کیا، حسد سے کام لیا۔

اَحْسَدَ : اس کو حاسد پایا۔

تَحَاسَدَ : ایک دوسرے پر حسد کیا۔

حَسُودٌ : (مذکر و مؤنث) حسد کرنے والا، طبعاً حاسد۔ کہا جاتا ہے: ان الحسد یاکل الجسد: حسد جسم و بدن کو کھا لیتا ہے۔ یعنی نقصان پہنچاتا ہے۔ اَلْحَسَدَۃُ مُفْسَدَۃٌ حسد ایک نوع کا بگاڑ اور برائی ہے۔ الاکابر مُحَسَّدُوْنَ۔ بڑے لوگ ہمیشہ حسد کا ہدف بنتے رہتے ہیں۔ ع وَ لا تری لِلئام الناس حُسَّاداً ذلیل اور گھٹیا لوگوں کا کوئی حاسد نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم میں ہے:

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ج (النساء: ۵۴)

[کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں ان چیزوں کے باعث جو انھیں اللہ نے اپنے فضل سے دے رکھی ہیں]۔

یہاں یہودیوں کی تنگ دلی اور ان کی خوئے حسد کا ذکر ہے، یہ لوگ آنحضرت اور

مسلمانوں سے محض اس بنا پر حسد کرتے تھے کہ ان کو وحی و نبوت کی ارزانیوں سے کیوں نوازا گیا ہے، حالانکہ نبوت و رسالت کا استحقاق ان کے خیال میں صرف بنی اسرائیل کو حاصل ہونا چاہیے۔ ان کو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیے تھا، لیکن حسد کی آگ نے ان کو اس قدر حواس باختہ کر رکھا تھا کہ یہ کفارِ مکہ کو کھلے بندوں مسلمانوں پر ترجیح دینے لگے تھے۔ ان کا کہنا تھا:

هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ (النسآء: ۵۱)

[کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی لوگ زیادہ ہدایت یاب ہیں]۔

یعنی حسد ایسی بیماری ہے کہ اس سے انسان حق کو پہچاننے کے باوجود حق کی مخالفت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝ (الفلق: ۵)

[اور حسد کرنے والے کے شر سے جب حسد کرے]۔

معاشرے میں ہر عداوت اور دشمنی کے پیچھے کم و بیش جو جذبہ کار فرما ہوتا ہے وہ حسد ہے۔ اس آیت میں اس سے کنارہ کش رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

حسد ایک ذہنی اور نفسیاتی روگ ہے جو عموماً ان لوگوں میں پایا جاتا ہے جو بزدل اور کمزور ہوں۔ ایسے لوگ جب کسی مقام پر اپنی ہمت سے خود فائز نہیں ہو سکتے تو ان میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور چاہنے لگتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح جو شخص اپنی محنت، قابلیت اور توفیقِ الٰہی سے اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے، اس کی کامیابی کو ناکامی میں بدل دیں۔ حساد سے بچنے کا بہترین اور صحت مند انداز یہ ہے کہ ان کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ ہو سکے تو ان کے لیے دعا کی جائے اور ان کی طرف دستِ اعانت بڑھایا جائے۔

ح س ر

حَسَرَ المَاءُ : پانی اُتر گیا۔ پایاب ہو گیا۔

حَسَرَتِ الجاریۃ خمارھا عن وجھھا : لڑکی نے اپنے چہرے سے اوڑھنی ہٹا دی، اپنا چہرہ کھول دیا۔

حَسَرَ البَصَرُ : نگاہ تھک گئی۔

حَسِرَ : تھک گیا، اظہار تاسّف کیا۔

حَسَّرَ الطائِرُ : پرندے کے پَر گر گئے۔

اَحْسَرَ : دوڑ اور چلا کر تھکا دیا۔

تحسَّرَ علیہ : اس پر اظہار تاسف کیا۔

اِنْحَسَرَ : کھل گیا۔ چھٹ گیا۔ کہا جاتا ہے : اِنْحَسَرَ عنه الظلام۔ اندھیرا چھٹ گیا اور وہ روشنی میں آگیا۔

حَسِیْرٌ : تھکا ماندہ، کمزور۔

اَلْمَحْسَرُ : چہرہ، باطن۔ کہا جاتا ہے۔

فلان کَرِیْمُ المَحْسَرِ : وہ باطن یا دل کا اچھا ہے، شریف آدمی ہے۔

اَلْحَسْرَۃ : افسوس، ارمان، کسی شے کے کھو جانے پر اظہار تاسف و ندامت۔

قرآن حکیم میں ہے :

يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ (الملک : ۴)

[نگاہ آخر ذلیل اور ماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی]۔

غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی ہر شے کو اس درجہ حکمت و ریاضی سے بنایا اور سنوارا ہے کہ تم اگر بار بار نگاہِ تجسّس سے کام لو اور ان میں خلل، نقص یا عیب ڈھونڈھنے کی کوشش کرو، پھر بھی ناکام رہو گے، تمھاری نظر تھک جائے گی، نگاہ ماندہ ہو جائے گی اور فکر و تعقل کی تمام تر سعی بے کار ہو جائے گی۔ اللہ کے کام اتنے مکمل، اتنے حسین اور نپے تلے ہیں کہ ان میں تضاد و نقص کا پایا محال ہے۔ قرآن حکیم میں ہے :

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ط ۔ (البقرہ : ۱۶۷)

[بس اسی طرح اللہ ان کے اعمال کو خالی ارمان کر کے دکھائے گا]۔

قیامت کے روز جب نام نہاد مشائخ اور بڑے بڑے روحانیت اور نجاتِ عوام کے مدعی اپنے مریدوں اور ماننے والوں سے برأت کا اظہار کریں گے اور نیاز و عقیدت کے تمام

مصنوعی رشتے منقطع ہو جائیں گے، اس وقت ان فریب خوردہ مریدوں کی آنکھیں کھلیں گی اور یہ آرزو کریں گے کہ ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تاکہ ہم دنیا ہی میں ان لوگوں کے تقدس کا پردہ چاک کر سکیں اور ان سے اسی طرح اپنا تعلق منقطع کر سکیں جس طرح کہ آج انھوں نے بہ کمال بے نیازی ہم سے ہر نوع کے تعلق کو منقطع کر لیا ہے۔ لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوگی اور ان کا تمام کیا دھرا حسرت، تاسف اور خالی ارمان ہو کر رہ جائے گا۔

ح س س

حَسَّ : معلوم کیا، قتل کیا۔

حسّ البردُ الزرعَ : پالے نے کھیتی کو برباد کر ڈالا۔ جلا ڈالا۔

حسّ النار : کباب پر مزید آگ ڈالی تاکہ خوب پختہ ہو جائے۔

حَسَّ و اَحَسَّ منہ الخبر : اس نے اس سے خبر معلوم کی۔

ما اَحَسْنا منہ الخبر : ہمیں اس سے کوئی خبر معلوم نہیں ہو پائی۔ کہا جاتا ہے:

من این حسست الخبر : تمھیں یہ اطلاع کہاں سے ملی۔

تحسس : معلوم کیا، دیکھا، سنا۔

اِحْتَسَّ : چھوا، جڑ سے اکھیڑ دیا۔

الحسیس : آہستہ آواز، آہٹ، مقتول۔

الحَاسّۃُ : احساس سے بہرہ ور قوت، جمع حواس۔

اَلْمحسُوس : قحط کا سال۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ج (آل عمران: ۱۵۲)

[اور یقیناً اللہ نے سچ کر دکھایا اپنا وعدۂ نصرت جب کہ تم انھیں اللہ کے حکم سے قتل کر رہے تھے]۔

غزوۂ احد سے متعلق ہے، جب مسلمانوں نے کفارِ مکہ کے حملوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ کفارِ مکہ کو شکست ہوئی اور وہ اس جنگ میں مارے جائیں یہ اللہ کے حکم و مصلحت کے عین مطابق تھا۔ اس اذن کا قرآن میں ذکر نہیں۔ ظاہر ہے یہ اذن آنحضرتؐ کی طرف سے تھا، جس کو اذنِ الٰہی سے

تعبیر کیا گیا۔ اس لیے کہ دینیات میں نطقِ پیغمبر نطقِ الٰہی ہی کی ایک شکل ہے۔ یہاں "تَحُسُّوْنَهُمْ" قتل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ۝ (مریم: ۹۸)

[کیا آپ ان میں سے کسی کو بھی سنتے ہیں یا ان کی آہستہ آواز بھی سنتے ہیں]۔

ان اقوام کا ذکر ہے جو اسلام سے پہلے اپنی نافرمانیوں کی پاداش میں سنت اللہ کے مطابق معمورۂ ارض سے حرف غلط کی طرح مٹ گئیں۔ اپنے دور میں یہ ٹھاٹ سے رہ رہی تھیں لیکن اب یہ حال ہے کہ ان کا ذکر تک زبانوں پر سنائی نہیں دیتا۔

قرآن حکیم میں ہے:

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ج (الانبیا: ۱۰۲)

[اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے]۔

یعنی جو لوگ اس دنیا میں نیک و پارسا بن کر رہے، وہ جنت میں شاداں و فرحاں اس طرح رہیں گے کہ جہنم کی آہٹ تک نہ سنیں گے۔

ح س م

حَسَمَ : جڑ سے کاٹ دیا۔

حَسَمَ العرق : کٹی ہوئی رگ کو آگ سے داغنا، تاکہ خون بہنا بند ہو جائے۔

حَسَمَ الدّاء : بیماری کا قلع قمع کر دیا۔

اَحْسَم : وہ شخص جس کا فیصلہ دو ٹوک ہو۔

اَلْحُسَامُ : تلوار، سیف قاطع۔

حسام السیف : تلوار کی دھار

حاسم : کاٹ کر رکھ دینے والی، کہا جاتا ہے: دَلِيْلٌ حَاسِمٌ۔ برہان قاطع۔ وہ دلیل جو خصم کے شبہات کو کاٹ کر رکھ دے۔

حُسُوْمٌ : اضداد میں سے ہے۔ مبارک اور منحوس دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

مبارک اس بنا پر کہ نحس و شوم کے تمام اثرات کو ختم کر دینے والی ہے اور منحوس اس اعتبار سے کہ خیر کے تمام امکانات کو مٹا ڈالتی ہے، اس میں تواتر اور تسلسل کا پہلو بھی پایا جاتا ہے، یعنی ایسی آفت جس سے کوئی قوم مسلسل دوچار رہی۔ قرآن حکیم میں ہے:

سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا (الحاقہ: ۷)

[(اللہ نے) اسے ان پر مسلط کر دیا تھا سات راتوں اور آٹھ دن تک لگاتار]۔

قانونِ مکافات ایک تاریخی عمل ہے، جو قوم اللہ کے احکام کو ٹھکراتی ہے، کبر و غرور کا مظاہرہ کرتی ہے اور توحید، عدل، آخرت اور اخلاقی و دینی اقدار کو جھٹلاتی ہے، اس کو اسی دنیا میں عذاب کا مزہ چکھنا پڑتا ہے۔ عاد و ثمود کی قومیں جن پر عذابِ الٰہی نازل ہوا، ایسی ہی قومیں تھیں۔ کھاتی پیتی، مہذب و متمدن، بڑے بڑے ایوانوں اور محلوں میں بود و باش رکھنے والیں۔ انھوں نے جب پیغمبر کی پکار نہ سُنی، توحید اور آخرت کا انکار کیا اور اپنی زندگی کو نیکی اور ایمان کے سانچوں میں ڈھالنے کی بجائے بے جا کبر و غرور کا اظہار کیا تو اللہ کے عذاب نے انھیں مسلسل اور لگاتار آندھی کی صورت میں آ لیا، جو صبح و شام آٹھ دن تک بغیر کسی وقفے کے چلتی رہی۔

ح س ن

حُسْنٌ: راغب کے نزدیک ہر وہ شی جو فرحت آفریں اور مطلوب ہو حسین کہلائے گی۔ ان کی رائے میں خوب صورتی اور حسن کا تعلق کبھی عقلیات سے ہوتا ہے، کبھی خواہشات سے اور کبھی محسوس اشیاء سے۔

حَسَنَ و حَسُنَ: خوب صورت ہوا، جمیل ہوا۔

حَسَّنَ: آراستہ کیا، سجایا۔ حَسَّنَ اللہُ خَلْقَهٗ: اللہ نے اسے خوب صورت بنایا ہے۔

اَحْسَنَ: نیکی کی، کسی کام و عمدگی اور ڈھب سے انجام دیا۔ کہا جاتا ہے:

فلان یحسن القرأۃ: وہ اچھی طرح پڑھتا ہے۔

اَحْسَنَ الیہ: اس سے نیکی کی، حسنِ سلوک سے پیش آیا۔

قیمۃ المرء فما یُحْسِنُ: آدمی کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی پسند سے ہوتا ہے۔

اَلْحَسَنَةُ : نیکی، بھلائی، بہتری - ہر وہ چیز جو خوش آئند ہو باعتبارِ جسم، باعتبارِ روح یا باعتبارِ احوال و کیفیات -

اَلْحُسْنٰی : اچھا کام، اچھی اور جمیل شی -

قرآن حکیم میں ہے :

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (البقرہ : ۲۰۱)

[اور کوئی ان میں ایسے ہوتے ہیں جو کہتے ہیں اے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری دے اور آخرت میں بہتری اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچائے رکھنا] -

مشرکینِ مکہ کی طلب و جستجو کا دائرہ صرف مادی مسرتوں اور جسمانی آسائشوں کی حد تک ہی پھیلاؤ رکھتا تھا - ان سے کہا گیا کہ تم اپنی تمام تر توانائیوں کو ان تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کی خاطر کھپا کر دیکھ لو - مگر یہ یاد رکھو کہ قلب و روح کی شادمانیاں تمھیں حاصل ہونے والی نہیں - دنیا میں تم بلاشبہ سیم و زر کے انبار جمع کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے، لیکن آخرت میں جہاں صرف نیکیاں ہی کام آتی ہیں، تمھارا کوئی حصہ نہ ہوگا -

آیت کا مقصد یہ ہے کہ توازن و اعتدال اور کامرانی و کامیابی کی راہ وہ ہے جس کو وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو دنیا کی بھلائی کے ساتھ ساتھ آخرت کی بھلائی کے بھی خواہاں ہیں اور جو جسم کی آسودگی کے ساتھ ساتھ روح کی بالیدگی کو بھی ضروری جانتے ہیں -

"حسنہ" کا اطلاق قرآن میں ہر اس اقدام پر ہوتا ہے جو اچھا ہو، جو قلب و روح اور فکر و نظر کو بھائے، جو انسانی زندگی کے لیے مفید، بار آور اور عمدہ ہو، جس میں حسن اور سلیقہ ہو، جو اپنے آغوش میں توازن و اعتدال کی خوبیاں لیے ہوئے ہو - حسنات اس کی جمع ہے -

قرآن حکیم میں ہے :

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (ہود : ۱۱۴)

[بے شک نیکیاں مٹا دیتی ہیں بدیوں کو] -

کائنات میں دو طرح کے نظام کارفرما ہیں۔ ایک تخریب و فساد کا اور دوسرا تعمیر و ترقی کا۔ یعنی اگر کارگاہِ عظیم میں کہیں خلل، بگاڑ یا فساد ابھر آتا ہے تو وہیں اس کا اہتمام بھی پایا جاتا ہے کہ اصلاح و تعمیر کے تقاضے بھی سرگرم عمل ہو جائیں۔ خود انسانی جسم کو دیکھو، لاکھوں اور کروڑوں خلیے اس میں بیک وقت بگڑتے، فنا پذیر ہوتے اور از سرِ نو حیاتِ تازہ سے بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں۔ یہی حال خیر و شر کا ہے۔ اگر ذہن و قلب میں برائی کے داعیے شر پر ابھارتے ہیں تو ادراک و علم کے اسی مرکز میں ایسے عوامل بھی مضمر ہیں جو خیر اور نیکی کو اختیار کرنے میں از حد ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مزید برآں نیکیوں میں یہ طاقت بھی ہے کہ برائیوں کو لوحِ قلب پر سے بالکل محو کر دیں۔

اس آیت میں اسی فلسفۂ حیات کی وضاحت کی گئی ہے۔ غرض یہ ہے کہ ہمارا اصل مسئلہ یہ نہیں کہ اگر بہ تقاضائے بشریت ہم سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے تو تمام عمر اسی تاسف میں گزار دیں کہ ہم سے فلاں گناہ کیوں سرزد ہوا، بلکہ ہمیں یہ چاہیے کہ اس گناہ سے توبہ کر کے آگے بڑھیں اور نیکیوں کو سمیٹتے چلے جائیں۔

نیکیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ انفرادی بھی ہو سکتی ہیں اور اجتماعی بھی۔ خالص فکری و ذہنی بھی ہو سکتی ہیں اور عمل و فعل سے متعلق بھی۔ یعنی ہر وہ سوچ، نیت اور اقدام نیکی ہے اور دائرۂ حسنات میں داخل ہے جس میں اخلاص کی مہک ہو، اللہ کی رضاجوئی کا جذبہ فروزاں ہو اور جو خلق اللہ کے نفع اور فائدے کے لیے ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۝ (طٰہٰ: ۸)

[اللہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اچھے اچھے نام اسی کے ہیں]۔

اسما کا لفظ یہاں صفات کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ غرض یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کے لیے جس جس صفت کو بیان کیا ہے، وہ اس کے جمال و کمال کی آئینہ دار ہے، اس لیے تم اس کو جس صفت کے ساتھ بھی پکارو جائز ہے۔

صفات کے بارے میں یہ نکتہ یاد رکھنے کا ہے کہ اگرچہ تمام وہ صفات جو اس کی

قدرت، حکمت اور رحمت وعفو پر دلالت کناں ہیں، اللہ ہی کی صفات ہیں تاہم اس کا تعیّن توفیقی امر ہے قیاسی نہیں۔ اس بنا پر دعا اور ذکر کی غرض سے صرف انہی صفات کو اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کیا جائے گا جو منصوص ہیں۔

یہ صفات جو قرآن حکیم میں خصوصیت کے ساتھ مذکور ہیں بالکل وہی ہیں جن کو ہم اس کائنات میں کارفرما دیکھتے ہیں، یعنی جو کائنات کے پورے نظام اور اس کے ذرے ذرے سے عیاں ہیں۔ یہ وہ صفات ہیں جو اس کی قدرت تخلیق، اس کی ربوبیت، اس کی حکمت اور اس کے عفو و کرم پر مشتمل ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہ عالمِ کون و مکان، یہ دبستانِ عجائب اور نظم و ارتباط پر مبنی کارگاہِ حیات یوں ہی بخت و اتفاق کی شعبدہ طرازیوں سے سطح وجود پر نہیں ابھرا ہے، بلکہ یہ نتیجہ ہے اس ذاتِ حق کی جنبشِ تخلیق کا جو تمام صفات حسن و کمال کا جامع ہے اور جس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں۔ جس طرح اس کائنات کی پہنائیاں حدِ حساب سے ورا ہیں، اسی طرح اس کی صفات بھی بے شمار ہیں۔ ہمیں اپنے محدود علم کے مطابق سردست انہی صفات کا ادراک ہو سکتا ہے، جن کا تعلق اس نظامِ شمسی سے ہے جن کے تحت ہم رہ رہے ہیں، اور پوری کائنات کی وسعتیں چونکہ اپنے آغوش میں ہزاروں آفتاب اور ہزاروں کہکشائیں لیے ہوئے ہیں، اس لیے ہم نہیں جانتے کہ اس کی ربوبیتِ بے کراں کے کرشمہ ہائے حسن و جمال اور کن کن صورتوں میں جلوہ گر ہیں اور زندگی کے دبستان اور کہاں کہاں اور کس کس طرح مہک رہے ہیں۔

ح ش ر

حَشَرَ النَّاسَ : لوگوں کو اکٹھا کیا، جمع کیا۔ ایک مقام سے منتقل کر کے دوسرے مقام تک پہنچا دیا۔ میدانِ جنگ میں دھکیلا۔

حَشَرَ فلاناً عن وطنہ : اس کو جلاوطن کیا۔

حَشَرَ الْعُوْدَ : لکڑی کو چھیلا، باریک کیا۔ حَشَرَ السِّنَانَ۔ نیزے کے پھل کو تیز کیا۔

حَشَرَتِ السَّنَۃُ المالَ : قحط سالی نے مال ڈھور کو ہلاک کر دیا۔

اَلْحَشَرَۃُ : کیڑا مکوڑا۔

اَلْحُشْرُ : بھوسی، چھلکا۔

اَلْحُشُوْرُ : بڑے پیٹ والا۔

حَاشِرٌ : ہرکارہ۔

يَوْمَ الْحَشْرِ : قیامت کا دن۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ (النازعات: ۲۳)

[اور لوگوں کو جمع کیا، پھر بلند آواز سے تقریر کی اور کہا کہ میں ہوں تمھارا رب اعلیٰ]۔

حضرت موسیٰ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا تو فرعون کو تشویش ہوئی کہ مبادا لوگ مجھے آفتاب کا اوتار ماننے سے انکار کردیں اور اس طرح میرا عرشِ اقتدار دھڑام سے زمین پر آ رہے۔ اس بنا پر اس نے اپنے حواریوں کو جمع کیا اور یقین دلایا کہ میں ہی تمھارا ربِ اعلیٰ ہوں۔ اس معاملے میں فرعون نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا، ہمیشہ خداوندان باطل کی یہی روش رہی ہے کہ اپنی جھوٹی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی عظمت و برتری کا ڈھنڈورا پیٹتے رہیں اور لوگوں کو یقین دلاتے رہیں کہ وہی ان کی قسمت و مقدر کے ضامن ہیں۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

(الانعام: ۱۱۱)

[اور خواہ ہم ہر چیز کو ان کے پاس ان کے سامنے ہی لا جمع کر دیتے جب بھی یہ لوگ ایمان لانے کے نہیں تھے]۔

کفار کے تعصب و عناد کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ بجائے اس کے کہ حق کو دلائل و براہین کی روشنی میں جانچیں پرکھیں، معجزات اور خوارق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر ان کے تمام مطالبات مان بھی لیے جائیں اور ان کے سامنے تمام خوارق لا جمع کر دیے جائیں تو بھی یہ ایمان لانے والے نہیں۔ کیونکہ ایمان کے لیے شرط اول صدقِ نیت ہے، جس سے یہ قطعی محروم ہیں۔ یہاں جمع کا لفظ معنوی اشیا کے لیے استعمال ہوا ہے یعنی خوارق اور معجزات کے لیے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ۙ (التکویر : ۵)

[اور جب وحشی جانور اکٹھے کر دیے جائیں] ۔

یہاں حشرِ بہائم سے مراد یا تو یہ ہے کہ جب وہ فیصلہ کن گھڑی آ پہنچے گی، جب پرانی اور ناقص دنیا کو ایک جدید اور ابدی دنیا کے قالب میں ڈھال دیا جائے گا، تو جہاں اس مرحلے میں آفتاب بے نور ہو جائے گا، ستارے اپنی چمک دمک سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور پہاڑ اپنی استواری اور محکمی کے باوصف ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اس وقت تمام بہائم اور جانور اس ہولناک منظر سے گھبرا کر اپنی خصوصیات فطری کو بھول کر ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔

یا یہ مراد ہے جو حضرت ابن عباس اور ربیع بن خیثم سے مروی ہے کہ یوم حشر تمام جانوروں پر موت طاری ہو جائے گی یعنی چونکہ ان کا مصرف ختم ہو جائے گا، اس لیے انھیں باقی نہیں رکھا جائے گا۔

قرآن حکیم میں ہے :

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ اَرْسِلْ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ۝ۙ (الاعراف : ۱۱۱)

[بولے اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دیجیے اور ہرکارے شہروں شہروں بھیجیے] ۔

ان ہرکاروں کو حکم دیا گیا کہ وہ تمام شہروں میں گھوم جائیں اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر جادوگروں کو جمع کر لیں تاکہ وہ حضرت موسیٰ کے معجزات و خوارق کا مقابلہ کر سکیں۔ فرعون کے ان مشیروں کو کیا معلوم کہ معجزات، جادوگروں کی ابلہ فریبیوں سے بالکل مختلف ایک حقیقت ہے، جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے تصرفاتِ کونیہ سے ہے اور ان قوانین سے ہے جو عام قوانینِ فطرت سے بالا ہیں۔

ح ص ب

حَصَبَ : کنکری سے مارا۔

حَصَبَتِ الرِّیْحُ بِالْحُصْبَا : تیز ہوا یا آندھی کنکریاں اڑاتے ہوئے چلی۔

رِیحٌ حاصب : وہ آندھی یا تیز و تند ہوا جس سے کنکریاں اُڑنے لگیں۔

حَصَبوا المَسْجِدَ : مسجد میں کنکریاں بچھائیں۔

حَصِبَ : خسرے کے مرض میں مبتلا ہوا۔

اَحْصَبَ عَنْہُ : بھاگ کھڑا ہوا، روگرداں ہوا۔

اَلْحَصَبُ : سنگ ریزہ، کنکری، پتھر۔ ایندھن، کندا

اَلْحُصْبَۃُ : کھسرا۔

اَرْضٌ حَصِبَۃٌ : وہ زمین جس میں کنکریاں ہوں۔

لَیْلَۃُ الْحُصْبَۃِ - ایام تشریق کے بعد کی رات :

قرآن حکیم میں ہے :

اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَھَنَّمَ ط (الانبیا : ۹۸)

[بے شک تم اور جو کچھ تم اللہ کے سوا پوجتے رہے ہو سب جہنم کے کندے ہیں]۔

مشرکینِ مکہ سے بالخصوص اور مشرکین سے بالعموم خطاب ہے کہ آج تم جن بتوں کو پوج رہے ہو اور جن شخصیتوں کو ان کے ادعائے باطل کے مطابق خدا مان رہے ہو، کل قیامت کے روز ان کا اور تمھارا انجام یہ ہونے والا ہے کہ تم سب کو جہنم کا کندا بننا ہوگا۔ تم اپنی آنکھوں سے یہ عبرت ناک منظر دیکھو گے کہ بڑے بڑے لات و ہبل اور عزیٰ و منات نہ صرف عرشِ اُلوہیت سے گرتے جا رہے ہیں بلکہ انھیں جہنم کا لقمہ بنایا جا رہا ہے۔

شرک میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سے شرفِ انسانیت مجروح ہوتا ہے اور وہ عالی مرتبت انسان جو مسجودِ ملائک ہے، اپنے ہی ہم جنس انسانوں یا بتوں کے آگے اپنے عجز و بندگی کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے اپنے مقام کا تقاضا یہ تھا کہ یہ کائنات کو مسخر کرے، قوانینِ فطرت کریدے اور اپنے عزم و ہمت سے یہ ثابت کر دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی شے عظیم نہیں۔ شرک نہ صرف عظمتِ انسانی کے خلاف سازش اور عقل کی حکمرانی کے معاملے میں غداری ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان میں زبردست گستاخی بھی ہے۔ اس بنا پر اس کی سزا بھی تمام گناہوں سے زیادہ ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

اَفَاَمِنْتُمْ اِنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا

(بنی اسرائیل ، ۶۸)

[کیا تم اس سے بے کھٹکے ہو گئے کہ وہ تمھیں خشکی کی طرف لاکر زمین میں دھنسا دے یا تم پر کوئی تند ہوا بھیج دے] ۔

غرض یہ ہے کہ انسان کو کسی وقت بھی اپنے کو مامون و محفوظ نہیں سمجھنا چاہیے، ہلاکت و فنا ہر آن اس کی تاک میں ہے ۔ بالخصوص جب کہ انسان از راہِ تمرد اللہ تعالیٰ کے احکام سے روگردانی اختیار کرلے اور ایسی زندگی بسر کرنا شروع کر دے جو فسق و فجور اور انسانی حقوق کی پامالی پر مبنی ہو ۔ ان حالات میں اسے اپنی نادانی پر نہ اترانا چاہیے اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہِ غضب کی زد سے یہ بچ نکلے گا ۔

آندھیاں اور زلزلے اگرچہ قانونِ قدرت کا ایک ظہور ہیں، تاہم ان میں عبرت کا ایک پہلو پایا جاتا ہے ۔ اس آیت میں اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے ۔

ح ص د

حَصَدَ الزَّرْعَ : کھیتی کو درانتی سے کاٹا ۔ کہا جاتا ہے ۔

مَنْ زَرَعَ الشَّرَّ حَصَدَ النَّدَامَةَ : جو شر بوئے گا، وہ ندامت کاٹے گا ۔

حَصَدَ بِالسَّیْفِ : تلوار سے گردن اڑا دی ۔

اِحْتَصَدَ : کاٹا ۔

حَصِدَ الدِّرْعُ : زرہ کو مضبوطی سے ترتیب دیا ۔

اَحْصَدَ الزَّرْعُ : کھیتی کاٹنے کا وقت قریب آگیا ۔

تَحَصَّدَ النَّاسُ : لوگ جتھے کی شکل میں جمع ہوئے ۔

اَلْحَصَدُ : کھیت کا کٹا ہوا حصہ ۔

اَلْحَصِیْدُ : کھیت کا کٹا ہوا حصہ، وہ شی جو ختم ہو گئی ۔ جمع حصایِد　وہ بُری اور ناحق بات

جو دوسروں کے بارے میں کہی جائے

حدیث میں آنحضرت کا ارشاد ہے :

وَ هَلْ يُكِبُّ النَّاسَ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ.

لوگوں کو جہنم میں ناک کے بل گرانے والی چیز ان کی زبان سے نکلے ہوئے ناحق کلمات ہیں۔

اَلْحَصَادُ : فصل کاٹنے کا وقت۔

قرآن حکیم میں ہے :

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ ٥ (ہود: ١٠٠)

[یہ ان بستیوں کی خبریں تھیں جو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں بعض ان میں سے قائم ہیں اور بعض ختم ہی ہوگئیں]۔

غرض یہ ہے کہ ہم نے دو قسم کی بستیوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں جیسے عاد، ثمود اور لوط کی بستیاں اور دوسری وہ جن کے سرکش اور سرغنہ لوگوں کو تو مٹا دیا گیا لیکن ان بستیوں کو قائم رکھا گیا جیسے مصر وغیرہ۔

یہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات کا کرشمہ ہے کہ وہ قومیں اور بستیاں تو زندہ و قائم رہیں جو خیر کو اپناتی اور شر سے دامن کشاں رہتی ہیں اور ان قوموں کو اپنے کیے دھرے کی سزا ملے جو شر کی سرپرستی کرتی اور خیر سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔

" قیام و حصاد" کا یہ عمل تاریخ کا اٹل عمل ہے جو ہر دور میں جاری و ساری رہتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ سزا اور زندگی کی نوعیت برابر بدلتی رہتی ہے۔ چنانچہ آج بھی تہذیب و ارتقا کے اس عہد میں انسان اپنی غلط کاریوں کی سزا بھگت رہا ہے اور جو کام اس نے بنی نوع انسان کی بھلائی اور بہبود کی خاطر کیے ہیں، ان کی وجہ سے زندگی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ (انعام: ١٤١)

[اس کے پھلوں میں سے کھاؤ جب وہ نکل آئے اور اس کا حق شرعی اس کے کاٹنے کے دن ادا کر دیا کرو]۔

مقصد یہ ہے کہ جب فصل کٹے یا پھل آئے، اس وقت اس کے ثمرات سے صرف کھیت یا باغ کا مالک ہی بہرہ مند نہ ہو، بلکہ اس میں سے غربا و مساکین کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور دیا جائے۔

صحابہ اور تابعین میں اس امر میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے کہ اس سے مراد کیا ہے عشر یا عشر کے علاوہ صدقہ۔ حضرت ابن عباس، انس بن مالک، طاؤس اور قتادہ وغیرہ کی یہ رائے ہے کہ اس سے مقصود عشر ادا کرنا ہے۔ عبداللہ بن مبارک، نافع اور حسن بصری کے نزدیک اس سے مراد صدقہ ہے۔ حضراتِ احناف بھی صدقہ ہی کے قائل ہیں۔ "حقّہ" کا لفظ دونوں معنوں پر دلالت کناں ہے۔ یعنی فقرا و مساکین کو اس کا حق مشروع ادا کرتے رہو۔ یا وہ حق جو عام طور پر زمینداروں میں جانا بوجھا اور معروف ہے۔

ح ص ر

اَلْحَصَرُ وَ الْحُصْرُ : پیٹ کا کھنچ جانا، قبض، تنگی اور حبس۔ کہا جاتا ہے:

فِی لِسَانِہٖ حَصَرٌ : اس کی زبان میں ایک قسم کا ضیق یا تنگی پائی جاتی ہے، یعنی اپنے مفہوم کو اچھی طرح ادا نہیں کر پاتا۔

حُصِرَ الرَّجُلُ یا بِہٖ حُصْرٌ اسے قبض ہو گیا۔

اَلْحِصَارُ : گھر جانا، محصور ہو جانا۔ جو چیز محصور کر دے۔ گدیلہ یا تکیہ۔

حَصِیْرٌ : پادشاہ، چٹائی، فرش، قید خانہ۔

حَصِیْرٌ : اسرار کو فاش نہ کرنے والا۔

حَصُوْرٌ : پاک باز، ضبط نفس کا حامل اور وہ جو ازدواجی تعلق سے گریزاں ہو۔

حَصِرَ : بخل اختیار کیا۔

حَاصَرَ : محاصرہ کرنا، گھیر لینا۔

اَحْصَرَ : سفر جاری رکھنے سے روک دیا۔

ابن فارس کے نزدیک ح ص ر کے مادے میں تین معنی پائے جاتے ہیں۔ روک دینا، منع کرنا اور جمع کرنا، باہم ملا دینا۔

قرآن حکیم میں ہے:

اَوْ جَآءُوْکُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ یُّقَاتِلُوْکُمْ (النساء: ۹۰)

[یا تمھارے پاس اس طرح آتے ہیں کہ ان کے سینے اس سے تنگ ہو رہے ہیں]۔

یہاں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جن کے ساتھ جنگ جائز نہیں۔ یہ وہ ہیں جو اگرچہ پوری طرح مسلمان تو نہیں، تاہم وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ مسلمانوں سے برسرِ پیکار رہیں۔ کفار جب ان کو مسلمانوں کے مقابلے میں قتال کے لیے للکارتے ہیں تو وہ اپنے دلوں میں اس کو نہ صرف اچھا نہیں سمجھتے بلکہ اس بارے میں ایک طرح کی تنگی محسوس کرتے ہیں :

قرآن حکیم میں ہے :

وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ (التوبہ : ۵)

[اور انھیں پکڑو، باندھو اور ہر گھات کے موقع پر ان کی تاک میں بیٹھو]۔

غرض یہ ہے کہ جب کفار سے جنگ چھڑ ہی جائے تو پھر پوری طرح جنگی تدبیروں اور احتیاطوں کا خیال رکھو۔ " احصرو " کے یہاں لفظی معنی مراد نہیں کہ انھیں ضرور باندھا یا گھیرا ہی جائے۔ بلکہ یہ ہیں کہ ہر وہ تدبیر اختیار کرو جس سے کہ ان کے بھاگ نکلنے کے امکانات ختم ہو جائیں۔

قرآن حکیم میں ہے :

إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا (آل عمران ۳۹)

[اللہ آپ کو یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے جو کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور مقتدر ہوں گے اور ضبطِ نفس کرنے والے ہوں گے]۔

یہ خوش خبری حضرت یحییٰ کے تولد کے بارے میں ہے، جن کو نفس کی خواہشات و محرکات پر حد درجہ کا قابو حاصل ہوگا۔ جو قوم میں سیادت کے درجے پر فائز ہوں گے اور سابقہ تعلیمات کی تصدیق کریں گے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ○ (بنی اسرائیل : ۸)

[اور جہنم کو تو ہم نے کافروں کا قید خانہ بنا ہی رکھا ہے]۔

یہودیوں کے بارے میں ہے۔ ان کی بار بار کی عہد شکنیوں کے پیشِ نظر اس آیت میں

انھیں تنبیہ کی گئی ہے کہ یاد رکھو آخر کار تمہارا اوڑھنا بچھونا یا فرش جہنم ہے جو ایسے مقام سے عبارت ہے جو تم کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہو گا اور تمہارے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ یہاں کی اذیتوں سے پیچھا چھڑا سکو اور اپنی خوئے حیلہ سازی سے عذاب کی زد سے بچ جاؤ۔

ح ص ص

ح ص ص : سے مرکب الفاظ میں اصولاً اس میں تین معانی پائے جاتے ہیں۔ حصہ کسی شی کا وضوح و اظہار، یا کسی چیز کا جانا اور کم ہو جانا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے :

اَحْصَصْتُ الرَّجل : میں نے اس کو اس کا حصہ دے دیا۔

حَصْحَصَ الشئ : شے واضح شکل میں سامنے آگئی۔

قرآن حکیم میں ہے :

اَلْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ز (یوسف : ۵۱)

[اب تو سچی بات سب پر ظاہر ہو ہی چکی]۔

زلیخا نے اپنی پاک بازی ثابت کرنے کے لیے جب تمام حربے آزما لیے اور دیکھ لیا کہ سب کی سب شہادتیں یوسف کی بے گناہی کا پکار پکار کر اعلان کر رہی ہیں تو اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہی بنی۔ اور اس کے سوا اور چارا ہی کیا تھا۔ سچائی کھل کر سامنے آچکی تھی اور شک و اشتباہ کا تانا بانا بکھر چکا تھا۔ اس میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ باطل اور جھوٹ کی فطرت میں داخل ہے کہ آخر کار اس کی پول کھل جائے اور سچائی نکھر اور واضح ہو کر سامنے آجائے۔

اِنْحَصَّ الشَّعْرَ عَنْ رَاسِہٖ : اس کے سر کے بال گر گئے، کم ہو گئے۔

اَلْحُصُّ : دوڑنا، بھاگنا، بال مونڈنا۔

اَلْحُصُّ : زعفران۔

اَلْحُصَاصَ : خارش۔

اَلْاَحَصُّ ، جس کے سر کے بال کم ہوں۔ بغیر ابر کے شدید سردی کا دن۔ کہا جاتا ہے :

رَجُلٌ اَحَصُّ : منحوس اور گھٹیا انسان جس سے خیر کی توقع نہ ہو۔

ح ص ل

حَصَلَ : حاصل ہوا۔ بچ رہا۔ باقی رہا۔ کہا جاتا ہے :

حصل علیہ من حَقِّی کذا : اس کے ذمے میرا اتنا حق باقی رہ گیا۔

حَاصِلُ المَالِ : حساب کے بعد جو رقم بچ رہے۔

ھٰذا محصول الکلام : یہ حاصل کلام ہے۔

ما بفلان محصول ولا معقول : نہ اس کی اپنی کوئی رائے ہے، اور نہ فرق و تمیز کا کوئی سلیقہ۔

حَصَّلَ الْعِلم : تحصیلِ علم میں کوشاں ہوا۔

حَصَّلَ تُرَابَ المَعْدِنِ : کان سے سونا نکالا۔

حَصَّلَ الدقیق : چھان پھٹک کر آٹا نکالا۔

حَصِیْلَۃٌ : جو کچھ حاصل ہو۔ جمع حصائل۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ۝ (العادیات ، ۱۰)

[اور آشکارا ہو جائے گا جو کچھ دلوں میں ہے]۔

یہ آیت قیامت کے سیاق میں آئی ہے۔ یہ وہ دن ہو گا جب قلب و ذہن کی گہرائیاں اپنے اندر مخفی اور چھپے ہوئے راز آشکار کر دیں گی۔ جب ہمارے اعمال اور ان کے محرکات نکھر کر ہمارے سامنے آجائیں گے اور ہم صاف صاف معلوم کر لیں گے کہ ہم نے دنیا میں جو کیا دھرا، اس کی تہہ میں نفاق، ریاکاری اور غلط اندیشی کے کون کون عوامل کارفرما تھے۔ یہاں تو ہر انسان دوہری شخصیت کا حامل ہے، ایک وہ جس کو ہم نے تہذیب و شائستگی کے دبیز پردوں میں چھپا رکھا ہے اور دوسرا وہ جو حقیقی انسان ہے۔ قیامت کے روز تفریق کی یہ نوعیت ختم ہو جائے گی اور انسان اپنے اصل روپ میں ظاہر ہو جائے گا۔

یہاں "حصل ما فی الصدور" کا جملہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ قیامت کے روز جو کچھ ہماری چشم بصیرت کے سامنے آئے گا، وہ بعینہٖ وہی ہو گا جو ہمارے قلب و ذہن کی

سطح پر ہر آن ثبت ہوتا رہتا ہے یعنی ہمارا دل یا ذہن ایک کمپیوٹر ہے جس میں ہمارے فکر وعمل اور خواہش و آرزو کی تمام تر جنبشیں برابر مرتسم ہوتی رہتی ہیں اور قیامت کے دن یہ جنبشیں اور کروٹیں منظم شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دی جائیں گی ۔

ح ص ن

حِصْنٌ جمع حُصُونٌ : قلعہ یا ایسی جگہ جو دشمن کے حملوں سے محفوظ ہو، گھوڑے اور ہتھیار کو بھی حصن کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں دشمن کے حملوں سے محفوظ رہنے میں مدد دیتے ہیں۔

عبید بن الحسن سے ایک شخص نے کہا: اِنَّ ابی اوصٰی بثلث مالہٖ للحصون میرے باپ نے وصیت کی ہے کہ اس کے مال میں سے ایک تہائی حصہ حصون پر خرچ کیا جائے۔ انھوں نے جواب میں کہا، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس سے گھوڑے خرید لو۔ تائید میں انھوں نے اسعر جعفی کا یہ مصرع پیش کیا: ع

ان الحصون خیل لا مدد القریٰ ۔

قلعے دراصل گھوڑے ہیں، شہروں کو مٹی سے بنانا اور تعمیر کرنا نہیں ۔

علامہ راغب سے یہاں سہو ہوا ہے، انھوں نے "مدر" کے بجائے "مدن" کا لفظ استعمال کیا ہے جو یقیناً صحیح نہیں ۔

حَصُنَتِ المرأۃ : عورت پاک دامن ہوئی ۔

حَصَّنَ المکان : مضبوط مکان بنایا ۔

اَحْصَنَ المرأۃ : عورت سے شادی کرلی ۔

اِمْرَأَۃٌ مُحْصَنَۃٌ : شادی شدہ عورت ۔

اَلْحَاصِنُ ۔ وَالْحَاصِنَۃُ : پاک دامن یا شادی شدہ عورت ۔

اَلْحَصَانُ : موتی ۔ پاکباز عورت ۔

اَلْحِصَانُ : اصیل گھوڑا ۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا۔ (الانبیا: ۹۱)

[اور ان بی بی کا بھی ذکر کیجیے جنھوں نے اپنے ناموس کو بچا لیا۔ پھر ہم نے ان میں اپنی روح پھونک دی]۔

غرض حضرت مریم کی پاک بازی کا اظہار کرنا ہے جن کو یہودیوں نے موردِ الزام ٹھہرا رکھا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت مسیح کی پیدائش معمول کے مطابق نہیں ہوئی۔ مگر یہ کہنا کہ یہ قوانینِ فطرت کے خلاف ہے، اس لیے صحیح نہیں کہ قانونِ فطرت کی پنہائیوں کو کس نے جانا ہے۔ ابھی کئی راز ایسے ہیں جن پر سے پردہ نہیں اٹھا۔

"من روحنا" سے مراد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی روح نے مسیح کے جسم میں حلول فرمایا۔ یہ اضافت محض حضرت مسیح کی جلالتِ قدر کو ظاہر کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ط (النساء: ۲۵)

[پھر جب کنیزیں قیدِ نکاح میں آجائیں اور پھر اگر بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان کے لیے اسی سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں کے لیے ہے]۔

اسلام میں پاک بازی کا تصور یہ ہے کہ مرد اور عورت اپنی جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے نکاح کی پابندیوں کو قبول کریں۔ کیونکہ یہی وہ طریق ہے جس سے عائلی زندگی کی خوشگواریاں جنم لیتی ہیں اور اولاد بہتر اور پاکیزہ ماحول سے بہرہ مند ہو سکتی ہے۔

اس کی خلاف ورزی کھلی بے حیائی ہے۔ قرآن حکیم کی اس آیت میں اس مخصوص صورت حال کا ذکر ہے، جب کنیزیں قیدِ نکاح میں آجائیں اور پھر اس پاکیزہ تعلق کو داغ دار کرنے کی جسارت کریں۔ یہاں سوال یہ ابھرتا ہے کہ ان کو پوری پوری سزا دی جائے یا نصف۔ قرآن حکیم کا کہنا ہے کہ نصف۔ یعنی صرف پچاس درّے۔

کنیزوں سے اس خصوصی رعایت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نکاح سے پہلے یہ جس فضا میں رہتی رہیں اور کام کاج کے سلسلے میں غیر مردوں سے جس انداز سے ان کا میل جول رہا اس

سے ان میں حفظِ شرف اور صیانتِ ناموس کے رشتے اتنے مضبوط اور استوار نہیں رہ پائے جتنے کہ ایک آزاد اور شریف عورت میں رہتے ہیں۔ اس بنا پر یہ اس رعایت کی مستحق تھیں۔

سزا کی اس نوعیت سے اسلام کا عقوبت و سزا سے متعلق یہ فلسفہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے کہ سزا تجویز کرتے وقت صرف جرم کو نہ دیکھا جائے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مجرم کی نفسیاتی حالت اور تربیتی مجبوریوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ یہ ہے وہ سنہری اصول جس پر دنیا کی مہذب قومیں عمل پیرا ہیں۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ　(النساء، ۲۵)

[اور ان کے مہران کو دے دیا کرو مقرر کے موافق اس طرح کہ وہ قیدِ نکاح میں لائی جائیں نہ کہ مستی نکالنے والیاں ہوں]۔

غرض یہ ہے کہ باندیاں جب نکاح کر کے شریفانہ زندگی بسر کرنے کا عہد کر لیں تو انھیں کم تر اور حقیر جان کر مہر میں کمی نہ کرنا چاہیے۔ بعض فقہا نے یہ کہا ہے کہ مہر کی رقم ان کو ادا کرنے کے بجائے ان کے آقاؤں کو دی جائے۔ لیکن اس صورت میں آیت میں جو بالکل واضح ہے بعض الفاظ کو محذوف ماننا پڑے گا۔ علاوہ ازیں قرآن کا یہ مقصد ہے کہ باندیوں اور ان کے آقاؤں کو آمادہ کیا جائے کہ دونوں رشتۂ ازدواج کی اہمیتوں کو محسوس کریں۔ اس صورت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ شرفِ نکاح کے تقاضوں کو برقرار رکھا جائے۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ　(المائدہ: ۵)

[اور ان کی پارسا عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب مل چکی ہے]۔

اس آیت سے پہلے اس بات کا ذکر ہے کہ اہل کتاب کے ہاں کا ذبیحہ جانور کھانا جائز ہے۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اہل کتاب میں سے پاکیزہ خصال خواتین سے عقد نکاح بھی جائز ہے۔ پارسا یا پاکیزہ خصال خواتین کی قید شرطی ہے تشریعی نہیں، اور اس سے مقصود پارسائی اور پاکیزگیٔ کردار کی قدر و قیمت جتانا ہے، شرطِ نکاح گردانا نہیں۔ کیونکہ نفس نکاح

کے لیے خود مسلمان عورت کا بھی پارسا ہونا ضروری نہیں، چہ جائیکہ عورت عیسائی یا یہودی ہو۔

اسلام دراصل پوری نوعِ انسانی میں اتحاد و توافق چاہتا ہے۔ خصوصیت سے وہ لوگ جو اسلام کی بنیادی قدروں کو تسلیم کرتے ہیں یعنی توحید، نبوت اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، ان کو اسلام کے سجائے ہوئے دبستانِ تہذیب و ثقافت سے قریب تر کرنے کا خواہاں ہے، تاکہ ان کو موقع ملے کہ اسلام کی شمیم آرائیوں سے بہرہ مند ہو سکیں۔ جواز کی یہ نوعیت اگرچہ ابدی ہے، تاہم اگر فتنے کا خوف ہو تو اس پر پابندی بھی عائد کی جا سکتی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ (الحشر: ۲)

[اور خود ان کا خیال یہ تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ کی گرفت سے بچا لیں گے]۔

یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر کی طرف اشارہ ہے جو مدینہ کے گرد و نواح میں سدِّ مآرب کے تباہ ہو جانے کے بعد سے آباد چلا آرہا تھا اور اپنی حفاظت کے لیے اس نے ہر چند مضبوط اور مستحکم قلعے بھی تعمیر کر رکھے تھے۔ تاہم اپنی غداری اور سازش کی وجہ سے اس کو یہاں سے نہایت بے سر و سامانی کے ساتھ نکلنا پڑا۔ حالانکہ یہ اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ہماری دولت و ثروت، نخلستان اور قلعے ہمیں ہر آزمائش سے بچا لیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کا ہمہ گیر اور اٹل قانون یہ ہے کہ جو قومیں مادی اسباب و وسائل پر اترائیں اور اخلاق و کردار کے اہم اصولوں کو مٹا دینے کے درپے ہوں، ان کو سخت سزا دی جائے۔ چنانچہ آنحضرت نے ان کے کرتوتوں سے تنگ آکر بالآخر ان کا محاصرہ کیا اور حکم دیا کہ یہ یہاں سے نکل جائیں اور ان کو اپنے گھروں اور قلعوں کو چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔

ح ص ی

اَلْحَصٰی : کنکری اور سنگ ریزہ۔ کہا جاتا ہے:

هُمْ اَكْثَرُ مِنَ الْحَصٰی : وہ بہت تعداد میں ہیں۔ ان کی تعداد سنگریزوں سے بھی زیادہ ہے۔

فلان ذو حَصَاةٍ : وہ باوقار انسان ہے۔

مَالَهٗ حصاۃ ولا اَصاۃٌ : اس میں توازن اور سنجیدگی پائی نہیں جاتی۔

حَصَی الرَّجُلُ : اس نے کنکری پھینکی۔ کنکری سے مارا۔

حَصِیَتِ الارض : زمین کا بہت کنکریوں والی ہونا۔

حُصِیَ : اس کے مثانے میں پتھری پیدا ہو گئی۔

اَحْصٰی : گنا، شمار کیا، گھیر لیا یا استطاعت پائی۔ کہا جاتا ہے:

ھٰذٰ امر لا اُحْصِیہ : میں اس امر کی استطاعت نہیں رکھتا۔ میں اس کی تاب نہیں لا سکتا۔

حَصِیٌّ : زیرک، عقل مند۔ جو کسی شی کا صحیح اندازہ کر سکتا ہو۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَ اَحْصٰی کُلَّ شَیْ ءٍ عَدَدًا ٥ (الجن : ۲۸)

[اور ہر شی کو وہ شمار میں لیے ہوئے ہے]۔

غرض یہ ہے کہ اللہ کا علم کلی نہیں جیسا کہ معتزلہ سمجھتے تھے بلکہ کائنات کی ایک ایک جنبش اس کے دائرۂ علم میں ہے اور انبیا علیہم السلام کو وہ جب علوم و معارف سے نوازتا ہے تو اس میں بھی وہ تمام جزئیات آجاتے ہیں جن کا تعلق منصبِ نبوت اور انسان کی رشد و ہدایت سے ہے۔ ان کا علم ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا ط (النحل : ۱۸)

[اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنے لگو تو ان کا احاطہ نہ کر پاؤ گے]۔

اس کائنات کی حیثیت جو ہمارے گرد و پیش پھیلی ہے، نظم و ترتیب کی کرشمہ سازیوں نے اسے انسان کے لیے بے حد مفید اور کارآمد بنا دیا ہے۔ ہم نہ صرف اس میں رہتے ہیں بلکہ اس سے ہر لمحہ استفادہ بھی کر رہے ہیں۔ یہی نہیں خود ہماری زندگی، ہمارا شعور و ادراک ہمارا ذوق وجدان اور ہم میں خیر و شر کا ادراک و تمیز سب اللہ تعالیٰ کے واضح انعامات ہیں، جن کی قدر و قیمت کا ہم اندازہ کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ پھر یہ کیسی سرکشی اور تمرد ہے کہ ہم ان تمام انعامات کے پیدا کرنے والے کی عظمت و کرم کا اعتراف نہیں کرتے، اس کا

شکر بجا نہیں لاتے، اس سے محبت و تودّد کے رشتوں کو استوار نہیں کرتے اور جب طلب و استعانت کے داعیے ابھرتے ہیں تو اس منعم و محسن خدا کو چھوڑ کر دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو جاتے ہیں جن کا ہم پر کوئی احسان نہیں اور جن کا اس کائنات کی تخلیق و آفرینش میں کوئی حصہ نہیں۔

قرآن حکیم میں ہے :

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝ (الکہف : ۱۲)

[پھر ہم نے انھیں اٹھایا تاکہ ہم معلوم کریں کہ ان دونوں گروہوں میں اس حالت میں رہنے کی مدت سے کون زیادہ واقف ہے۔ (یعنی اس مدت کا کون زیادہ اندازہ کر سکتا ہے، یا اس عرصے کو ٹھیک ٹھیک کون شمار کر سکتا ہے)]۔

یہ ایک گروہ کا تذکرہ ہے جنھیں اصحابِ کہف کہا جاتا ہے، جس پر ان کے عقائد کی بنیاد پر ہر حکومت نے ظلم ڈھائے اور اس طرح وہ مجبور ہو گئے کہ کسی غار میں پناہ گزین ہو جائیں۔ جوں ہی یہ غار میں آ کر ٹھہرے ان پر خلافِ عادت تنویمی کیفیت طاری ہو گئی، جس کی وجہ سے یہ تین سو سال تک سوئے رہے۔ پھر جب یہ اچانک معجزانہ طور سے جاگے تو ان میں یہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا کہ کتنا عرصہ ہم اس کیفیت میں مبتلا رہے۔

مؤرخین کا اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ کون لوگ تھے۔ کچھ لوگ انھیں یہودی ٹھہراتے ہیں اور کچھ نصاریٰ۔ اوّل الذکر رائے زیادہ صائب معلوم ہوتی ہے۔ قرآن کا موضوع چونکہ تاریخی جزئیات کو بیان کرنا نہیں، اس لیے اس نے ان سے تعرض نہیں کیا۔ صرف اس حقیقت پر روشنی ڈالنے پر اکتفا کیا ہے کہ کوئی بھی قوم اگر اپنے عقائد پر جمی رہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تائید کے سامان مہیا کر دیتا ہے۔

اصحابِ کہف کے اس واقعہ میں بہ ظاہر یہ اشکال پنہاں ہے کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے کہ نیند یا خواب کی وسعتیں تین سو سال تک پھیل جائیں اور اس عرصے میں ان انسانوں کا سارا میکانزم بے کار ہو کر رہ جائے۔ نہ بھوک ان کو ستائے، نہ پیاس کی شدتیں ان کی زندگی پر اثر انداز ہوں۔ نہ مٹی ان کو کھائے، نہ حشرات الارض ان پر حملہ آور ہوں اور نہ موسم کا تغیّر و تبدل ہی ان کی صحتِ جسمانی کو گزند پہنچائے۔ اس سے بھی زیادہ سنگین اعتراض یہ ہے کہ آیا یہ بات

قرینِ قیاس ہے کہ چند لوگوں کو زندہ رکھنے کے لیے تین سو سال تک فطرت کا پورا نظام بدل جائے یا معطل ہو کر رہ جائے۔ اس اشکال سے عہدہ برآ ہونے کی کئی صورتیں ہیں:

۱۔ اس واقعہ کا تعلق سراسر دائرۂ اعجاز سے ہے اور اس دائرہ میں امکان و عدم امکان کی تفریق کا سوال ہی کہاں ابھرتا ہے، کیونکہ امکانات کا وجود بہر حال قوانینِ فطرت کا رہینِ منت ہے، اور اعجاز اس ذات کا کرشمہ ہے جس نے ان قوانین کی تخلیق کی ہے اور وہ ذات قطعی اس بات پر قادر ہے کہ ان قوانین کے پہلو بہ پہلو ایسے قوانین کی تخلیق بھی کرے جو ان کو باطل یا معطل کیے بغیر اپنا عمل جاری رکھیں اور ان خوارق و معجزات کو جنم دیں جو ہماری عقل و خرد کے حلقۂ اثر سے باہر ہوں۔ اس اشکال کا یہ جواب ایسا ہے، جو سیدھا سادا اور ایمان افروز ہے۔

(۲) یہ سوال بھی اپنی جگہ فلسفیانہ اہمیت کا ہے کہ خواب و بیداری میں تفریق و اختلاف کا یہ عام تصور کس حد تک معروضیت کا حامل ہے۔ ممکن ہے ہماری یہ پوری زندگی ہی ایک طویل خواب ہو۔ ایک چینی فلسفی کا یہ قصہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ اس نے اپنے آپ کو خواب میں جب تتلی کی شکل میں اڑتے اور پھدکتے ہوئے دیکھا تو اس وہم میں مبتلا ہو گیا کہ کیا میں فلسفی ہوں جو خواب میں تتلی کے روپ میں نمودار ہوا یا تتلی ہوں جو فلسفی کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ یہ تو تشکیک کی ایک صورت تھی۔ اس صوفی کا اذعان ملاحظہ ہو، جس نے زندگی کی حقیقت کو ان چند لفظوں میں بیان کر دیا:

الناس نیامٌ اذا ماتوا انتبھوا۔

انسان خوابیدہ ہیں۔ ان کی آنکھ اس وقت کھلے گی جب یہ مریں گے، یعنی موت زندگی ہے اور زندگی خواب۔

(۳) پھر نفسِ خواب میں کیا قوانینِ فطرت کا وقتی تعطل نہیں ہوتا۔ بظاہر ایک ہی نظامِ ترکیبی کے باوجود یعنی جب وہی معدہ ہے، وہی اعصاب ہیں، وہی جگر اور ذہن و قلب ہے اور وہی ان اعضا کے وظائف ہیں تو ایسا کیوں ہوتا ہے کہ آدمی جب سو جاتا ہے تو اس پر بھوک پیاس اور سردی یا گرمی کے قدرتی اثرات مترتب نہیں ہو پاتے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ خود انسان کے میکانزم میں دو قوانین بیک وقت اور پہلو بہ پہلو کار فرما ہیں۔ ایک وہ جن کا اندازہ ہم اس کی ترکیب و ساخت سے کر پاتے ہیں اور دوسرا وہ جن کی عضویاتی

طور پر کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

(۴) قرآنِ حکیم میں مذکورہ قصص کی دو قسمیں اہلِ علم نے بیان کی ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کی حیثیت تاریخی ہے۔ قرآنِ حکیم نے ان قصص کو اس وجہ سے بیان کیا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے ان میں تحریف کرکے اس تحریف کی بنا پر ان سے غلط نتائج اخذ کر رکھے تھے، قرآنِ حکیم نے ان قصص کو بغرض تصحیح پیش کیا اور بتایا کہ یہ ہیں اصل حقائق جن کو یہودی اور عیسائی علما نے کچھ کا کچھ کر دیا۔

قصص کی دوسری قسم وہ ہے جن کا تاریخی ہونا ضروری نہیں۔ ان کو قرآن نے محض اس بنا پر بیان کیا کہ ان میں ایک معنیٰ، ایک اخلاقی درس یا حکمت و دانش کے ایسے جواہر ریزے پائے جاتے ہیں جو عبرت و اعتبار کے دواعی کو ابھارنے والے ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ یہ قصہ بھی اسی قبیل کا ہو۔

تعبیر و تشریح کی یہی چار صورتیں ہیں جن سے معجزے کی اس خاص نوعیت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ان میں کیا صحیح ہے کیا غلط ہے۔ اس امر کا فیصلہ کرنا ہر شخص کے اپنے ذوق، مزاج، سطحِ علم اور مطالعہ سے ہے۔

ح ض ر

حَضَرَ : موجود ہوا، حاضر ہوا، آیا، پہنچا۔

حَضَرَ الْمَجْلِسَ : مجلس میں حاضر ہوا۔

حَضَرَتِ الموت : موت کا وقت آ پہنچا۔

حُضِرَ : موت واقع ہو گئی۔

حَضَارَۃ : شہری زندگی اختیار کرنا، شہر میں اقامت کرنا۔ آج کل تہذیب و ثقافت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

حَاضَرَ : ساتھ دوڑنا، مقابلہ کرنا، اپنی سمجھ کے مطابق جواب دینا، آج کل لیکچر دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تَحَضَّرَ : مہذب ہونا، شہری جیسا ہونا۔

تَحَضَّرَ الْغَمُّ : اسے غم لاحق ہوگیا۔

اَلْحَضَرَةُ : موجودگی، پہلو، نزدیکی، مکان کے سامنے کا صحن۔ وہ بڑا شخص جس کے پاس اکثر لوگ آجائیں۔

اَلْحَاضِر : شہری، موجود، تیار۔ کہا جاتا ہے:

حَضَرَنی فلان۔ فلاں شخص میرے پاس آیا۔

ھو من حاضری البلد : وہ شہر میں رہنے والا ہے۔

ھُوَ حَضَرِیٌّ : وہ شہری ہے، اس پر شہریت کا رنگ غالب ہے۔

حَضْرَمَ فی کلامہ : م زائد ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی بات سمجھا نہ سکا۔

حَضَرَتِ الامرَ بخیرٍ : میں نے اس معاملے میں صحیح رائے سوچی۔

ھُوَ حَاضِرُ الجواب : وہ فوراً جواب دینے والا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ لا (البقرہ : ۱۳۳)

[بھلا اس وقت تم موجود تھے جب یعقوب پر موت آپہنچی]۔

تخاطب یہودیوں سے ہے کہ تم خواہ مخواہ اسلام کے نام سے چراغ پا ہوتے ہو۔ یہ تو بعینہٖ وہی دین ہے جس کی پیروی کی یعقوب نے مرتے وقت وصیت کی تھی۔

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ط (النساء : ۱۲۸)

[اور طبیعتوں میں تو بخل ہوتا ہی ہے]۔

یہاں مضمون یہ بیان ہوا ہے کہ میاں بیوی میں اختلاف دراصل اس بخل کی بنا پر ہوتا ہے کہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو اس کے جائز حقوق دینے پر آمادہ نہیں ہوتے اور اگر ان میں سے ایک فریق حقوق کے بجائے احسان اور ایثار سے کام لے، تو مصالحت عین ممکن ہے۔

یہاں لفظ اُحْضِرَتْ بصیغہ مجہول اس بنا پر استعمال ہوا کہ اصل فطرتِ انسانی میں تو بخل ایسی کوئی برائی پائی نہیں جاتی۔ البتہ مناسب تعلیم وتربیت کے فقدان سے، حفظِ نفس

اور حفظِ حقوق کا جو جذبہ انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے، وہ بسا اوقات بخل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

یعنی اس طرح بخل کو نفس کی گہرائیوں میں داخل کیا جاتا، یا لے آیا جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً حَاضِرَةً (البقرہ: ۲۸۲)

[بجز اس کے کوئی سودا دست بدست ہو]

یہاں "حاضرہ" سے مراد، موجود یا دست بدست ہے۔

معاملت کے بارے میں قرآن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ تحریری ہونی چاہیے، اِلّا یہ کہ معاملت دست گرداں ہو۔ اس صورت میں نزاع و اختلاف کا عموماً احتمال نہیں ابھرتا۔ لیکن اس کے برعکس اگر معاملت اس نوعیت کی ہے کہ اس میں آئندہ چل کر جھگڑا پیدا ہو سکتا ہے تو تقاضائے احتیاط یہ ہے کہ اس کو بھی قلم بند کر لیا جائے۔ بعض فقہا نے اس کی تائید کی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۖ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ۝ (القمر: ۲۸)

[اور خبر دے دینا کہ پانی ان کے درمیان بانٹ دیا گیا ہے۔ ہر ایک باری پہ باری والا حاضر ہوا رہے]۔

حضرت صالح اور ان کی قوم ثمود کا تذکرہ ہے کہ یہ اپنی اونٹنی جو وہ بطور آزمائش و اعجاز تمھارے ہاں بھیج رہے ہیں، اس کو باری پر پانی ملنا چاہیے۔

ح ض ض

حَضَّ: آمادہ کیا، برانگیختہ کیا، اکسایا، ترغیب دی۔

حَضَّہٗ علی الخیر: اس کو نیکی پر آمادہ کیا۔ نیکی کی ترغیب دی۔

اَلْحَضْحَضُ: کوئی شی — کہا جاتا ہے۔

مَالَہٗ حَضْحَضٌ وَلَا بَضْبَضٌ: اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں ہے۔

اَلْحضیضُ : قعرِ زمین، زمین کا نشیب، دامن کوہ ۔ کہا جاتا ہے :

تَرَکَہٗ فی الْحَضِیْضِ : اس کو قعرِ زمین پر چھوڑ دیا ۔

قرآن حکیم میں ہے :

اِنَّہٗ کَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ ۙ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ؕ (الحاقہ ۳۳، ۳۴)

[اس کا نہ ایمان ہی خدائے بزرگ پر تھا اور نہ یہ غریب آدمی کے کھانے کی ترغیب دیتا تھا] ۔

اہلِ جہنم کا ذکر ہے، انھیں اس سزا کا سامنا کرتے وقت سخت افسوس لاحق ہوگا، اور اپنے کیے دھرے پر یہ اس وقت نادم ہوں گے جب اظہارِ ندامت سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ۔ اگر یہ دنیا میں ربِ برتر پر یقین رکھتے اور انسان دوستی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر غریب اور مسکین کی طرف دستِ تعاون بڑھاتے تو ان کو یہ انجام بد نہ دیکھنا پڑتا ۔

اس آیت میں یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ نجاتِ اُخروی کے لیے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو یکساں ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔

یہاں اس نکتے کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اگر صرف ترغیب سے حقوق العباد پورے نہ ہوتے ہوں اور اجتماعی انحطاط اس حد تک پہنچ گیا ہو کہ اخلاقی اپیل لوگوں کو اس حد تک متاثر نہ کر سکے کہ معاشرے میں غربت و افلاس کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قلع قمع ہو جائے تو اس صورت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ معاشرہ دولت کی تقسیم اس انداز سے کرے کہ جس کی وجہ سے اسلامی اقدار، اخوت، مساوات اور عدل بوجہ احسن ایک نظام اور سسٹم کی شکل میں ڈھل جائیں اور ہر شخص کو وہ تمام حقوق آپ سے آپ حاصل ہو جائیں جو فطرت اور اسلام نے بنی نوع انسان کو بخشے ہیں اور بار بار قرآن حکیم نے جن کو پورا کرنے کی تلقین کی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اس بات کی مقتضی ہے کہ کوئی بھی شخص دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا کر انسانی شرف وعظمت کی تذلیل کا باعث نہ بنے ۔

ح ط ب

حَطَبَ : لکڑی چننا، حَطَبَ بِہٖ : چغلی کھانا، الزام تراشی کرنا ۔

حَطِبَ : کمزور ہونا ، لاغر ہونا ، کانٹا۔ کہا جاتا ہے :

حَطِبَ عِنَبَہٗ : اس نے انگور کی شاخیں کاٹیں۔

اَلْحَطَبُ : ایندھن۔

اَلْحَاطِبُ : لکڑیاں چننے والا۔ کہا جاتا ہے۔

ھُوَ حَاطِبُ لَیْلٍ : وہ جو بات چیت میں رطب و یابس ملانے والا ہو، غیر محتاط۔ ایسا آدمی جو رات کو ادھر ادھر سے لکڑیاں جمع کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ لکڑیوں کے علاوہ ان میں اور کیا کیا چیزیں آگئی ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَکَانُوْا لِجَھَنَّمَ حَطَبًا ۙ (الجن : ۱۵)

[اور رہے وہ جو بے راہ ہیں تو وہ دوزخ کے ایندھن ہیں]۔

جنات نے یہاں دو قسم کے لوگوں کا ذکر کیا ہے، ایک وہ جنھوں نے اسلام کی سچائیوں کے آگے سر تسلیم خم کیا اور حلقۂ اسلامیان میں داخل ہو گئے۔ یہ ہر نوع کے خدشہ و خوف سے آزاد ہو گئے۔ دوسرے وہ جو راہِ حق سے ہٹ گئے اور انھوں نے گمراہی اختیار کر لی۔ ان کا مقدر جہنم کا ایندھن بننا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَّ امْرَاَتُہٗ ؕ حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ ۚ (اللہب : ۴)

[اور اس کی بیوی بھی لکڑیاں لاد کر لانے والی]۔

ابولہب کی بیوی ام جمیل کے بارے میں ہے کہ جہاں ابولہب کی تباہی و ہلاکت یقینی ہے وہاں اس کی بیوی بھی اس میں برابر کی شریک ہو گی۔ "حمالۃ الحطب" لفظی اور مجازی دونوں معنوں میں صحیح ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ جنگل سے خار دار لکڑیاں جمع کر کے لاتی اور آنحضرتؐ کی راہ میں بچھا دیتی تاکہ یہ کانٹے آنحضرت کے پائے اقدس میں چبھیں اور ان کے لیے اذیت کا باعث ہوں۔ "حمالۃ الحطب" کنایۃً اس عورت کو بھی کہتے ہیں جو چغلی کھائے اور لگائی بجھائی کرے۔ اور ام جمیل کی یہ عادت تھی کہ مسلمانوں کی باتیں مشرکین

مکہ تک پہنچاتی اور ان کو اسلام دشمنی پر اکساتی اور مسلمانوں میں ایسی جھوٹی خبریں پھیلاتی جن سے ان میں اختلاف پیدا ہو۔

ح ط ط

حَطَّ : اتارنا، بوجھ ہلکا کرنا۔ بھاؤ کا کم ہو جانا، سستا ہونا۔ کہا جاتا ہے :

حَطَّ السِّعْرُ : بھاؤ کم ہو گیا، گر گیا۔

حَطَّ اللّٰہ اوزارھم : اللہ نے ان کے گناہ معاف کر دیے یعنی گناہوں کے بوجھ کو ہلکا کر دیا۔

حَطَّ فلان فی عِرض فلان : فلاں شخص نے فلاں کی بے آبروئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

اَکَلَ من حلوائھم فانحط فی اھوائھم : اس نے ان کے ہاں مٹھائی کھائی اور نتیجے میں ان کی خواہشات کے جال میں آگرا۔

وَ اتانا بطعامٍ فحَطَطنا فیہ : وہ ہمارے لیے کھانا لایا اور ہم اس پر ٹوٹ پڑے۔

اِنحَطَّ : اترنا۔

اَلحَطِیۃُ : قیمت کی کمی۔ کہا جاتا ہے :

طلب منہ الحُطیطۃ فابی : اس نے قیمت کم کرنے کو کہا، لیکن وہ نہ مانا۔

اَلحِطَّۃُ : طلبِ مغفرت، توبہ۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَ قُوۡلُوۡا حِطَّۃٌ نَّغۡفِرۡ لَکُمۡ خَطٰیٰکُمۡ ؕ (البقرہ : ۵۸)

[اور کہتے جاؤ توبہ ہے، ہم تمھاری خطائیں بخش دیں گے]۔

بنی اسرائیل کو طویل دشت نوردی کے بعد جب ان کی خواہش و آرزو کے تحت اریحا کے شہر میں داخل ہونے کی اجازت دی گئی تو حضرت موسیٰ نے ازراہِ نصیحت کہا کہ اس شہر میں آباد ہونے کے بعد پہلے کی طرح سرکشی و نافرمانی کی زندگی بسر نہ کرنا بلکہ ہمیشہ شکرو مغفرت اور انابت و توبہ کا شیوہ اختیار کر کے رہنا تاکہ شہری زندگی کا آغاز تمھاری دنیاوی و روحانی کامرانیوں کا آئینہ دار بن سکے۔

"حِطَّۃٌ" عربی لفظ ہے اور بنی اسرائیل کی زبان عبرانی تھی۔ معلوم ہوتا ہے عبرانی کا جو لفظ اس وقت بولا گیا اس کے معنی عربی میں توبہ و انابت کے اظہار ہی کے ہوں گے، غرض یہ نہیں کہ تم بعینہٖ یہ لفظ دہراتے ہوئے شہر میں داخل ہو، بلکہ یہ ہے کہ شہر میں داخلے کے وقت تمہاری زبان پر بخشش و انابت اور توبہ و استغفار کے کلمات جاری ہوں۔

ح ط م

حَطِمَ : توڑ ڈالا، چورا چورا کر دیا۔ بڑی عمر والا ہو گیا۔ کہا جاتا ہے :

حطمت فلانۃ زوجھا : اس کا شوہر بوڑھا ہو گیا یا اس کے شوہر کی عمر اس سے کہیں زیادہ ہو گئی۔

حَطَم فلان قومہ : اپنے قبیلے یا قوم میں زیادہ عمر رسیدہ ہو گیا۔

رَجُلٌ حُطَمَۃٌ : زیادہ کھانے والا، سب کچھ چٹ کر جانے والا۔

اَلْحُطَمُ : سنگ دل چرواہا۔

اَلْحُطَّام : تیز و تند، شیر۔ کہا جاتا ہے :

ریح حطوم : تیز و تند ہوا۔

اَلْحُطَمَۃُ : تیز آگ، جہنم کی آگ۔

اِنْحَطَمَ : ٹوٹ گیا، چورا چورا ہو گیا۔

قرآن حکیم میں ہے :

اُدْخُلُوْا مَسٰکِنَکُمْ ج لَا یَحْطِمَنَّکُمْ سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُہٗ لا (النمل : ۱۸)

[اے چیونٹیو اپنے سوراخوں میں جا گھسو، کہیں سلیمان اور اس کا لشکر تمہیں روند نہ ڈالیں]۔

حضرت سلیمان کے عساکر جس وادی سے گزر رہے تھے، اس میں چیونٹیوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ جمع تھے۔ اسی مناسبت سے اسے وادی نمل کہا گیا۔ جس طرح ہماری ایک زبان ہے، اسی طرح چیونٹیوں کی بھی ایک زبان ہے، جس کی وجہ سے خطرات کو بھانپ کر وہ ایک دوسری سے رابطہ قائم رکھتی ہیں۔

خطرات کو پہلے سے بھانپ لینا، ان کی فطرت وجبلّت کا تقاضا ہے۔ چیونٹیاں جس طرح نظم وربط کی زندگی بسر کرتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جبلی صلاحیتیں خاصی بیدار ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ﴿الھمزہ : ۴﴾

[ہاں ہاں وہ ضرور توڑنے پھوڑنے والی آگ میں جھونکا جائے گا]۔

قریشِ مکہ کے دولت کے ان پجاریوں کا ذکر ہے جو شب و روز حصول زر کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں اور اقدارِ حیات سے بے پرواہو کر اپنے لیے امیدوں اور آرزوؤں کے قصر تعمیر کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ ایک طرف تو خود قلب و روح کی مسرتوں سے محروم رہتے ہیں۔ دوسرے بنی نوع انسان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے مرتکب ہوتے ہیں اور جائز و ناجائز کا خیال رکھے بغیر ساری دولت کو اپنے ہی دامنِ حرص و آز میں سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کا انجام یہ ہوگا کہ جہنم میں ڈالے جائیں گے اور اس طرح ان کی تمام آرزوئیں خاک میں مل جائیں گی اور کبر و رعونت کے تمام اصنام ریزہ ریزہ ہو کر رہ جائیں گے۔

ح ظ ر

حَظَرَ: کسی شے کو روک دینا۔ باڑے میں بند کرنا، بند کر دینا۔

اِحْتَظَرَ: باڑہ بنایا۔

اِحْتَظَرَ بِہٖ: وہ اس سے محفوظ ہو گیا۔ بچ گیا۔

اَلْحِظَر: گھاس پھونس، یا وہ شاخ جس سے باڑے کی تعمیر ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے:

جاءَ بِالْحَظِرِ الرَّطِبِ: اس نے سفید جھوٹ بولا، چغل خوری کی۔ ایسی الجھن میں پھنس گیا جس سے نکلنا دشوار ہو گیا۔

یُوْقِدُ فِی الْحَظِرِ: چغلی کھائی یا دو شخصوں میں عداوت کی آگ بھڑکائی۔

الحظیرۃ : ہر وہ شے جو دو چیزوں کے مابین حائل ہو۔ باڑہ - کہا جاتا ہے :

اِنَّہٗ لَنَکِدُہُ الحَظِیرَۃِ : وہ بخیل اور بے فیض شخص ہے۔

حظیرۃ القدس : تصوف کی ایک اصطلاح، جس کے معنی ایسے عالم بالا کے ہیں جہاں صرف مجردات اور ملائکہ کا بسیرا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ۝ (بنی اسرائیل : ۲۰)

[اور آپ کے پروردگار کی بخشش کسی پر بند نہیں]۔

اس سے قبل کی آیات میں دو قسم کے لوگوں کا ذکر آیا ہے، ایک وہ ہیں جنھوں نے دنیا کے عاجل اور اس کے مقتضیات کو زندگی کا ہدف و مقصود ٹھہرایا۔ انھیں بلاشبہ دنیا ملی، مگر روح و آخرت کے اعلیٰ لطائف سے یہ یکسر محروم رہے۔ دوسرے وہ جو دنیا کے ساتھ روح و آخرت کی تکمیل کے لیے بھی کوشاں رہے، انھیں بیک وقت دین و دنیا کی بلند تر کامرانیوں سے بہرہ مند ہونا ہے۔

یعنی اصل چیز یہ نہیں کہ کسی قوم یا شخص کو کھانے پینے اور رہنے سہنے کی سہولتوں یا قدرت کی دیگر فیاضیوں سے کتنا حصہ ملا ہے، کیونکہ یہ تو وہ نعمتیں ہیں جو تکوینی سطح پر سب کو حاصل ہیں۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی بخشش وعطا کی ارزانیوں سے کوئی بھی محروم نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ کسی ملت یا شخص کا زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر کس درجہ بلند اور وسیع تر ہے۔ کیا وہ زندگی کو صرف موت تک سمٹا ہوا سمجھتا ہے یا علیٰ وجہ البصیرت یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ موت وفنا محض ایک وقفہ ہے اور اس کے بعد زندگی کی جوئے رواں کو خلود وابدیت کے کناروں میں ایک خاص انداز سے جاری رہنا ہے۔ یہی نہیں اس کی تمام تر خوش خرامیوں اور کرب آفرینیوں کا تعلق عقیدہ، عمل، اقدار اور ان پیمانوں سے ہے، جن کے مطابق اس نے دنیا میں زندگی بسر کی۔

اس آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر کوئی قوم زندگی کی بنیادی نعمتوں سے بھی محروم ہے تو اس میں قصور اس پروردگارِ عالم کا نہیں جس نے کفر و اسلام کا امتیاز

روا رکھے بغیر ہر شخص کے لیے ان نعمتوں کو مہیا کر رکھا ہے بلکہ قصور استحصالی نظام کا ہے۔
قرآن حکیم کا ہے:
اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ (القمر: ۳۱)
[ہم نے ان پر ایک ہی نعرہ مسلط کیا۔ سو وہ ایسے ہو گئے جیسے کانٹوں کی باڑ لگانے والے کا چورا]۔

قوم صالح کا ذکر ہے جو اپنے دور میں خاصی شان و شکوہ کی حامل تھی، لیکن اس وجہ سے کہ اپنے عصر کے پیغمبر کی تکذیب کی اور ان عقائد و اصلاحات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، جن میں خود ان کا روحانی و مادی بھلا تھا، حرفِ غلط کی طرح مٹا دی گئی۔ عذاب کی نوعیت کچھ اس طرح کی تھی کہ آسمان سے ایک صاعقہ اور کڑکا فضا میں بلند ہوا اور آن کی آن میں قوم صالح کی بستیاں الٹ گئیں اور چورا چورا ہو گئیں۔

یہاں "کھشیم المحتظر" بطورِ تشبیہ کے آیا ہے، اس میں علم بلاغت کی رُو سے دو خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس پوری سورت میں حرف سجع کا جو التزام نظر آتا ہے وہ اس میں بھی بغیر کسی تکلف کے موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ تشبیہ ایسی ہے کہ جس کا عربوں روزمرہ زندگی سے گہرا ربط تھا اور وہ اس کو خوب جانتے بوجھتے تھے۔

ح ظ ظ

اَلْحَظُّ : حصہ، بہرہ، مقدر، نیک بختی، تمول۔ کہا جاتا ہے:

هُوَ ذُوحظ من العلم : وہ علم کے بارے میں خوش نصیب ہے، علم میں بہرۂ وافر کا مالک ہے، علم سے بہرہ ور ہے۔

هُوَ ذوحظ : وہ صاحبِ نصیب ہے، خوش قسمت ہے۔

لَهٗ فی المال حظ عظیم : وہ خاصہ مال دار ہے۔

حَظِیظٌ : خوش بخت۔

مَحْظُوظٌ : خوش نصیب، کامرانی سے بہرہ ور۔

قرآن حکیم میں ہے:

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ق لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ج (النسا: ۱۱)

اللہ تمھیں تمھاری اولاد کی میراث کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے]۔

اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت میں عورتوں کو معاشرے پر بار خیال کیا جاتا تھا، اس لیے حقوق نام کی کوئی چیز ان کے ہاں عورتوں کو حاصل نہ تھی۔ اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے عورت کو بدرجۂ غایت احترام کی نظر سے دیکھا اور اس کے لیے حقوق و فرائض کا ایک متوازن اور معتدل نقشہ تجویز کیا۔ اس نے نہ صرف معاشرے میں اس کو ایک مستقل اور باوقار حیثیت بخشی بلکہ حصولِ مال و تجارت کی آزادی بھی عطا کی اور ترکے میں بھی اس کا آدھا حصہ مقرر کیا۔

ترکے کی بحث میں دو باتوں کو خصوصیت سے ذہن میں رکھنا چاہیے۔

(۱) اسلام نے عورت کو اس کی حیاتیاتی نزاکتوں کے پیشِ نظر عائلی زندگی میں مصارف اور خرچ کی ذمے داریوں سے قطعی آزاد رکھا ہے۔

(۲) عورت کو چونکہ میکے اور سسرال دو خاندانوں کی رکنیت حاصل ہے، اس بنا پر اس کا حصہ بھی مرد کے مقابلے میں دوہرا ہے۔ یعنی میکے میں بھی وہ حصے دار ہے اور سسرال میں بھی۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ○ (حٰمٓ السجدہ: ۳۵)

[اور یہ بات انھی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، جو صبر کرتے رہتے ہیں اور اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہوتا ہے]۔

بُرائی کا جواب بُرائی سے اور شر کا شر سے دینا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ تو ہر کس و ناکس کا معمول ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ انسان بُرائی اور شر کا مقابلہ برداشت، نیکی اور حُسنِ سلوک سے کرے۔ قرآن کی رو سے یہ طرزِ فکر ہر شخص کے بس کی چیز نہیں، اس کا تعلق یکسر توفیقِ الٰہی کی ارزانیوں سے ہے اور بڑے ہی صاحب نصیب اس توفیق سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

ح ف د

حَفَدَ: کام میں تیزی دکھائی۔ کہا جاتا ہے:

حَفَدَ فی الامر : کام کو تیزی سے نمٹا دیا۔

حَفَدَ البَعِیر : اونٹ تیزی سے چلا۔

حَفَدَ : خدمت انجام دی ۔ کہا جاتا ہے :

حَفَدتَه' : تم نے اس کی خدمت انجام دی۔

رَجُلٌ مَحفُودٌ : محترم و مکرم۔

حَافِدٌ : خدمت گزار۔

حَفَدَةٌ : اعوان و انصار۔ پوتے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَدَةً (النحل : ۷۲)

[اور اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے تمھاری بیویاں بنائیں اور تمھارے لیے تمھاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے پیدا کیے]۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت ملاحظہ ہو جہاں اس نے مختلف انواع کی تخلیق کی، وہاں بقائے انواع کا بھی اہتمام کیا اور انسانوں میں میاں بیوی کے رشتے سے بیٹوں اور پوتوں کو پیدا کیا اور پھر تخلیق و تولید کا یہ صرف حیاتیاتی عمل ہی نہیں، اس کے ساتھ محبتوں اور شفقتوں کے دبستان بھی سجائے۔

قرآن حکیم نے یہاں عائلی زندگی کے اس پہلو کو بطور نعمت کے ذکر کیا ہے کہ تمھیں ہم نے چاہنے والی بیوی دی، خدمت گزار اور جان نچھاور کرنے والی اولاد عطا کی اور پھر کچھ ایسے خوش قسمت بھی ہیں جو پوتوں کی خدمت، محبت اور اخلاص سے بہرہ مند ہوئے۔

اسلام بنیادی طور پر عائلی زندگی کو پسند کرتا اور اسے اللہ تعالیٰ کا انعام قرار دیتا ہے۔ کیونکہ یہ صرف خاندانی اکائی ہی نہیں جس پر کہ نوع انسانی کی بقا کا انحصار ہے، بلکہ "خاندان" ایسا ادارہ ہے جہاں محبت و شفقت کے رشتوں کو استوار کیا جاتا ہے، جہاں رشتوں کے باقاعدہ احترام کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے اور بڑے بوڑھوں اور بزرگوں کے احترام و خدمت کی تربیت دی جاتی ہے۔ جو بچے خاندان میں تربیت نہیں پاتے، ان میں سنگ دلی، بے رحمی، حبِ ذات اور بسا اوقات احساس محرومی کا جذبہ زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے۔ خاندانی

تربیت کا یہ قانون جہاں انسانوں کے معاملے میں درست ہے وہاں حیوانات کے بارے میں بھی درست ہے۔ یہ بات تجربے سے ثابت ہوئی ہے کہ وہ حیوانات جو ریوڑ، گلے اور اپنے ہم جنسوں کے ہجوم میں نہیں رہ پاتے، اکثر تندخُو اور غیر مہذب ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے، اسلام عائلی زندگی کی برکتوں، نکہتوں کو قائم رکھنے کا حامی ہے۔

ح ف ر

حَفَرَ : کھودا، زمین کھودی، تہ تک کوئی چیز معلوم کی۔

حَفَرَ النہر : نہر کھودی۔

حَفَرَ العنز: بکری کو دبلا کرنا۔ ابو زید کا کہنا ہے: لو کانت العنز غزیرۃ لحفرھا ذٰلک۔ بکری اگر زیادہ دودھ دینے والی ہو، تو یہ بات اسے دُبلا کردیتی ہے، کیونکہ مالک اسے بار بار دوہنے کی زحمت دے گا۔

اَلْحَفَرُ : مٹی۔ کہا جاتا ہے:

کثر الحفر علی شط النہر : نہر کے کنارے بہت سی مٹی جمع ہوگئی ہے۔

اَلْحفیر : گڑھا، قبر۔

اَلْحَفَرُ : دانتوں کی زردی۔

اَلْحَافر : جانور کا گھر۔

اَلْحَافرۃ : کھدی ہوئی زمین۔ پہلی حالت۔ کہا جاتا ہے:

رجع فلان علی حافرتہ۔ بوڑھا ہوگیا، پہلی حالت پر لوٹ آیا، جہاں سے چلا تھا وہیں پہنچ گیا۔

قرآن حکیم میں ہے:

یَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَۃِ ؁ (النازعات : ۷۹)

[یہ کہتے ہیں کہ بھلا کیا ہم پھر واپس ہوگئے پہلی حالت کی طرف]۔

یہ دراصل حشر کے بارے میں مشرکینِ مکہ کے طنز و استعجاب کی حکایت ہے کہ موت کے

بعد جب ہماری ہڈیاں تک گل سڑ کر ختم ہو جائیں گی ہمیں دوبارہ زندہ ہونا ہوگا اور پھر دوبارہ شعور و زندگی کی حالت پر لوٹ آنا ہوگا۔

زندگی کے متعلق ہمیشہ سے دو خیال بنی نوعِ انسان میں رائج رہے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ترکیب عناصر کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ جہاں جسم کا شیرازہ بکھرا، زندگی اور شعور کا تانا بانا بھی خود بخود بکھر گیا۔ موت کے بعد کوئی زندگی، محاسبہ یا اگلا قدم نہیں۔ مشرکینِ مکہ اسی خیال کے حامی تھے۔ دوسرا خیال یہ رہا ہے کہ زندگی امتزاجِ عناصر سے تعبیر نہیں بلکہ امتزاجِ عناصر بجائے خود نتیجہ ہے جوششِ حیات کا، مصدرِ حیات کا، ایک ذاتِ حی کا جس نے اس پوری کائنات کو پیدا کیا، اور اس کو ایک خاص شکل سے متشکل کیا اور جب تک یہ جوششِ حیات اور زندگی کا یہ فیضان زندہ و قائم ہے، انسان، اس کا تشخص، اس کا شعور اور اس کی زندگی بھی قائم ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ نغمہ، یہ لے اور زندگی کی یہ کھنک، نے، ساز اور ارغنوں کی مرہونِ منت نہیں بلکہ الٹا یہ نغمہ اور زندگی کا تموج ہے، جس نے، نے، ساز اور ارغنوں کی تخلیق کی ہے۔

مادیت پرستوں نے زندگی و موت کو دو الگ الگ اور باہم متضاد خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے، حالانکہ منطقی طور پر یہ ایک سنگین غلطی ہے۔ موت وحیات ایک ہی تسلسل کی دو کڑیاں ہیں جو ہر وقت باہم مقترن اور موجود رہتی ہیں۔ نہ موت کے معنی کلیتہً مٹ جانے اور کتمِ عدم میں مستور ہو جانے کے ہیں اور نہ زندگی کا مطلب زندگی کے تمام پہلوؤں کا زندہ رہنا ہے۔ جسمِ انسانی جب زندہ ہوتا ہے تب بھی اس میں کروڑوں خلیے موت کے گھاٹ اترتے رہتے ہیں اور اپنی موت سے جسمِ انسانی کو زندہ رکھنے میں مدد دیتے رہتے ہیں۔ اسی طرح جب انسان مرجاتا ہے تو وہ مرٹ نہیں جاتا بلکہ اس سے اس کے ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام نے اخروی زندگی کی نشان دہی میں اس نقطۂ نظر کو اپنایا ہے کہ یہ دنیا اپنی تمام تر رعنائیوں کے باوجود ناقص، فانی اور گوناگوں تضادات سے گھری ہوئی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایک ایسی زندگی تسلیم کی جائے جو ہر اعتبار سے مکمل، ترقی پذیر اور ابدی ہو، جس میں ہر شخص کو اس کے عمل، ایمان اور صلاحیتوں کے مطابق صلہ ملے، جہاں ہر ظالم،

عاصی اور نافرمان کو اپنی سرکشی کی سزا ملے، اور کوئی رشوت، اثر و رسوخ اور دباؤ یا دھاندلی، انصاف و عدل کے تقاضوں کو مجروح نہ کر سکے — یہ دنیا تو اس لیے بنی تھی کہ خود انسان فکر و تدبر سے اس میں دائر و سائر تضادات کو دور کرے، اس کے نقص کو کمال و اتمام میں تبدیل کرے اور یہاں واقع ظلم و تعدی سے دامن کشاں رہ کر عدل و مساوات کے پھریرے لہرائے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو چاہیے تھا کہ وہ اس عالمِ رنگ و بُو میں جنت کی نکہتوں کو سمونے کی کوشش کرے۔ لیکن کمزور و فانی انسان ایسا نہ کر سکا۔ آخرت کا مفہوم یہ ہے کہ جو بات انسان نہیں کر سکا وہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم کر کے دکھائے گا۔ وہ ایسی زندگی کی تخلیق کرے گا جس میں تضادات نہ ہوں، جن میں فنا و نقص کے شائبے نہ پائے جائیں۔ جہاں عدل و انصاف کا پورا پورا چلن ہو، جہاں اس کے عفوِ عمیم اور رحمتِ بے پایاں کی فراوانیاں ہوں، جہاں اس کی صفات کی روشنی میں انسان اپنے سفرِ روحانی کا آغاز کر سکے اور ان حقائق و معارف تک رسائی حاصل کر کے جن کو دنیا میں عوائق و موانع کی وجہ سے نہیں پا سکا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جہاں حضرتِ حق کی جلوہ سامانیوں کو انسان بچشم خود دیکھ سکے۔

مسئلہ آخرت کو منطق کی تنگ دامانہ نظر سے سمجھنا مشکل ہے، ہاں اگر دل کی آنکھ کھلی ہو تو نہ صرف انسان فلسفۂ آخرت کو سمجھ سکتا ہے، بلکہ ان احوال و کیفیات کو یہاں رہ کر دیکھ اور محسوس بھی کر سکتا ہے جو وہاں پیش آنے والے ہیں۔

ح ف ظ

حَفِظَ : کسی شی کو خراب و خستہ ہونے سے بچانا، محفوظ کر لینا۔

حَفِظَ الکتاب : کتاب کو زبانی یاد کرنا۔

حَافَظَ علی الامر : کسی امر پر مداومت اختیار کرنا۔

حَافَظَ عنه : مدافعت کرنا۔

اِحْتَفَظَ غضب ناک ہونا۔

اَلْحِفظ یاد کرنا۔

اَلحُفُظَۃُ : اچھے جذبے کے لیے غیرت وحمیت یا غصہ وغضب۔ کہا جاتا ہے :

المقدرۃُ تُذْھب الحفظۃ : انتقام پر قدرت غضب وغصہ کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔

الحافظ : سیدھی راہ جو برابر منزل تک جائے اور کہیں منقطع نہ ہو۔ نگران، جسے قرآن زبانی یاد ہو۔ کہا جاتا ہے :

ھو عن الحفاظ : وہ حفاظ کرام میں سے ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ٥ (الحجر : ۹)

[اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں]۔

قرآن کا یہی اعجاز کیا کم ہے کہ وہ دنیا کی محفوظ ترین کتاب ہے، جس میں کا ایک شوشہ اور نقطے تک کی تبدیلی اب تک رونما نہیں ہوئی۔ مزید اعجاز یہ ہے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے اس کی محفوظیت کے بارے میں، بدعویٰ اکید یہ کہہ دیا جائے کہ اس کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے، ہم اس کو قیامت تک کے لیے ہر تحریف، تبدل اور تغیر سے بچائے رکھیں گے۔ جہاں یہ واقعہ نفس الامری اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں میں سے ہے، وہاں اس بات کا دعویٰ بھی بجائے خود اعجاز سے کم نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی کتاب کب تک دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہے گی۔

قرآن حکیم میں ہے :

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ (المائدہ : ۴۴)

[اس لیے کہ انھیں کتاب اللہ کی نگہداشت کا حکم دیا گیا تھا اور وہ اس کے گواہ تھے]۔

غرض یہ ہے کہ تورات ہی اللہ کی کتاب ہے جو صدیوں تک علمائے یہود میں بطور سند کے رہی، اسی کو اس کے مشائخ و احبار نے مانا اور اسی کو اپنا دستورِ حیات ٹھہرایا اور اسی کتاب کی نگرانی و نگہداشت کا انھیں حکم دیا گیا تھا۔ لیکن افسوس کہ یہودیوں نے اسی کتاب کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا۔

قرآن حکیم میں ہے :

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝ (الطارق : ۴)

[کوئی جان ایسی نہیں کہ اس پر نگران ایک فرشتہ مقرر نہ ہو]۔

غرض یہ ہے کہ جس طرح نجوم وکواکب کی ایک چال ہے اور اس کے لیے جذب و کشش کے نپے تلے قاعدے مقرر ہیں۔ اس طرح انسانی اعمال کی بھی ایک سمت اور طریق ہے جس کی فرشتے باقاعدہ نگرانی کرتے ہیں اور اگر عمل وعقیدہ میں کہیں انحراف رونما ہو تو اسے محفوظ کر لیتے ہیں۔

ح ف ف

حَفَّ : چھلکا اُتارنا، گھرانا، احاطہ کرنا، حلقہ باندھنا۔

حَفَّ القومُ الرجل : قوم نے اس کو گھیر لیا۔ اس کا احاطہ کر لیا۔

حَفَّفَ الرجل : مصیبت میں مبتلا ہونا۔

استحَفَّ المال : سارے کا سارا مال لے لیا۔

حِفَافٌ : نشان قدم۔ کہا جاتا ہے :

جاءَ علی حفافہٖ : وہ اپنے نقشِ قدم پر لوٹ آیا۔

مَحفوفٌ : گھرا ہوا۔ کہا جاتا ہے :

دخلت علیہ وھو محفوف بخدمہٖ : میں اس کے ہاں پہنچا تو وہ اپنے خدم وحشم میں گھرا ہوا تھا۔

حَفِیفٌ : سرسراہٹ۔ تیر یا سانپ کے گزرنے کی آواز۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (الزمر : ۷۵)

[اور آپ فرشتوں کو دیکھیں گے کہ حلقہ باندھے ہوں گے عرش کے گرداگرد]۔

قیامت کے روز جب اہلِ ایمان جنت کی شادمانیوں سے بہرہ مند ہو رہے ہوں گے تو اس وقت اس روح پرور نظارہ سے بھی دوچار ہوں گے کہ حضرتِ حق اپنے عرش اقتدار و تدبیر پر جلوہ کناں ہوں گے اور ملائکہ اس جلوہ گاہِ قدس کے گرداگرد حلقے باندھے اللہ تعالیٰ کی

تسبیح و تحمید میں مصروف ہوں گے۔

قرآن حکیم نے حقائقِ اُخروی کو بیان کرنے کے لیے جس اسلوب اظہار کو اختیار کیا ہے، اس میں مجازات و کنایات کی گنجائش بہرحال پائی جاتی ہے۔ الفاظ کی دلالتِ ظاہری سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ قرآنِ حکیم زبان کی تنگ دامانی کے باوجود کن حقائق و معارف کی نشان دہی کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ زبانیں ہماری روزمرہ کی حسی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے بنی ہیں۔ ان میں جب ماورائی حقائق کو بیان کیا جائے گا تو لامحالہ استعارہ و کنایہ یا رمز و مجازات سے مدد لینا پڑے گی۔ یعنی:

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس آیت میں جن حقائق کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے وہ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ گو تمیز و مکانیت کی منت پذیریوں سے آزاد ہے، تاہم اس کی تدبیراتِ کونی کا مرکز اور اس کی جلوہ سامانیوں کا ایک مقام ضرور متعین ہے جو عرش سے تعبیر ہے، نیز یہ کہ ملائکہ وہ باشعور قوتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکامِ کونیہ کی تکمیل و اتمام میں مصروف رہتی ہیں۔ تکمیل و اتمام کا یہی وظیفہ وہ حمد و ثنا ہے جو ان کا خاصا ہے۔

یہاں اہلِ جنت یہ منظر دیکھ پائیں گے کہ حضرتِ حق جلوہ فرما ہیں اور یہ کہ اس مرکزِ انوار و تجلیاتِ الٰہی کو ملائکہ نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ یہاں دیکھنے والوں کے لیے اس فرق کو ملحوظ رہنا چاہیے کہ محدود عرش ہے۔ وہ ذاتِ حق نہیں جس نے اس کو اپنا جلوہ گاہ ٹھہرایا ہے۔ یہ منظر کیسا راحت افزا ہوگا، اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اہلِ دل دل کی بستی میں اس کو کسی حد تک محسوس کر سکتے ہیں۔

ح ف (ی و)

حَفِيَ: ننگے پاؤں چلنا، زیادہ چلنے سے پاؤں یا گھر کا گھس جانا۔

حافٍ: ننگے پاؤں۔ کہا جاتا ہے:

ھو افضل من کل حافٍ وناعلٍ: وہ سب سے بہتر ہے، چاہے وہ جوتا پہنے

ہوئے ہو یا ننگے پاؤں چلنے والا ہو۔

اِحْتَفیٰ بِہٖ : اس کا بہت احترام کیا، اس کے ساتھ لطف و اکرام سے پیش آیا۔

حفاوۃ : عزت و تکریم۔

اَحْفیٰ شَارِبَہٗ : اس نے مونچھیں مونڈ ڈالیں۔

اَحْفیٰ فی السوال : سوال پر اصرار کرنا، الحاح سے کام لینا، چپک جانا۔

حَفِیٌّ : عالم، جاننے والا۔ تحقیق و تفحص سے کسی نتیجے پر پہنچ جانے والا۔

قرآن حکیم میں ہے :

یَسْئَلُوْنَکَ کَاَنَّکَ حَفِیٌّ عَنْہَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُہَا عِنْدَ اللّٰہِ (الاعراف : ۱۸۷)

[آپ سے دریافت کرتے بھی ہیں تو اس طرح کہ گویا آپ اس کی تحقیق کر چکے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے]۔

یہ دنیا ایک وقت ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گی اور اس کے بعد دوسری دنیا کی تعمیر کا آغاز ہوگا جو اس سے کہیں زیادہ مکمل، سکون آفرین اور انسان کے مضمرات فکری و عملی کے ارتقا کا مظہرِ اتم ہوگی یہ ایسا عقیدہ ہے جس کو تمام انبیا اور ذی شعور حکما نے پیش کیا ہے۔ غالب نے یہ شعر کہہ کر اسی شعور و آگہی کی ترجمانی کی ہے :

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

تمنا کا یہ دوسرا قدم اُخروی زندگی کی بہار آفرینیاں ہیں۔

چاہیے تو یہ تھا کہ منکرین زندگی کے اس حکیمانہ پہلو پر غور کرتے، الٹا کج بحثی سے اس بحث میں الجھ گئے کہ اچھا یہ بتائیے کہ یہ دور کب آنے والا ہے۔ گویا آنحضرت اس خاص مسئلے میں تحقیق کر چکے ہیں۔ قرآن حکیم نے اس شبہے کا ازالہ یہ کہہ کر کر دیا کہ جس خدائے برتر نے دنیا و آخرت کو پیدا کیا ہے، وہی خوب جانتا ہے کہ دنیا کب اختتام کو پہنچے گی اور آخرت کی صبح کب نمودار ہوگی۔ رسول کے فرائضِ منصبی میں ہر غیب پر مطلع ہونا داخل نہیں۔

ح ق ب

حَقِبَ العام : خشک سالی ہونا۔ سال میں بارش کا رُک جانا۔

حَقِبَ الامر : بات بگڑ گئی، معاملہ خراب ہوگیا۔

احتقب الاثم : گناہ کا مرتکب ہونا۔

اَلحُقُبُ : زمانہ، قرن۔ اسی سال یا اس سے زیادہ کا عرصہ۔ کہا جاتا ہے:

مضی علیہ حُقُبٌ وَ حِقبَۃٌ و احقابٌ : اس پر ایک عرصہ گزر گیا، ایک زمانہ بیت گیا۔

الحقبۃُ : تھیلا۔ وہ شی جو سوار گھوڑے پر اپنے پیچھے رکھے۔ وہ بیگ جس میں ضروریات کی اشیا رکھی ہوں۔ زادِ راہ۔ امرأالقیس کا کہنا ہے:

ع والبر خیر حقبۃ الرجل

نیکی بہترین زادِ راہ ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۙ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۚ (النبا : ۲۲، ۲۳)

[سرکشوں کا ٹھکانا ہے جس میں وہ قرنوں پڑے رہیں گے]۔

جہنم کے خلود و عدمِ خلود کے بارے میں قدما میں طویل بحثیں ہو چکی ہیں۔ معتزلہ اس بات کے قائل تھے کہ گناہ چاہے کتنا بڑا ہو، انسان چونکہ کمزور ہے اور اس کے اجتماعی و تہذیبی ماحول میں ایسی ترغیبات کثرت سے پائی جاتی ہیں، جس کی وجہ سے اس کا گناہوں سے آلودہ ہونا ہر آن ممکن ہے، اس لیے اس کو سزا دینا تو بلاشبہ قرینِ قیاس ہے، لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسے جہنم میں ڈال دینا اللہ تعالیٰ کے تقاضائے عدل کے منافی ہے۔ دنیا کی محدود اور خطرات سے گھری ہوئی زندگی میں ارتکابِ جرم بہرحال ایک محدود فعل ہے، لہٰذا اس کی سزا بھی محدود ہی ہونا چاہیے۔ غیر محدود نہیں۔

محدثین اور سلف بالعموم خلودِ جہنم کے قائل ہیں، ان کے دلائل نصوص قرآنی پر مبنی ہیں، ان کا یہ کہنا ہے کہ عدل وہ نہیں جسے ہم عدل قرار دیں۔ جب اللہ تعالیٰ جہنم کو ابدی قرار دیں تو یہی عدل ہے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے ہر حکم اور فیصلے کو مبنی بر عدل تصور کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس مسئلے میں اس اصول سے انحراف اختیار کریں۔ انسان کے پیمانۂ عدل اور اللہ تعالیٰ کے اسلوبِ عدل میں بڑا فرق ہے۔

ابن القیم جو کٹر سلفی ہیں اور سلفی ہونے کے ساتھ ساتھ دین کی گہری بصیرت بھی رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ خلود اور ابدیت کے الفاظ اس منطقی ابدیت و خلود کے مترادف نہیں، جس کے معنی دوام اور ہمیشگی کے ہیں، بلکہ مدتِ مدید پر بھی ان الفاظ کا اطلاق ہوتا ہے اور عربی ادب و لسان میں اس کے شواہد ملتے ہیں۔ قرآن کی اس آیت "احقاب" کا لفظ بہرحال کسی ایک معنی پر دلالت کناں نہیں۔ اس سے غیر معین عرصہ بھی مراد ہو سکتا ہے، اور خلود وابدیت بھی۔

ح ق ف

حَقَفَ : ہرن کا ریگ کے تودے میں بیٹھنا۔

حَقَفَ الشیٔ : کسی چیز کا ٹیڑھا ہو جانا۔

اَلْحِقْفُ : تودہ ریت۔ جمع احقاف، حقوف۔ حِقاف۔ کہا جاتا ہے:

فلان ساواہ الحقوف ۔ لا تظلہ السُّقُوف

فلاں شخص ریگستان میں رہتا ہے، مکان کی چھت اس پر سایہ افگن نہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ (احقاف : ۲۱)

[ان سے ذکر کیجیے قوم عاد کے بھائی کا جب کہ انھوں نے اپنی قوم کو ڈرایا ریگ کے تودوں کی بستی میں]۔

اخا عاد سے مراد حضرت ہود ہیں، انھیں قوم عاد کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا، جنھوں نے خدائے برحق کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ یہ قوم اپنے دور میں تہذیب و تمدن اور سطوت و اقتدار کی خاص سطح پر فائز تھی، ان کی بستیاں ریگ کے تودوں میں عمان سے یمن تک ۳ لاکھ مربع میل کے خطے میں پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت ہود نے انھیں آگاہ کیا کہ تمھاری مادی خوش علیشیاں تمھیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتیں۔ اللہ کا شکر ادا کرو اور مشرکانہ تہذیب و ثقافت کو خیر باد کہہ کر توحید کو اپناؤ۔ اللہ نہ صرف تمھارے گناہ معاف کر دے گا۔ بلکہ تمھیں بیش از بیش عزت و توقیر سے بھی نوازے گا۔ توبہ کرو اور تقویٰ و پاکیزگی کی زندگی بسر کرو۔

ح ق ق

اَلْحَقُّ : راستی ، یقینی ، انصاف ، ثابت شدہ حصہ ۔ وہ شی جو معروضی وجود کی حامل ہو ، قرینِ مصلحت و حکمت ۔ کہا جاتا ہے :

حَقَّ اللّٰہُ الْاَمْرَ : اللہ نے اس کو واجب ٹھہرایا ہے ، عنداللہ یہ ثابت ہے ۔

حَقَّقْتُ الامر : میں نے معاملے کی حقیقت جان لی ۔

حَقٌّ لکَ ان تفعل کذا : تمھیں چاہیے کہ تم یوں کرو ۔

وَ لَحَقٌّ لا اٰتیك : بخدا میں تمھارے ہاں نہیں آؤں گا ۔

اَلْحَقِیقَۃُ : وہ شی جس کی حمایت واجب ہو ، سچائی ، اصل شی ۔ کہا جاتا ہے :

ھُوَ حَامِی الْحَقَائِقِ : وہ ان اشیا کا نگران ہے جس کی حفاظت ضروری ہے ۔

اَلْحَقِیْقُ : سزاوار ، لائق ، مناسب ۔

اَلْحَاقَّۃُ : قیامت ، وقوع پذیر ہونے والی شے ۔

امام راغب نے لفظِ حق کو چار خانوں میں تقسیم کیا ہے :

اوّل :- وہ جو کائنات کا موجد و خلاق ہے ، جس نے کائنات کو حکمت و دانش کے تقاضوں کے عین مطابق پیدا کیا ہے ۔ قرآن حکیم میں ہے :

ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ ج (الانعام : ۱۰۲)

[یہ ہے اللہ تمھارا پروردگار] ۔

ثانی :- کائنات کو مقتضائے حکمت کے مطابق معروضی پیکر عطا کرنے والا ۔ قرآن حکیم میں ہے :

وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط (الانعام : ۷۳)

[اور وہ وہی جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو مقصد کے ساتھ] ۔

ثالث :- عقائد میں وہ امر حق اختیار کرنا جو فطرت و حکمت کے مطابق ہو ۔ قرآن حکیم میں ہے :

فَھَدَی اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ مِنَ الْحَقِّ (البقرہ ، ۲۱۳)

[پھر اللہ نے اپنے فضل سے انھیں جو ایمان والے تھے امر حق بنا دیا جس کے بارے میں وہ اختلاف رکھتے تھے

دالح : کوئی بھی قول و فعل جو وقت کے تقاضوں کے ہم آہنگ ہو، بروقت ہو، مناسب ہو اور بقدر ہو۔ قرآن حکیم میں ہے :

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (یونس: ۳۳)

[اسی طرح سرکشی کرنے والوں کے حق میں اس کے پروردگار کی بات پوری ہو چکی ہے]۔

غرض یہ ہے کہ جس طرح اسلام حق ہے، اس کی دعوت صحیح ہے، اسی طرح اس کی یہ تخویف بھی بجا ہے کہ انکار و سرکشی کرنے والے اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکیں گے اور یہی وجہ ہے کہ ماضی میں جس جس قوم نے حق و صداقت کے داعیوں کا انکار کیا، ان کے بارے میں کلمہ تخویف صحیح ثابت ہوا۔

ح ک م

حَكَمَ : دانا ہونا، صاحب بصیرت ہونا، دانش ور ہونا۔

اَحْكَمَ : استوار کیا، مضبوطی سے کیا، عقل مند بنا دیا، کسی برائی سے روک دیا، گھوڑے کے منہ میں لگام دینا۔ کہا جاتا ہے :

اَحْكَمَتْهُ التجارب : زندگی کے تجربوں نے اسے دانائی سکھا دی۔

اَحْكَمَ السفيه : بے وقوف انسان کو بے وقوفی کے ارتکاب سے روک دیا۔

تَحَكَّمَ : بغیر کسی عقلی وجہ کے حکم صادر کرنا یا فیصلہ صادر کرنا۔

اِحْتَكَمَ فی الامر : کسی معاملے میں کسی کو منصف مان لینا۔

تَحَاكَمَ : کسی سے اپنا فیصلہ چاہنا۔

اَلْحَكَمَةُ : لگام کا وہ حصہ جو گھوڑے کے جبڑوں کے قریب ہو۔

اَلْحُكْمُ : فیصلہ، رائے۔

اَلْحُكُومَةُ : ہیئت حاکمہ، گورنمنٹ۔

اَلْحَكَمُ : حکم جاری کرنے والا، فیصلہ کرنے والا، سرپنچ۔

اَلْحِكْمَةُ : دانائی، دانش، فکر و تدبر کا ایسا انداز جس میں دانش، استواری اور انسانی

خیر خواہی پائی جائے۔

الحکیم : اللہ کی صفت۔ یعنی ایسی ذات، جس کے تجلیاتِ قول وفعل میں کمال دانائی پائی جاتی ہے۔

مُحْکَمٌ : مضبوط، استوار، متعین اور فیصلہ کن۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ط (یوسف : ۲۲)

[اور جب وہ پختگی کو پہنچے، ہم نے انھیں حکم وعلم عطا فرمایا]۔

حضرت یوسف کے بارے میں ہے کہ ہم نے انھیں قوتِ فیصلہ اور اقتدار کی صلاحیتیں اس وقت بخشیں، جب وہ ذہنی وجسمانی اعتبار سے عمر کی اس منزل میں پہنچ چکے تھے جب خیالات وافکار میں پختگی آجاتی ہے۔ پختگی کی عمر کا تعین مشکل ہے۔ بہرحال یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جس میں جسم کی توانائیوں کے پہلو بہ پہلو عقل وتجربہ کے دائرے بھی نسبتاً وسیع ہو جائیں۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ○ (المائدہ : ۵۰)

[جو قوم یقین وایمان رکھتی ہے، اس کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کس کا ہو سکتا ہے]۔

یہود ونصاریٰ اور مشرکینِ مکہ سے خطاب ہے کہ اگر حق وباطل، توحید وشرک اور خیر وشر میں امتیاز کرنا مقصود ہے، تو پھر شریعتِ الٰہی کو کیوں تسلیم نہ کیا جائے۔ اللہ سے بڑھ کر فیصلہ میں اصابت، استواری اور سچائی کی پاسداری کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

قرآن حکیم میں ہے :

وَكُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ز (الانبیا : ۷۹)

[اور حکمت وعلم تو ہم نے ہر ایک کو دیا تھا]۔

اس سے قبل صورتِ حال یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک کھیت میں ایک فریق کی بکریاں رات کے وقت جا پڑیں، اس سے کھیت کو نقصان پہنچا، اس پر سوال یہ ابھرا کہ تلافی کی شکل کیا ہو۔ پہلے یہ مقدمہ حضرت داؤد کی عدالت میں پیش ہوا، آپ نے قانونِ رائج الوقت کے مطابق یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ کھیت والوں کو بطور تاوان کے دو بکریاں دے دی جائیں۔ بکری والے

اس فیصلے سے مطمئن نہ ہوئے۔ انھوں نے حضرت سلیمان سے رجوع کیا اور فیصلہ چاہا۔ آپ نے کہا فیصلہ یہ ہے کہ کھیت چند دنوں کے لیے ان لوگوں کو دے دیا جائے جن کے پاس بکریاں ہیں۔ یہ اس کھیت کی دیکھ بھال بھی کریں اور اس سے استفادہ بھی کریں، اور بکریاں کھیت والوں کو دے دی جائیں تاکہ وہ بھی ان کی دیکھ بھال کے فرائض ادا کرنے کے علاوہ ان کے دودھ کو بھی استعمال کر سکیں۔ پھر جب کھیت اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئے، تو کھیت کھیت والوں کو اور بکریاں بکری والوں کو لوٹا دی جائیں۔

اس فیصلے سے دونوں فریق مطمئن ہو گئے۔

قرآن حکیم نے ان دونوں فیصلوں کو تفہیم ایزدی قرار دیا ہے۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی ایک ہی معاملے کے حل و کشود کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔ دوسرے یہ کہ فریقین یا کسی ایک فریق کے عدمِ اطمینان کی صورت میں "مرافعہ" ہو سکتا ہے۔

یہاں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان کو جس حکمت، معاملہ فہمی اور بصیرت عطا کرنے کا تذکرہ ہے، یہ وہ شے ہے جو نفسِ نبوت سے جدا ہے۔ یہ وہ مزید انعام ہے جس سے ان دونوں کو نوازا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انبیا کو صرف کتابیں ہی نہیں دی جاتیں، فہم و بصیرت کا وہ ملکہ بھی عطا کیا جاتا ہے جس کے بل پر وہ احکام و مسائل کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ (الانعام، ۱۱۴)

[تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو میں حاکم تلاش کروں دراں حالیکہ اسی نے تمھارے پاس کتاب مفصل نازل کی ہے]۔

اس سے قبل کی آیات میں آخرت اور توحید کا ذکر ہے۔ مشرکینِ مکہ کا اصرار تھا کہ آنحضرت اصلاح و بہبود انسانی کے ان دو اصولوں سے دست بردار ہو جائیں۔ قرآن کی زبان سے ان سے کہہ دیا گیا کہ تم ہی بتاؤ کہ میں اس معاملے میں اللہ کے سوا اور کس کو حکم تسلیم کر دوں۔ تمھیں اور تمھارے ان پیشواؤں کو جو سراسر جھوٹے اور مکار ہیں یا اس اللہ کو جس نے ایسی کتاب نازل کی جو ان دونوں مسئلوں میں واضح اور مفصل ہے۔

یہاں اس نکتے کو ملحوظ رہنا چاہیے کہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں اس کے مفصل ہونے کا ذکر ہے، اس سے مراد فقہی و دینی مسائل و احکام میں تفصیل مراد نہیں، بلکہ اس سے مراد وہ تفصیل مراد ہے جس کا تعلق توحید، آخرت اور خیر و شر کے پیمانوں سے ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ط (النسا: ۱۱۳)

[اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور آپ کو وہ سکھا دیا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے]۔

حکمت کا لفظ قرآن میں متعدد بار آیا ہے، اس کے معنی ایسی استوار اور محکم رائے کے بھی ہیں جو دین کی روح کے عین مطابق ہو، معاملہ فہمی اور عام سمجھ بوجھ کے بھی ہیں، جس کے ذریعے مسائل کے حل و کشود میں خصوصیت سے مدد ملتی ہے اور اس حکیمانہ طریق افہام و تفہیم کے بھی ہیں جس میں مخاطب کی نفسیات اور ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر اسلامی حقائق کو پیش کیا جائے۔

یہاں حکمت کے معنی ایک خاص سلیقۂ فہم و ادراک کے ہیں جس کے بل پر آنحضرتؐ نے قرآن حکیم کی آیات سے یا تائیدِ وحی سے زندگی کے ایک مکمل نظام کی نشان دہی کی۔ فہم و ادراک کی یہ تابش وضو آنحضرتؐ کا خاصہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن فہمی کے لیے شرطِ اوّل یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ آنحضرتؐ نے قرآن کو کیونکر سمجھا، آپ کے دور میں اس پر کس انداز سے عمل ہوا اور عبادت سے لے کر معاملات تک کی گتھیوں کو آپ نے کس طرح سلجھایا۔

جو لوگ آنحضرتؐ کے فہم و ادراک اور آپ کی تبیین و تشریح سے بے نیاز ہو کر محض لُغت اور ڈکشنری کی بنیاد پر قرآن فہمی کے مدعی ہیں وہ اس حکمت سے قطعی محروم ہیں، جس کی وجہ سے خود آنحضرت اس لائق ہوئے کہ معارف دین کی تہہ تک پہنچ پائیں اور دین کو ایک عمل، ایک جیتی جاگتی تحریک اور جامع نقشہ حیات کے طور پر پیش کر سکیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ

اَلْكِتٰبِ (آل عمران : ۷)

[وہی ہے جس نے آپ پر کتاب اُتاری ہے، اس میں محکم آیتیں ہیں اور وہی کتاب کا اصل مدار ہیں]۔

یوں تو قرآن کی ہر آیت محکم ہے لیکن مضامین و تعبیر کے لحاظ سے قرآن حکیم نے آیات کو دو خانوں میں تقسیم پذیر قرار دیا ہے۔ کچھ آیات وہ ہیں جو تعبیر، معنی اور دلالت کے اعتبار سے بالکل واضح، متعین اور دوٹوک ہیں، اور کچھ وہ ہیں جن کے بارے میں معنی و دلالت کے نقطۂ نظر سے دورائیں ہو سکتی ہیں۔ آیات کی پہلی قسم محکمات کہلاتی ہے اور دوسری متشابہات۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ جب عقائد اور اقدارِ حیات تک پہنچنا درکار ہو تو اوّل الذکر آیات کی طرف رجوع کیا جائے، کیونکہ یہی وہ ہیں جو کتاب کی روح، اصل اور تعبیر و معنی کے ٹھیک ٹھیک تعین کی حامل ہیں۔ انہی پر دین کا انحصار اور مدار ہے متشابہات پر نہیں۔ متشابہات سے کیا مراد ہے، اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، ش ب ہ کے ضمن میں مندرجہ تفصیلات۔

ح ل ف

حَلَفَ باللّٰہ : اللہ کی قسم کھائی۔

حَالَفَ : باہم عہد و پیمان کرنا۔

اَلْحلف۔ اَلْحَلَفُ۔ الاُحْلُوْفَۃ : عہد و پیمان، بے وفائی نہ کرنے کی قسم کھانا۔

فلان حِلفَ کذا : فلاں اس سے الگ نہیں ہوتا۔

بَیْنَھُمْ حِلفٌ : ان میں عہد و پیمان ہے۔

حَلیف : دوست۔ جس سے عہد و پیمان ہو۔

فلانٌ حَلِیْفُ اللسان : اس کی زبان اس کی دولت ہے یعنی طلیق اللسان ہے، جو چاہتا ہے، اس کے اظہار میں زبان اس کا ساتھ دیتی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ

قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ○ (التوبہ : ۵۶)

[یہ لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں لیکن وہ بزدل لوگ ہیں]۔

یعنی مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو دل سے مسلمان نہیں ہے، یہی نہیں بلکہ ان کی ہمدردیاں بھی غیر مسلموں کے ساتھ وابستہ ہیں، لیکن مسلمانوں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے رہتے ہیں کہ ان کا تعلق مسلمانوں ہی سے ہے، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ ایسا یہ محض بزدلی کی وجہ سے کہتے ہیں، انھیں ڈر ہے کہ کھلم کھلا مسلمانوں کی مخالفت سے مبادا انھیں گزند پہنچے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۙ (القلم : ۱۰)

[اور آپ ایسے شخص کا بھی کہنا نہ مانیے گا جو بڑا قسمیں کھانے والا ہو]۔

حلّاف سے یہاں ایسا شخص مراد ہے جو عادتاً جھوٹی قسمیں کھاتا ہو۔ قرآن حکیم نے اگرچہ یہاں ایک کردار کا ذکر کیا ہے جو ازحد جھوٹا، چلتا پھرتا چغل خور اور گھٹیا ہے۔ مغرور ہے اور نیکی سے لوگوں کو باز رکھنے والا ہے۔ تاہم یہ ولید بن مغیرہ ایک شخص بھی تھا جو قریش میں سربرآوردہ، مال دار اور با اثر شخص تھا۔ اسلام دشمنی میں مشہور تھا۔ اس آیت میں آنحضرت کی وساطت سے عام مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ خبردار ایسے لوگوں کے جھانسے میں نہ آنا جن کے اخلاق کا یہ عالم ہے۔ بات یہ تھی کہ کچھ لوگ ان کی دولت و ثروت اور دنیوی وجاہت کے پیش نظر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکے تھے کہ اگر عند اللہ یہ لوگ پسندیدہ نہ ہوتے تو ان پر اللہ کا یہ فضل و انعام کیونکر ہو سکتا تھا۔ اس آیت میں اس حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے کہ فضیلت اور خوبی کا معیار دنیوی دولت و وجاہت نہیں حسنِ اخلاق کی دولت سے مالا مال ہونا ہے اور یہ طبقہ اپنی آسودگی کے باوجود اس دولت سے بالکل محروم ہے۔

ح ل ق

اَلْحَلْقُ : گلا، حلقوم۔

حَلَقَ : گلا کاٹا۔ حلق الرأس : سر کے بال مونڈے۔

رَأْسٌ حَلِيْقٌ ولحِيَةٌ حَلِيقٌ : مونڈا ہوا سر اور مونڈی ہوئی داڑھی۔

حَلَّقَ الطائر : پرندہ اڑا اور اس نے کادے کاٹے۔

حَلَّقَ الرأس : سر کے بال مونڈے۔

اَلْحَلَقَہ : گول شئی ، زرہ ، رسی۔

کِساء محلقٌ : سخت چادر۔ کہا جاتا ہے :

تُسْقى بكأسٍ حَلَاقٍ : اس نے موت کا پیالہ چکھا یعنی مرگیا۔

اِحْتَلَقَتِ السنة المال : یہ سال مال و دولت کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔

کُنْتُ فی حَلَقَةِ القوم : میں قوم کے حلقے میں تھا ، قوم کے بیچ میں تھا۔

قرآن حکیم میں ہے :

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیْنَ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَکُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ لا (الفتح : ۲۷)

[تم لوگ مسجد حرام میں ضرور داخل ہوگے ان شاء اللہ امن دامان کے ساتھ سر منڈاتے ہوئے اور بال کتراتے ہوئے]۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب مسلمانوں کو صلح حدیبیہ کے موقع پر زیارت کعبہ سے روک دیا گیا۔ آنحضرت کو خواب کے ذریعے یہ خوش خبری مل چکی تھی کہ یہ رکاوٹ عارضی ہے تمھیں ان شاء اللہ ضرور بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہونا ہے۔ بال منڈوانا اور کترانا شعائر حج میں سے ہے۔ غرض یہ ہے کہ تمھیں اس فریضے کو ادا کرنے کا ضرور موقع ملے گا۔ چنانچہ یہ موقع ملا اور مسلمان فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے۔

ح ل ل

حَلَّ : کسی چیز کا حلال ہونا۔ حرام سے نکلنا ، کھول دینا۔

حَلَّ الدین : قرض کی ادائیگی کا وقت آن پہنچا۔

حَلَّلَ : حلال ٹھہرانا۔

حَلَّلَ الیمین : قسم کا کفارہ ادا کرنا۔

اَحَلَّ : احرام سے نکل جانا، کہیں ٹھہرانا۔

اِنْحَلَّ : گرہ کا کھل جانا۔

اِحْتَلَّ بالمکان : کسی جگہ اُترنا، کسی مکان میں اُترنا۔

اِسْتَحَلَّ : حلال سمجھا، حلال ٹھہرایا۔

اَلْحِلُّ : حلال۔

اَلْحُلَّةُ : کپڑوں کا جوڑا۔

اَلْحَلَالُ : حرام کی ضد۔ وہ شے جس کا شرعاً کھانا پینا جائز اور مرغوب ہو۔

اَلتَّحِلَّةُ : قسم کا کفارہ۔

فلان حَلَّالٌ لِلعقد : فلاں شخص مشکلات کو حل کرنے والا ہے، عقدہ اور گرہوں کو کھولنے والا۔

اَلحلیلُ : خاوند۔

اَلْحَلِیْلَةُ : بیوی جمع حلائل۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ۝ۙ (طٰہٰ : ۲۷)

[اور میری زبان سے بستگی دور کر دے (میری زبان کی گرہیں کھول دے)]۔

حضرت موسیٰ کو جب حکم ہوا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اسے دین کے لطائف و حِکَم کی جانب توجہ دلاؤ تو حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے پروردگار اگر مجھ سے یہ اہم کام لینا ہے تو مجھے شرحِ صدر کی نعمت سے بہرہ مند کر اور اس مہم کو میرے لیے آسان کر دے، اور میری زبان میں جو تھوڑی سی بستگی اور لکنت پائی جاتی ہے، اس کو دور فرما دے، تاکہ میں پوری کامیابی کے ساتھ تیرے پیغام کو فرعون اور اس کے حواریوں تک پہنچا سکوں۔ یہاں زبان کی گرہیں کھول دینے یا بستگی دور کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ مجھے یہ استطاعت عطا فرما کہ میں پوری روانی کے ساتھ تیرے دین کو پیش کر سکوں۔

قرآنِ حکیم میں ہے :

وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ لا (ابراہیم : ۲۸)

[اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں لا اتارا] ۔

یہاں ذکر ان سرکردہ قائدینِ کفر کا ہے، جو بجائے اس کے کہ اپنی قوم میں خوئے شکر گزاری پیدا کرتے، توحید کی قدر کرتے اور شرک سے دامن کشاں رہتے، اُلٹے اللہ کی نعمتوں کو جھٹلانے کے درپے ہوئے اور اس طرح اپنی قوم کو ہلاکت و بربادی کے گھر میں لا اتارا۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ص (المائدہ : ۸۸)

[اور اللہ نے جو کچھ تمھیں حلال پاکیزہ چیزیں دے رکھی ہیں ان میں سے کھاؤ پیئو] ۔

حلال کیا ہے، اس کے لیے کوئی طبی و منطقی پیمانہ وضع نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تعلق قوموں کے مالوفات سے، ذوقِ سلیم اور ضروریات سے ہے۔ انہی اصولوں کے پیشِ نظر حلال و حرام کی فہرست کا تعین کتاب و سنت میں ہو چکا ہے، اس لیے کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ اس کے بعد کسی حلال کو حرام قرار دے یا حرام کو حلال سمجھ کر استعمال میں لائے۔ قرآن نے ہر اس شے کو حلال ٹھہرایا ہے جو فی نفسہٖ مفید ہے، پاکیزہ ہے، لذیذ ہے اور جس کو انسانی ذوق قبول اور گوارا کرتا ہے۔ كُلُوْا کا لفظ اگرچہ استفادہ کی ایک خاص نوعیت پر دلالت کناں ہے، تاہم معنی کے اعتبار سے یہ عام ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ہر اس شے کا استعمال درست و جائز ہے جس میں کوئی شرعی قباحت پائی نہیں جاتی۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ط (المائدہ : ۲)

[اور جب تم احرام کھول چکو تو اب شکار کر سکتے ہو] ۔

یعنی مناسکِ حج سے فارغ ہونے کے بعد حدودِ حرم سے باہر اگر شکار کرنا چاہو تو اس کی اجازت ہے۔ یہاں ایک امرِ مباح کو بصیغہ امر " فاصطادوا " اس لیے بیان کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ " مباحات " کا بھی شریعت میں ایک مقام ہے جس کو قائم رہنا چاہیے اور خواہ

نخواہ از راہِ تقدس اس کے ترک کو اولیٰ نہ سمجھنا چاہیے۔

ح ل م

حَلَمَ : خواب دیکھنا۔ حَلَمَ الْغُلَامُ لڑکے کا بالغ ہونا۔

حَلُمَ عن السفیہ : احمق سے درگزر کیا۔ یعنی احمق کو سزا نہ دی۔

حَلِمَ الجلد : خراب ہونا اور کیڑے پڑنا۔

اَلْحُلُمُ : عقل، رزانت اور بلوغت، خواب، جمع احلام۔

ھو من ذوی الاحلام : وہ عقل مند لوگوں میں سے ہے۔

احلامُ نائِمٍ : جھوٹے خواب، جھوٹی آرزوئیں۔

اضغاث احلام : پریشان خواب جن کی کوئی تعبیر نہ ہو۔

اَلْحِلْمُ : صبر، بردباری، قوتِ برداشت۔

حَلِیْمٌ : بردبار، خدا کی ایک صفت۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْکُمُ الْحُلُمَ فَلْیَسْتَاْذِنُوْا (النور : ۵۹)

[اور جب تم میں کے لڑکے بلوغ کو پہنچ جائیں تو انھیں بھی اجازت لینا چاہیے]۔

مقصد یہ ہے کہ جب لڑکے بالغ اور سیانے ہو جائیں تو انھیں بھی گھر میں آنے کے لیے اسی طرح پردے کے آداب کی پابندی کرنا چاہیے جس طرح کہ بڑے کرتے ہیں۔ یعنی اندر آنے کے لیے پہلے اجازت لینا چاہیے۔ یہ نہیں کہ بغیر اجازت لیے اندر گھسے چلے آئیں۔ "حلم" سے یہاں مراد بلوغِ جنسی بھی ہو سکتا ہے اور بلوغِ عقلی بھی۔

قرآن حکیم میں ہے :

اَمْ تَاْمُرُھُمْ اَحْلَامُھُمْ بِھٰذَآ اَمْ ھُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۚ (الطور : ۳۲)

[کیا ان کی عقلیں انھیں ان باتوں کی تعلیم کرتی ہیں یا یہ ہے کہ یہ ہیں ہی شریر لوگ]۔

صنادید قریش، عقل و فرزانگی اور دانش و رزانت کے لیے شہرت رکھتے تھے۔ لیکن

یہ اتنی سی بات نہ سمجھ پائے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور آنحضرتؐ اللہ کے رسول ہیں۔ یہاں بطور طنز کے کہا گیا ہے کہ کیا یہی ان کی عقل و دانش ہے کہ کبھی آنحضرتؐ کو شاعر ٹھہراتے ہیں، کبھی کاہن کہتے ہیں اور کبھی جنون زدہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ آپ کی شخصیت جس درجہ باکمال، متوازن اور عظیم ہے، اس کو دیکھتے ہوئے پہلے ہی قدم پہ انسان اس حقیقت کو مان لینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ شخص عام انسان نہیں بلکہ ایک ایسا انسان ہے جس کا اللہ تعالیٰ سے خصوصی ربط و تعلق ہے۔ اسی طرح جو قرآن حکیم کو پڑھتا یا سنتا ہے وہ یہ باور نہیں کرسکتا کہ کوئی شخص اپنی طرف سے اس طرح کا کلام پیش کرسکتا ہے جو تمام مصالح انسانی پر مشتمل ہونے کے علاوہ ادب و زبان کے خوارق کا بھی حامل ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ پرلے درجے کے سرکش ہیں۔ ان میں اگر سرکشی اور ضد نہ ہو تو حق بات پہچان لینے میں انھیں کوئی دشواری محسوس نہ ہو۔

قرآن حکیم میں ہے:

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ (الانبیا: ۵)

[نہیں بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن پریشاں خیالات ہیں، نہیں بلکہ انھوں نے اسے گھڑ لیا ہے، نہیں بلکہ وہ تو ایک شاعر ہیں]۔

اس آیت میں مشرکینِ مکّہ میں فہمِ قرآن کے باب میں جو تذبذب اور پریشان خیالی پائی جاتی تھی اس کی نہایت عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ ایک ہی آیت میں تین دفعہ حرف 'بل' کا استعمال ہوا ہے کہ مشرکین مکہ کے ذہن میں قرآن سے متعلق کس درجہ تحیر موجزن تھا۔ کبھی اسے آشفتہ فکری سے تعبیر کرتے، کبھی آنحضرت کی گھڑنت قرار دیتے اور کبھی یہ کہہ کر دل کو تسلّی دے لیتے کہ یہ محض شاعرانہ اپج ہے، خدا کا کلام ہرگز نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن کے پیرایۂ بیان سے حد درجہ متاثر تھے، اس کی تعلیمات سے حد درجہ خائف اور مرعوب تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ کوئی شخص ان کے دل کی بات معلوم کرے، اس لیے دل کے پھپھولے پھوڑنے اور اپنے کو دھوکہ دینے کے لیے واہی تباہی بکتے اور اس طرح کی الزام تراشی کرتے، ورنہ کون نہیں جانتا کہ اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی کہ قرآن پریشانی کا مجموعہ

ہوتا اور آنحضرت ایک شاعر سے زیادہ اور کچھ نہ ہوتے تو پھر ڈر، خوف، لڑائی، سازش اور جھگڑے کا کیا جواز تھا۔ پھر کیوں تمام مکّے والے یک مشت ہو کر آنحضرت کے مقابلے میں نکل آئے۔ کیوں آپ کے خلاف بغض و عناد کی آگ بھڑکائی اور مسلمانوں کی زندگی کو اجیرن بنا دیا۔

قرآن حکیم میں ہے:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ (ہود: ۷۵)

[بے شک ابراہیم بڑے حلیم، بڑے درد مند، بڑے نرم دل تھے]۔

حلم و بردباری، ہر پیغمبر کا شیوہ ہے، حضرت ابراہیم میں یہ وصف بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ یہ جس گھر میں پلے بڑھے، وہ مشرکانہ ماحول کا عکاس تھا، جس معاشرے میں انھیں توحید کا درس دینا تھا، اصنام پرستی اس میں صدیوں سے رچی بسی تھی اور وہ حکومت جو اس معاشرے کی سرپرست تھی بجائے خود اُلوہیت کی دعوے دار تھی۔ ان حالات میں جس صبر و تحمل اور حلم اور بردباری سے انھوں نے اللہ کے پیغام کو ان تک پہنچایا وہ انھیں کا حصہ تھا۔ طعنوں، مخالفتوں اور اذیتوں کو برداشت کیا، مگر کیا مجال کہ کبھی چیں بجبیں ہو کر دعوتِ حق سے دست بردار ہو گئے ہوں۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ (التغابن: ۱۷)

[اور اللہ بڑا قدر دان، بڑا بردبار ہے]۔

اللہ تعالیٰ کے حلیم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان بڑے سے بڑا جرم کرتا ہے، لیکن اس کا عفو عمیم یا تو اس کو معاف کر دیتا ہے یا اس پر فوراً گرفت نہیں کرتا۔ گرفت و مواخذہ کے اس کے اپنے طے شدہ پیمانے ہیں جس کے مطابق وہ افراد اور قوموں کو سزاوارِ عقوبت ٹھہراتا ہے۔

ح ل ی

اَلْحَلْیُ: جمع حُلِیٌّ زیور۔

حَلّی المَرْأَۃَ : عورت کو زیور پہنایا۔ آراستہ کیا۔

تَحَلّی : آراستہ ہونا۔

حِلْیَۃُ الاِنسان انسان کی شکل وصورت۔ کہا جاتا ہے:

عرفته بحِلْیَتِہٖ: میں نے اس کو اس کی ہیئت کذائی سے پہچان لیا، حلیہ سے پہچان لیا۔

حَلِینی فلان فی صدری وعینی: وہ شخص مجھے دل اور آنکھ میں جچا، اچھا لگا۔

قرآن حکیم میں ہے:

يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا

(الکھف: ۳۱)

[ان کو اس میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور وہ سبز رنگ کے کپڑے باریک اور دبیز پہنیں گے]۔

جنت اللہ تعالیٰ کی جانب سے فضل وکرم اور عنایت ورحمت کا مقام ہے، یہاں کھانے پینے اور پہننے کی تمام خوش عیشیاں میسر ہوں گی اور ہر شخص کو اس کے حسنِ اعمال کے صلے کے طور پر اس کے ذوقِ جمال کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ کنگن اور ریشم کے ملبوسات اس دور میں امارت وثروت کی علامت تھے۔ مقصد یہ ہے کہ تم اسلام تو لاؤ، تمھیں وہ سب کچھ ملے گا جس کے تم خواہاں ہو۔ کھانے پینے اور پہننے کی آسائشیں جنت کا محض ایک پہلو ہیں جن کا تعلق جسمانی لذتوں سے ہے، قلب وروح کی شادمانیوں کے لیے وہاں کیا اہتمام ہوگا، اس کا اس دنیا میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ ج جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (السجدہ: ۱۷)

[سو کسی کو معلوم نہیں جو جو سامان آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لیے خزانۂ غیب میں مخفی ہیں۔ یہ صلہ ہے ان کے اعمال کا]۔

قرآن حکیم میں ہے:

أَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ٥ (الزخرف: ۱۸)

[توکیا جو زیورات میں پرورش پائے اور مباحثہ میں بھی ژولیدہ بیان ہو وہ اللہ کی اولاد بننے کے قابل ہے]۔

مشرکینِ عرب میں فکر و عقیدہ کا ایک تضاد یہ رونما تھا کہ اپنے لیے تو یہ بیٹیوں کو ناپسند کرتے تھے اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے اور ان کی پوجا و پرستش کرتے تھے۔ اس آیت میں قرآن حکیم نے مشرکینِ مکہ کے اسی تضاد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جو انتساب تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے، اس کو اللہ کے لیے کیوں پسند کرتے ہو جو صرف صفات حسن و کمال ہی سے متصف ہے، اور پھر اس حقیقت پر بھی تو غور نہیں کرتے کہ وہ عورتیں جو زیورات یا زیب و آرائش کے شوق و جنون میں علم و عرفان کی ہر شاخ سے محرومی گوارا کرلیں، جو نہ اچھی طرح بول سکیں اور نہ اثباتِ مدعا پر قادر ہوں، بھلا دیوی دیوتا کے تک کیونکر پہنچ سکتی ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے :

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ (الاعراف : ۱۴۸)

[اور موسیٰ کی قوم نے ان کے جانے کے بعد اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنایا، یعنی ایک قالب جس کے اندر ایک آواز تھی]۔

حضرت موسیٰ جب طورِ سینا پر تورات حاصل کرنے کے لیے چلے گئے تو ان کی غیر حاضری میں بعض لوگوں نے چاندی سونے سے ڈھلے ہوئے ایک بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ اس بچھڑے کو اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ اس میں سے ایک آواز سی نکلتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی میں گاؤ پرستی کا پرانا جذبہ ان میں پھر سے اُبھر آیا اور کچھ ہشیار لوگوں نے اس نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر پھر سے ان کو شرک و بت پرستی کی راہ پر ڈال دینے کی کوشش کی۔ یہاں دو باتوں کی وضاحت بہت ضروری ہے، ایک یہ کہ اس حرکت کی ذمہ داری حضرت ہارون پر ہرگز عائد نہیں ہوتی جیسا کہ توریت میں کہا گیا ہے، دوسرے یہ کہ یہ زیورات جن سے گوسالہ ڈھالا گیا ان کے اپنے تھے، قوم فرعون کے نہیں تھے۔

ح م أ

حَمَأٌ : لس دار گارے کی مٹی۔ سیاہ غلیظ مٹی۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ (الحجر : ٢٦)

[اور بالیقین ہم نے انسان کو لس دار گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا]۔

انسان کی پیدائش و تخلیق کا ایک جانا بوجھا انداز تو یہ ہے کہ ماں باپ کے درمیان مخصوص ازدواجی تعلق اور اس وسیلے سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرا انداز اس سوال کا حامل ہے کہ اس کا آغاز کیونکر ہوا۔ یعنی زندگی کا یہ طویل سفر کہاں سے شروع ہوا جو لاکھوں برسوں پر پھیلا ہوا ہے اور آخر آخر میں جس کو انسانی قالب میں نشیمن بنانے کا موقع فراہم ہوا ہے۔ قرآن حکیم کی اس آیت میں اس بات کی تصریح ہے کہ زندگی کا پہلا اہتزاز، پہلا جرثومہ اور وہ پہلا مقام جہاں سے جوششِ حیات نے اپنے سفر کا آغاز کیا، مٹی اور گارا ہے۔ حیاتیات کے ماہرین کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس نظریے کی تصدیق کی ہے، ان کا کہنا ہے کہ پانی اور مٹی کے امتزاج ہی سے زندگی نے پہلی انگڑائی لی ہے اور اس کے بعد اس نے پَر پُرزے نکالے اور تکمیل و تنوّع کی دوسری صورتیں اختیار کی ہیں۔

اس آیت کے یہ معنی بھی ہیں کہ "انسان" کا پُتلا پہلے پہل جن اجزا سے تیار کیا گیا، وہ سراسر ارضی تھے، اس کے بعد ایک نغمۂ روحانی سے انسان نے موجودہ منزل میں قدم رکھا، جس سے نہ صرف اس کے اندر کا نظام حیات کارفرما ہوا بلکہ عقل و دانش کے داعیے بھی پیدا ہوئے، جن سے کائنات میں اس کو ایک خاص مقام ملا۔

ح م د

حَمْدٌ : کسی فضیلت و خوبی پر اظہارِ تحسین۔

علامہ راغب کا کہنا ہے کہ یہ لفظ مدح کی نسبت خاص ہے اور لفظ شکر کے مقابلے میں

عام ہے۔ کیونکہ مدح کا اطلاق تو ہر خوبی پر ہو سکتا ہے، چاہے وہ اختیاری ہو چاہے غیر اختیاری۔ لیکن حمد کا اطلاق صرف خوبی اور فضیلت کی اس نوعیت پر ہوتا ہے جس کا صدور اختیار کی بنا پر ہو، جبر و تسخیر کی بنا پر نہ ہو۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں: امدح فلانًا بصباحة وجهه کہ میں فلاں شخص کے چہرے کی خوب صورتی اور نکھار کی وجہ سے تعریف یا مدح کرتا ہوں۔ اس موقع پر اَحْمَدُ کا اطلاق جائز نہیں، کیونکہ کسی شخص کے چہرے کا نکھار اور خوب صورتی اس کے اختیار میں نہیں۔

شکر کا اطلاق، ہر انعام یا نعمت کے مقابلے پر ہو سکتا ہے۔ ان چیزوں کا خیال آئے تو شکر کو حمد کے ذیل میں گردانا جا سکتا ہے، لیکن ہر حمد ضروری نہیں کہ شکر کے ذیل میں شمار ہو۔ اسی طرح ہر حمد مدح تو ہے لیکن ہر مدح حمد نہیں۔

ہمارے مفسرین بجا طور پر حمد کی تعریف میں عموماً یہ جامع مانع جملہ استعمال کرتے ہیں کہ یہ تحسین و ستائش کی اس نوع سے تعبیر ہے جو فعل جمیل اور فعل اختیاری سے متعلق ہو۔

کہا جاتا ہے:

رَجُلٌ حَمِدٌ : تعریف کیا ہوا مرد۔

اَحْمَدْتُ صنیعه: مَیں نے اس کے کام کی تعریف کی۔

جاورته فاحمدت جواره : میں اس کے پڑوس میں رہا اور میں نے اس کے پڑوس کو سراہا۔

اَلْمَحْمَدَةُ : خوبی، تعریف۔ جمع مَحَامِد۔

احمد : آنحضرتؐ کا اسم گرامی۔

قرآن حکیم میں ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (انعام : ۱)

[ہر تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا]۔

اس آیت کا تعلق سیاق توحید سے ہے۔ غرض یہ ہے جس خدا نے یہ جملہ کائنات

پیدا کی ہے، حمد و ستائش اور عبادت کا استحقاق صرف اس کو حاصل ہے دوسروں کو نہیں۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات کا تعلق ہے، وہ ہر طرح کی حمد و ستائش سے بے نیاز ہے لیکن چونکہ اس کو اپنے بندوں سے گہرا تعلق اور محبت ہے اس لیے اگر کوئی شخص اس کی مدح و تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہے تو وہ اس پر خوش ضرور ہوتا ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بندے نے اپنے آقا کو پہچانا اور اس کی ربوبیت کے وسیع تر دائروں سے آشنائی حاصل کی۔ لیکن یہ تعریف صرف زبانی نہیں ہونی چاہیے، اس کی تہ میں یہ جذبۂ تحسین کارفرما ہونا چاہیے کہ ہم بھی اس کی صفات کی روشنی میں قابلِ تعریف کارنامے انجام دینے کی اہلیت پیدا کریں۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (انعام: ۴۵)

[اس طرح جڑ کاٹ دی گئی ان لوگوں کی جو ظلم کرتے تھے اور ساری حمد اللہ سارے جہانوں کے پروردگار ہی کے لیے ہے]

یہاں ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو اپنی آسودہ حالی اور عیش کوشی کو اپنے حق پر ہونے کی دلیل ٹھہراتے تھے اور پھر اس پندار میں حق کی مخالفت اور ظلم و تعدی کے ارتکاب میں اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ بالآخر عذابِ الٰہی نے آکر ان کی جڑ کاٹ دی اور ان کے شکوہ و احتشام کا کام تمام کر دیا۔ بظاہر یہ مقامِ تاسف تھا لیکن اس آیت میں اس کو مقامِ حمد قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جس طرح حق و صداقت کا پروان چڑھنا اللہ کی خاص رحمت کا کرشمہ ہے، اسی طرح ظلم و عدوان کی بیخ کنی بھی اس کے آئینِ ربوبیت کا ایک ناگزیر حصہ اور نوعِ انسانی کے حق میں بہت بڑا احسان ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ

(بنی اسرائیل: ۴۴)

[اور کوئی چیز ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اس کی پاکی نہ بیان کرتی ہو، البتہ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے]۔

اس آیت میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ دنیا کی ہر چیز اپنے وجود، بقا، معنویت اور استواری کے لحاظ سے قوانینِ الٰہی کے تابع ہے اور اس بات پر دلالت کناں ہے کہ اس کو پیدا کرنے اور منصۂ شہود پر لانے والی ایک ذاتِ گرامی ہے، جس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں، یہی وہ حمد وستائش ہے جو ہر سطحِ وجود سے عیاں اور نمایاں ہے، لیکن خدا کا انکار کرنے والے اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانے والے اس تسبیح کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جو زبانِ حال سے پکار پکار کر خدا کی توحید کا اعلان کر رہی ہے:

قرآنِ حکیم میں ہے:

وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ؕ (الصف: ٦)

[اور ایک رسول کی بشارت دینے والا جو میرے بعد آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہوگا]۔

آنحضرت کے بارے میں پہلی کتابوں میں بالعموم اور اناجیل میں بالخصوص واضح پیش گوئی موجود ہے جس میں آپ کی آمد آمد کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ حضرت مسیح کی جس خوش خبری کا اس آیت میں ذکر ہے وہ برنباس کی انجیل میں آج بھی پائی جاتی ہے، دوسری اناجیل میں بھی فارقلیط (PERICLUTES) کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی ستودہ صفات، حمیدہ خصال یا احمد ہی کے ہیں۔ لیکن شارحین اناجیل ازراہِ تعصب اس کے معنی یہ نہیں بیان کرتے بلکہ اس کے بجائے شفیع، مددگار اور تسلی دہندہ وغیرہ کے کرتے ہیں جو صحیح نہیں۔ یہ پیش گوئی آنحضرت کے زمانے میں اس درجہ شہرت پذیر تھی کہ ورقہ بن نوفل نے آنحضرت کو دیکھ کر حضرت خدیجہ کو یقین دلایا تھا کہ یہ نبی پیغمبر ہیں جن کا کتبِ مقدسہ میں ذکر پایا جاتا ہے۔

ح م ر

اَلْحُمْرَةُ: سرخی، سرخ رنگ۔

اَلْحِمَارُ: گدھا۔

اَلْاَحْمَرُ: جس کا رنگ سرخ ہو۔ سونا، زعفران۔ رَجُلٌ احمر: غیر مسلح انسان۔

اَلْاَحْمَرَیْنِ: گوشت اور شراب۔ کہا جاتا ہے:

نحن من اھل الاسودین لا من اھل الاحمرین: ہم کھجور اور پانی والے ہیں، گوشت اور شراب والے نہیں۔

اَلموتُ الاحمر: قتل سے واقع ہونے والی موت، سخت موت۔

اَلحمراءُ: غرناطہ کا مشہور قلعہ، عجم۔ کہا جاتا ہے:

لیس فی الحمراء مثلہ: عجم میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ (الجمعہ: ۵)

[جن لوگوں کو توراۃ پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا تھا پھر انھوں نے اس پر عمل نہ کیا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو کتابیں لادے ہو]۔

دینی علم اگر نفع رساں نہیں ہے اور اس سے قلب و نظر میں روشنی اور داعیۂ عمل پیدا نہیں ہوتا تو وہ بے کار ہے۔ یہودی قوم اگرچہ تورات ایسی کتاب سے بہرہ ور تھی لیکن اس کے باوجود تورات کے صفحات میں ان کے لیے ہدایت و راہ نمائی کے جو اصول مذکور تھے، وہ ان کی نظروں سے اوجھل رہے۔ یہی وجہ ہے انھوں نے نہ صرف تورات کے احکام و مسائل سے استفادہ نہ کیا بلکہ قرآن کی پیش کردہ آیات کی بھی تکذیب کی۔ قرآنِ حکیم نے ان کے اس علم بے ثمر کو اس مثال سے واضح کیا کہ یہ ایسے گدھے کی مانند ہیں جس پر بہت سی کتابیں لادی ہوں اور وہ کتابوں کے استفادہ سے محروم ہو۔

اس آیت میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ علم کتب و اسفار کے ظاہری و سرسری مطالعۂ تحقیق کا نام نہیں۔ عمل، روشنی اور استفادے سے تعبیر ہے۔ اگر ہم نے کتاب کی روح کو نہیں سمجھا، اس کے مضامین سے ہمارا قلب و ذہن نہیں بدلا اور اس کا اثر کردار و سیرت پر عکس انداز نہیں ہوا تو یہ علم نہیں، جہل ہے۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۙ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ؕ (مدثر : ۵۰-۵۱)

[گویا وہ وحشی گدھے ہیں ، جو شیر سے بھاگے جارہے ہیں] ۔

اہلِ جہنم کا تذکرہ ہے کہ آج جب وہ سزا بھگت رہے ہیں تو یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ ہم نے دنیا میں رہ کر فرائض کو ادا نہ کیا ، حقوق العباد بھی ادا نہ کر پائے ۔ یہی نہیں بلکہ نفس آخرت کی تکذیب میں لگے رہے ۔ عمل کیا خاک ہوتا ۔ لیکن جب انھیں دنیا میں اللہ کی آیات پڑھ کر سنائی جاتیں تو یہ بدکتے ، بھاگتے اور شدید بے زاری کا اظہار کرتے ، اس وقت ان کا یہ عالم ہوتا کہ گویا یہ گدھے ہیں جو شیر کی آمد کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں ۔ یہ محض تشبیہ ہے ، اس سے مراد یہ ہے کہ بعض لوگ سچائی ، روشنی اور انکشاف سے سخت گھبراتے اور ڈرتے ہیں ۔

ح م ل

حَمَلَ : بار اٹھانا ، حاملہ ہونا ، خیانت کرنا ۔ کہا جاتا ہے :

امرأۃ حامل وحاملۃ : یعنی پیٹ والی عورت ۔

حَمَلَ علی نفسہ فی السیر : بمشقت چلا ، چلنے میں زحمت محسوس کی ۔

حَمَلَہ علی الامر : کسی امر پر اُکسایا ، آمادہ کیا ۔

حَمَلَ القران : قرآن یاد کرنا ۔

حَمَّلَ : اٹھوایا ، ذمہ داری ڈالی ۔

تحامل : کسی کام کو اپنے ذمے لینا ۔

تَحَامَلَ علی فلان : فلاں شخص پر زیادتی کی ، ظلم کیا ۔

تحامل فی المشی : چلنے میں گراں باری محسوس کی ۔

اِحْتَمَلَ : اٹھانا ۔

اُحْتُمِلَ : خفا ہونا ۔

اَلْحِمْلُ : بوجھ ۔

اَلْحَمَّالُ : مزدور، بوجھ اٹھانے والا۔

اَلْحَمِيلُ : اجنبی، ضامن، پیٹ کا بچہ، سیلاب کا کوڑا کرکٹ۔

قرآن حکیم میں ہے :

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ (الاحزاب : ۷۲)

[ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی سو ان سب نے انکار کیا اس سے کہ اس کو اٹھائیں اور اس سے ڈرے اور اسے انسان نے اپنے ذمے لے لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم ہے اور بڑا جاہل ہے]۔

لفظ "امانہ" کے تحت اس آیت کی تفسیر کا ایک انداز جس کو جمہور مفسرین نے اختیار کیا، بیان ہو چکا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس بارِ امانت کو جس میں توحید داخل ہے، فرائض شامل ہیں اور جو احکامِ الٰہی کی پیروی اور ذمہ داری کے احساس سے تعبیر ہے، انسان کے سوا اور کوئی اٹھانے کی ذمہ داری قبول نہ کر سکا۔ نہ آسمان اپنی وسعتوں کے باوجود اس امانت کو قبول کرنے پر راضی ہوا، نہ زمین اپنی پنہائیوں کے وصف اس امانت کو اٹھانے پر راضی ہوئی اور نہ یہ اونچے اونچے پہاڑ اس پر آمادہ ہوئے کہ اس پیش کش کو بہ رضا و رغبت مان سکیں۔ اس دعوت پر لبیک کہنے کی جرأت اگر ہوئی تو صرف ظلوم و جہول انسان کو۔ اور کیوں نہ ہوتی، آخر یہی انسان تو عقل و خرد اور ارادہ و اختیار کی نعمتوں سے بہرہ مند ہے۔ آسمان، زمین اور پہاڑ کو تو سمجھ بوجھ نہیں کہ اس امانت کی ذمہ داریوں کو نبھا پاتے، چہ جائے کہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی حامی بھرتے۔ دراصل یہ ایک نہایت ہی خوب صورت پیرایۂ بیان ہے جس سے مقصود انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کرنا اور اس کو اس کی ذمہ داریاں یاد دلانا ہے۔

تفسیر کا دوسرا انداز، جس کو زجاج نے اختیار کیا وہ یہ ہے کہ حَمَلَ کے معنی خیانت کرنے کے ہیں۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جب زمین، آسمان اور پہاڑوں

پر، اس امانتِ اطاعت و فرماں برداری کو پیش کیا گیا تو انھوں نے اسے مان لیا اور اس میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا، لیکن یہ انسان کی بدنصیبی ہے کہ یہ اس خیانت پر آمادہ ہو گیا۔ یعنی جہاں کائنات کا ذرّہ ذرّہ قانونِ فطرت کو مانتا اور اس کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے وہاں تنہا انسان ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام سے روگردانی کا مرتکب ہوتا ہے۔

تفسیر کا پہلا انداز جانا بوجھا اور اہلِ علم کے حلقوں میں مقبول اور لگتا ہوا ہے جب کہ دوسرا انداز غرابت لیے ہوئے ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ (فاطر: ۱۸)

[اور اگر کوئی بوجھ لدا ہوا کسی کو اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے لائے گا جب بھی اس میں سے کچھ یعنی بوجھ اٹھایا نہ جائے گا]۔

آیت کا تعلق احوالِ آخرت سے ہے، یہ وہ مقام ہے، جہاں ہر شخص خود اپنے ہی اعمال کا ذمہ دار گردانا جائے گا۔ نہ کوئی کسی کا بوجھ اٹھا سکے گا اور نہ کسی کے کفر و معصیت کے نتائج کو بانٹ ہی سکے گا۔ اس روز جو مومن ہے وہ ایمان کے ثمرات سے بہرہ مند ہوگا اور جو کافر ہے، وہ کفر کی سزا پائے گا۔

"حِمْل" سے مراد یہاں گناہوں، معصیتوں اور روگردانیوں کا بوجھ ہے جو ہر شخص کو بہ تقاضائے انصاف خود ہی اٹھانا پڑے گا۔ اسی مضمون کی تائید قرآنِ حکیم کی دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے:

وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ط (العنکبوت: ۱۲)

[حالانکہ یہ لوگ ان کے گناہوں سے ذرا بھی نہیں لے سکتے]۔

یعنی کفار کا یہ کہنا جھوٹ ہے کہ مسلمان اگر ان کی راہ چلیں اور کفر اختیار کر لیں تو وہ ان کو اس کے نتائج و عواقب سے نجات دلا دیں گے۔ کیونکہ آخرت احتساب کی وہ جگہ ہے جہاں یہ لوگ ذرا بھی کام نہ آسکیں گے۔ حد یہ ہے کہ ان کے بس میں یہ بھی نہیں ہوگا کہ اس صورت میں مسلمانوں کے گناہوں میں سے کسی ایک گناہ کی ذمہ داری قبول کر سکیں۔

اسلام ذاتی ذمہ داری کا قائل ہے - اس میں نجاتِ اُخروی کے بارے میں ان ضمانت ناموں کی قطعی گنجائش نہیں پائی جاتی جو رومن کیتھولک چرچ کے پادری بھاری قیمت وصول کر کے اپنے عقیدت مندوں میں تقسیم کیا کرتے تھے -

قرآنِ حکیم میں ہے :

وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۚ

(البقرہ : ۲۸۶)

[اے ہمارے پروردگار ہم پر بوجھ نہ ڈال جیسا کہ تو نے ڈالا تھا ان لوگوں پر جو ہم سے پیشتر تھے] -

اس آیت میں مسلمانوں کی خواہشاتِ دینی کو دعا کی صورت میں بیان کیا گیا ہے، جن میں ایک یہ ہے کہ پروردگار مسلمانوں پر آزمائش و ابتلا کا بوجھ نہ ڈالنا، جیسا کہ تو نے یہودیوں پر ڈالا - اس میں یہودی دین کی ان شدتوں اور سختیوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو دین کے نام پر ان کے فقیہوں اور فریسیوں نے خواہ مخواہ پیدا کر رکھی تھیں - یہ سختیاں اگرچہ دین کا حصہ نہ تھیں، بلکہ یہودیوں کی اپنی ہی پیدا کردہ تھیں - تاہم اللہ تعالیٰ کی طرف ان کا انتساب ان معنوں میں ہے کہ ایک خاص عرصے تک اللہ تعالیٰ کے منشارِ تکوینی کے تحت بہر حال یہودیوں کو ان پر عمل پیرا رہنا پڑا - تا آنکہ اسلام آیا اور اس نے عقیدہ و عمل کی ان تمام زنجیروں کو کاٹ پھینکا جو انھوں نے از خود پہن رکھی تھیں اور ایک ایسا سلجھا ہوا دین پیش کیا جو سہل، آسان اور ہر لحاظ سے قابلِ عمل ہے -

ارشادِ باری ہے :

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَٱلْأَغْلَٰلَ ٱلَّتِى كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ (الاعراف : ۱۵۷)

[اور ان پر سے بوجھ اور قیدیں جو اب تک تھیں اتارے دیتا ہے] -

یعنی نبی اُمیؐ نے آکر دین کا ایسا تصوّر پیش کیا جس سے فقہ و قانون کی پیدا کردہ دشواریاں آپ سے آپ غائب ہو گئیں اور وہ بوجھ اور قیدیں جو اب تک یہودیوں نے اختیار کر رکھی تھیں ان پر سے اُتر گئیں، دین پر عمل آسان ہو گیا اور قانون و ضابطۂ حیات کے متعلق وہ بندھن ٹوٹ گئے جنھوں نے زندگی کی نشاط آفرینیوں کو گراں بار کر رکھا تھا -

قرآنِ حکیم میں ہے :

فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ (الذاریات : ۲)

[پھر بوجھ اٹھانے والے بادلوں کی]۔

سورہ ذاریات کا موضوع اثباتِ حشر ہے اور اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس کائنات کے جتنے مظاہر ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے ایک مصلحت، ایک معنی اور مقصد کار فرما ہے، یہ محض بخت و اتفاق کا کرشمہ نہیں کہ ہواؤں کا ایک نظام ہے۔ پھر ہواؤں کا پانی کی بہت بڑی مقدار کو اپنی پشت پر لادے لادے پھرنا اور وقتِ مقررہ پر برس جانا بھی ایک بندھے ٹکے قانون کا نتیجہ ہے۔ کشتیاں بھی ایک حساب اور قاعدے سے چلتی ہیں اور کائنات میں ہر شی کو اس کے مقوماتِ وجود کی بہم رسانی اور تقسیم کا ایک نہج بھی مقرر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود انسان کی زندگی بھی ایک نظام کا حصہ اور ایک مقصد کا جز ہے، جو یہ ہے کہ اسے آگے بڑھنا اور احتساب اور اجر و صلہ کی منزلوں سے گزر کر اور سنو رنا اور جلا حاصل کرنا ہے۔ ان مظاہر قدرت کو اس دعوے کے اثبات میں بطور شواہد و دلائل کے پیش فرمایا ہے کہ ہر انسان ان پر غور کرے اور زندگی کی مقصدیت پر ایمان لائے۔

ح م م

حَمَّ : گرم کرنا، پگھلانا، کالا ہونا۔

حُمَّ الامر : بات طے ہوگئی۔

حُمَّ حِمامه : اس کی زندگی کا فیصلہ ہو چکا۔

حُمَّ الرجل : بخار ہوگیا، بخار زدہ ہوگیا۔

اِحتَمَّ : غمگین ہونا۔

اَلحَامَّةُ : مخصوص، خاص۔ کہا جاتا ہے :

یعرفه العامّةُ والخاصّةُ : اسے عوام و خاص بہت جانتے ہیں۔

اَلْحُمّٰى : بخار جمع حمیات۔

اَلْحَمَامُ : کبوتر۔ واحد حَمَامۃ۔ تذکیر و تانیث دونوں کے لیے آتا ہے۔

الْحَمِیْمُ : گرم پانی، بہت ٹھنڈا پانی، یار غار، مخلص دوست۔ کہا جاتا ہے:

هُمْ اَحِمَّائِیْ : وہ میرے مخلص دوست ہیں۔

اَلْیَحْمُوْمُ : کالا، دھواں، کالا اور گرم دھواں۔

الحمام : شریف، سردار۔

استحمّ : حمام میں داخل ہوا، غسل کیا۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ۝ (الانعام: ۷۰)

[ان کے لیے پینے کو تیز گرم پانی ہوگا اور عذاب دردناک ہوگا بعوض کفر کے جو یہ کرتے رہے]۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے حق آفتاب کی طرح چمکا، لیکن انھوں نے نہ صرف ازراہِ تعصب آنکھیں بند کر لیں بلکہ اس حق کی تکذیب بھی کی اور اس کے خلاف سازشیں بھی روا رکھیں۔ یہ لوگ آخرت میں موردِ عتاب ہوں گے۔ اس عتاب کی ایک شکل یہ ہوگی کہ انھیں پینے کو تیز گرم پانی ملے گا۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ ۝ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ ۝ (الشعرا: ۱۰۰-۱۰۱)

[سو اب کوئی ہمارا سفارشی نہیں اور نہ کوئی مخلص دوست ہی ہے]۔

آخرت میں مشرکین کی آنکھیں کھلیں گی۔ وہ دیکھیں گے کہ جن بتوں کی وہ پوجا کرتے رہے اور جن بڑے لوگوں کی رضاجوئی کی خاطر یہ شرک ایسی گمراہی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے رہے ان میں کوئی بھی تو ایسا نہیں جو اس آڑے وقت میں کام آ سکے اور ان کو عذاب کی گرفت سے چھڑا سکے۔ قرآن میں اس مضمون کی متعدد آیات ہیں جن میں ذاتی ذمہ داری پر زور دیا گیا ہے اور کھلے لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ مقام احتساب میں سفارش و دوستی اور عقیدت کسی کام آنے والی نہیں۔

یہاں لفظ حمیم کے معنی مخلص، ہمدرد اور ایسے شخص کے ہیں جس کی ہمدردی میں جوش اور سرگرمی ہو۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَظِلٍّ مِّنْ يَحْمُوْمٍ ۙ (الواقعہ : ۴۳)

[اور سیاہ دھوئیں کے سایہ میں] ۔

حضرت ابن عباس، مجاہد اور عکرمہ سے " یحموم " کے معنی دھوئیں کے سایہ کے مروی ہیں۔

اس آیت میں ان ذی جاہ و ثروت لوگوں کا ذکر ہے جو آخرت کے منکر اور خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانے والے تھے۔ یہ اگرچہ دنیا میں عیشی کوشی کی ہر صورت سے بہرہ مند رہے، لیکن اب ان کی بے چارگی کا یہ حال ہے کہ جہنم کے دھوئیں اور اس کے سایہ کے سوا ان کے لیے اور کوئی سایہ نہیں جس کے نیچے یہ آرام سے رہ سکیں۔

گرم ملک کے رہنے والوں میں سایہ کی بڑی اہمیت ہے۔ سایہ ان کے ہاں راحت و سکون کی علامت ہے، لیکن یہ سایہ اگر آگ اور دھوئیں کا سایہ ہو تو اس کے معنی اس مکمل محرومی کے ہیں جن سے یہ لوگ دوچار ہوں گے۔

ح م ی

حَمٰی : بچانا ۔ کہا جاتا ہے :

ھو یحمی انفہٗ : وہ اپنی ناک یا ناموس کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی مناسبت سے جو شخص اپنی عزت و وقار کے بارے میں حساس ہو اُسے کہا جاتا ہے :

ھو حَمِیُّ الْاَنْفِ

حَمِیَ : گرم ہونا ۔ حَمِیَ النہار : دن کا گرم ہونا۔

حَمِیَ علیہِ : وہ اس پر خفا ہوا۔

حَامٰی : مدافعت کرنا، حمایت کرنا ۔

حِمیٰ : چراگاہ۔

اَلحُمّٰی : بخار۔

اَلحُمَیّا : جوش، شراب کی تیزی۔ کہا جاتا ہے :

اتانی فی حَمِّی الظہیرۃ : وہ دوپہر کی سخت گرمی میں میرے پاس آیا۔

حمیۃ الجاہلیۃ : زمانۂ جاہلیت کا جوش، تعصبات کی غلط حمایت۔ ہر وہ جذبہ جو جاہلیت میں عربوں کو حق کی حمایت سے باز رکھتا تھا۔

حامٍ : وہ اونٹ جو دس اونٹنیوں کو حاملہ کر دے، اس کے بارے میں کہا جاتا تھا :

حَمیٰ ظَھرَہ : اس نے اپنی پشت بچالی، یعنی اسے ایک نوع کا تقدس حاصل ہوگیا اور اب اس پر کوئی سوار نہیں ہو سکتا۔

قرآن حکیم میں ہے :

تَصْلٰی نَارًا حَامِیَۃً ۙ (الغاشیہ : ۴)

[جلتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے]

یہ ایک گروہ کے مال اور انجامِ بد کا ذکر ہے جو دنیا میں آخرت کی طرف سے غافل رہا اور یہ سمجھتا رہا کہ زندگی بس دنیائے دوں کے تقاضوں کی تکمیل ہی سے تعبیر ہے۔ اس گروہ نے نہ شرک کو چھوڑا اور نہ برائیوں کو ترک کیا۔ ان کے بارے میں بتایا گیا کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جہاں نہ صرف یہ ہر آسائش سے محروم ہوں گے بلکہ اذیت و عقوبت سے بھی دوچار ہوں گے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَلَا حَامٍ ۙ (المائدہ : ۱۰۳)

[اور نہ حامی کو]۔

دورِ جاہلیت میں عربوں نے بعض ایسی رسوم و عادات کو اختیار کر رکھا تھا جس میں نہ صرف معقولیت کا حد درجہ فقدان تھا بلکہ ان سے شرک کے دواعی کو بھی تقویت پہنچتی تھی۔ ان میں ان کا ایک عقیدہ یہ تھا کہ وہ اونٹ جو دس اونٹنیوں کو حاملہ کر دے، آپ سے

آپ تقدیس کا حامل بن جاتا ہے، لہذا اُسے اس طرح کھلا چھوڑ دینا چاہیے کہ نہ تو اس سے سواری کا کام لینا چاہیے اور نہ بار برداری کا۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

وَاِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاھِلِیَّةِ (الفتح: ۲۶)

[اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں عصبیت جاہلی کو جگہ دی]۔

ہر گروہ میں اپنے مخصوص افکار و عقائد اور رسوم و عوائد سے محبت و وابستگی کا ہونا قدرتی امر ہے۔ حمیتِ جاہلیت یہ ہے کہ حق و ناحق میں فرق قائم نہ رکھا جائے، اور ہر بات کو اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ اس سے ہمارے قبائلی اور گروہی تعصبات کو تقویت ملتی ہے یا نہیں۔ عقل و فہم اور بصیرت و حوصلہ کو کام میں لانے کے بجائے تنگ نظری اور چھچھورپن کا اظہار وہ عادت اور سوچنے کا وہ انداز ہے جسے قرآن حمیتِ جاہلی سے تعبیر کرتا ہے۔ سیاقِ آیت یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے وقت جب آنحضرتؐ اور مشرکینِ مکہ کے درمیان مصالحت طے پاگئی اور صلح نامہ تحریر ہونے لگا تو آنحضرتؐ نے اس کا آغاز حسبِ معمول بسم اللہ سے کرنا چاہا۔ اس پر مشرکین مکہ کے ترجمانوں نے مشتعل ہو کر اعتراض کیا۔ آنحضرتؐ نے صلح کی خاطر اس ناروا شکایت کو تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد یہ ضروری تھا کہ آنحضرت کی جانب سے اس امر کی وضاحت ہوتی کہ معاہدے کا ایک فریق "محمد رسول اللہ" ہے۔ مشرکینِ مکہ کے نمائندے اس پر بھی بھڑکے اور معترض ہوئے۔ ادھر مسلمانوں میں مشرکین کی اس ہٹ کے خلاف غیظ و غضب اور جوش پیدا ہوا، ان کا کہنا تھا کہ حق پر ہونے کے باوجود ہم کیوں اس قدر دب کر صلح کریں۔ لیکن آنحضرت کی چشم بصیرت نے دیکھ لیا تھا کہ یہ صلح فتح مبین کی تمہید ہے اور وہ دن دُور نہیں جب یہی کمزور و ناتواں مسلمان مکہ کی گلی کوچوں میں فاتحانہ طور پر داخل ہوں گے اور کوئی قوت اس وقت ان کی یلغار کو روکنے والی نہ ہوگی۔ اس وجہ سے آپ نے مصالحت کی جملہ شرائط بادلِ ناخواستہ تسلیم کر لیں اور پردۂ غیب سے جو ہویدا ہونے والا تھا اس کا انتظار کرنے لگے۔

ح ن ث

اَلْحِنْثُ : گناہ، بت پرستی، قسم کی خلاف ورزی کرنا۔

حَنِثَ فی یمینہ : قسم توڑ دی۔

بلغ الحنث : لڑکا اس عمر کو پہنچ گیا جہاں گناہ و صواب کا شعور بیدار ہو جاتا ہے، یعنی بالغ ہو گیا۔

تحَنَّثَ : گناہ سے دامن کشاں رہا، نیکی اور عبادت میں مصروف رہا۔

آنحضرتؐ جب غارِ حرا میں خلوت گزیں ہوئے تو ان کے بارے میں احادیث میں آتا ہے۔

کَانَ یَتَحَنَّثُ : ظاہر ہے اس سے مراد صرف گناہوں سے بچنا نہیں بلکہ اللہ کی عبادت میں مشغول رہنا ہے۔ عربی میں جس طرح تاثم کے معنی رفع اثم اور تحرج کے معنی دفع حرج کے ہیں، اسی طرح تحنث کے معنی دفع حنث یا گناہ سے باز رہنے کے ہیں۔ یہ عربی زبان کا کمال ہے کہ تھوڑے سے تصرف سے اس میں معنی یکسر بدل جاتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ۚ (الواقعہ : ۴۶)

[اور بڑے گناہ پر اصرار کرتے رہتے تھے]۔

یہ اُن خوش حال اور عیاش منکرین و مشرکین کا تذکرہ ہے جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانے پر مصر تھے، جو نہ صرف اُخروی زندگی کو نہیں مانتے تھے بلکہ ایمانیات کے پورے نظام کو جھٹلاتے تھے۔ انھیں قرآن حکیم اصحاب شمال کہہ کر پکارتا ہے اور بتاتا ہے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

اَلْحِنْثِ الْعَظِيْمِ سے مراد شرک ہے۔ اس کی تائید قرآن حکیم کی اس آیت سے ہوتی ہے:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (لقمان : ۱۳)

[بے شک شرک بڑا بھاری ظلم ہے]۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ط (صٓ : ۴۴)

[اور اپنے ہاتھ میں مُٹھا سینکوں کا لے لو اور اسی سے مارو اور اپنی قسم نہ توڑو]۔

آیت کا تعلق حضرت ایوب کی زندگی کے ایک خاص گوشے سے ہے، اٹھارہ سال انھوں نے بیماری جھیلی، مال و دولت کے انبار اور عزیزوں سے محرومی کو بکمال صبر برداشت کیا۔ اس اثنا میں ایک مرتبہ بیوی کی کسی غلطی پر خفا ہو کر یہ کہہ بیٹھے کہ میں تندرست ہونے پر تمھیں سو تازیانے ماروں گا۔ تندرست ہوئے تو بہت پچھتائے اور نادم ہوئے کہ میں بیماری کی حالت میں کیا کہہ بیٹھا۔ پریشانی کا سبب یہ امر تھا کہ وفادار بیوی کو جس نے اٹھارہ سال بیماری میں ان کا ساتھ دیا، سزا دیں تو کس بنا پر اور نہ دیں تو ایفائے قسم کا فریضہ پورا نہیں ہو پاتا۔ یہ ایک الجھن تھی جو بیک وقت نفسیاتی بھی تھی اور دینی و اخلاقی بھی، اور کوئی صورت حضرت ایوب کو اس سے مخلصی کی سوجھ نہیں رہی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے از راہِ کرم یہ تدبیر بتا کر حضرت ایوب کی تسکینِ قلب کا سامان مہیا کر دیا کہ سینکو کا ایک مُٹھا لو اور اس سے بیوی کو مارو، قسم کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ اس سے بعض فقہا نے حیل کے جواز پر استدلال کیا ہے جو صحیح نہیں، کیونکہ "حِیَل" کا تعلق بہرحال فقہا اور علما کے استدلال و تدبیر سے ہے اور یہاں جو تدبیر اختیار کی گئی ہے بہ براہِ راست ارشادِ خداوندی سے متعلق ہے اور اس قبیل سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے کرمِ خاص سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس کا ظہور عین اس وقت ہوتا ہے جب اللہ کا کوئی بندہ مصیبت میں پھنس جاتا ہے اور اس سے مخلصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس مرحلے پر اللہ تعالیٰ کی عنایت بے پایاں دست گیری کرتی ہے اور کشائش کی کوئی صورت پیدا کر دیتی ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

وَمَن يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ (الطلاق : ۲)

[اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے کشائش پیدا کر دیتا ہے]۔

حِیَل کا آغاز دراصل یہودی فقیہوں اور فریسیوں کی ان کوششوں سے ہوا، جو انھوں نے بائبل کے مشکل اور دشوار احکام سے پیچھا چھڑانے کے لیے روا رکھیں۔ تاریخ

کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہودی اپنے مزاج کے اعتبار سے کبھی بھی دینی روح کے حامل نہیں ہوئے، جاہ و طلب کا حصول، حکومت و اقتدار پر قبضے کی خواہش اور دولت و ثروت کے خزائن کو اپنے ہی دامنِ حرص و آز میں سمٹ لینے کی آرزو، یہ تھیں وہ چیزیں جو ہمیشہ ان کی تگ و دو کا محور رہیں۔ دین چونکہ ان کے لیے محض ثانوی حیثیت کی شی رہی، اس لیے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے ہاں حیل یا ایسی تدابیرِ خفی کا وجود پایا جائے جن سے ان کی دنیوی مطلب براری ہوتی رہے، اگرچہ ان سے دین کا ابطال ہی لازم کیوں نہ آئے۔ لیکن مسلمان فقہا بھی حیل کے بارے میں ایسی مذموم روش کو اختیار کریں، یہ بات ناقابلِ فہم ہے، اس لیے کہ جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے وہ اوّل و آخر مسلمان ہوتا ہے اور سوا دین کی اطاعت و پیروی کے اس کا اور کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ پھر اس کا دین بھی یہودیوں کی طرح دشوار، مشکل اور ناقابلِ عمل نہیں، بلکہ سہل اور سراسر انسانی مصالح پر مبنی ہے۔ مسلمان فقہا میں حیل کی بحثوں کی ایک ہی وجہ جواز نظر آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ فقہ جب فرد اور معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے بجائے محض فن کا روپ دھار لیتی ہے تو اس میں اکثر غیر ضروری وسعت اور پھیلاؤ اُبھر آتا ہے جو ایسے فرضی اور مبنی بر حیل مسائل پر استوار ہوتا ہے، جن کا دین کی روح عمل و کردار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارے ہاں فقہ کے تقاضائے تکمیل و ارتقا نے یہی کرشمہ دکھایا ہے جس سے ہمارا فقہی ذخیرہ غیر تخلیقی اور بے جان ہو کر رہ گیا ہے۔

ح ن ج ر

الحنجرۃ : نرخرہ، گلا۔

حنجرت العین : آنکھ اندر کو دھنس گئی۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (الاحزاب : ۱۰)

[اور جب کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے]۔

غزوۂ احزاب میں جب کفارِ مکہ نے مدینہ پر اچانک دھاوا بول دیا اور پندرہ ہزار کے لشکر نے اس کو گھیر لینے کی کوشش کی تو مسلمانوں کا مارے خوف و دہشت کے گھبرا اٹھنا قدرتی امر تھا۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ مسلمانوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہیں اور کلیجے تھے کہ اچھل کر منہ کو آرہے تھے۔ عربی زبان میں تحیر خوف اور دہشت کے اس عالم کو بلغت القلوب الحناجر کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ دل گلوں تک آ پہنچے لیکن یہاں لفظی ترجمہ مقصود نہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش تھی جس کا ازالہ جہاں مسلمانوں کی طرف سے صبر و استقامت اور مناسب تدبیراتِ حربی سے کیا گیا، وہاں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت شاملِ حال ہوئی۔ آندھی اور باد و باراں کا طوفان اس شدت سے آیا کہ دشمنوں کے خیمے اُکھڑ گئے اور وہ مجبور ہو گئے کہ میدان چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کریں۔

قرآن حکیم میں ہے:

اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ط (المؤمن: ۱۸)

[جب کلیجے منہ کو آجائیں گے (اور غم سے) گھٹ گھٹ جائیں گے]۔

یہاں قیامت کے احوال و اہوال کا ذکر ہے کہ اس وقت شدتِ خوف و تحیر سے لوگوں کی کیا حالت ہوگی، کس طرح دل منہ کو آئیں گے اور کیونکر غم کی وجہ سے دل غم کو چھپانا چاہیں گے لیکن چھپا نہیں پائیں گے۔ غم و اندوہ کی کیفیتیں ان کے چہرے سے عیاں ہوں گی۔

ح ن ذ

حَنَذَ اللحم: گوشت بھونا۔ دو گرم پتھروں کے درمیان رکھ کر گوشت بھونا۔

حَنَذَ الفرس: گھوڑے کو اتنا دوڑایا کہ اس کو پسینہ آگیا۔ ایسے گھوڑے کو مَحنُوذ کہتے ہیں۔

حنیذٌ: بُھنا ہوا گوشت۔ گرم پانی۔ وہ گھوڑا جسے خوب دوڑایا گیا ہو۔

حَنَذَتنا الشمس: ہم کو سورج کی تمازت نے جھلسا دیا۔ کہا جاتا ہے:

اذا سقیتہ فاحنذ: جب شراب پلاؤ تو اس میں پانی کم ڈالو تاکہ اس کی حرارت و

جوش قائم رہے۔

حَنَذٌ : ایک قریہ کا نام ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ (ہود: ۶۹)

[ابراہیم نے کہا تم پر سلام، پھر دیر نہیں لگائی کہ ایک تلا ہوا بچھڑا لے آئے]۔

جونہی فرشتے بصورت بشری حضرت اسحاق کے تولد کی خوش خبری لے کر حضرت ابراہیم کے پاس آئے، حضرت ابراہیم نے ازراہِ مہمان نوازی اور تواضع بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا جس کو قبائلی زندگی میں پُرتکلف ڈش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور یہ نہیں جان پائے کہ یہ انسان نہیں فرشتے ہیں جو کھانے پینے کی احتیاج سے بے نیاز ہیں۔

حضرت ابراہیم کا ذوقِ مہمان نوازی دیکھیے، کیا ٹھاٹھ ہیں۔ وہ مسافر جن کو وہ جانتے تک نہیں، اس درجہ احترام و پذیرائی کے مستحق سمجھے جاتے ہیں کہ بھنے ہوئے بچھڑے سے ان کے کام و دہن کی تواضع کی جائے۔ معلوم ہوا کہ پُرتکلف کھانا کھلانا مقام زہد و ورع کے منافی نہیں۔ اس لیے کہ اس کا تعلق قلب کے اسلوبِ فہم و سلوک سے ہے۔ اگر دنیا اور اس کے علائق سے دل آلودہ نہیں اور توجہ و التفات کا مرکز صرف ذاتِ حق ہے تو جو چاہو پہنو، اور جو چاہو کھاؤ، کوئی مضائقہ نہیں۔

ح ن ف

حَنَفٌ : گمراہی اور ضلالت کو ترک کر کے توحید کی طرف مائل ہونا۔ یہ لفظ جَنَفٌ کا عکس ہے جس کے معنی گمراہی کی جانب جھکنے کے ہیں۔

تَحَنَّفَ : اس نے توحید میں استقامت کی راہ اختیار کی۔ حنفی ہو گیا۔ کہا جاتا ہے:

تحنف الشافعی : اس نے شافعیت چھوڑ کر حنفیت اختیار کر لی۔

حَنِيْفٌ : مسلکِ توحید پر گامزن، شرک و بدعات سے انحراف اختیار کرنے والا۔ راغب کے نزدیک عرب ہر اس شخص کو حنیف کہتے تھے جو حج کرے، ختنے کا

قائل ہو اور بت پرستی سے مجتنب ہو۔

قرآن حکیم میں ہے:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ط (آل عمران: ۶۷)

[ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ راہ راست والے مسلم تھے]۔

اسلام سے کچھ پہلے عربوں کے ایک گروہ نے اس حقیقت کو پہچان لیا تھا کہ خدا ایک ہے۔ یہ گروہ اوثان و اصنام کی پوجا سے بے نیاز ہو چکا تھا اور سیدھی سادی توحید کی راہ پر گام فرسا تھا۔ اس گروہ کو اصطلاح میں حنفاء کہا جاتا تھا۔ یعنی ایسے حضرات جنھوں نے شرک کی نحوستوں کو ترک کر کے توحید کی برکات کو پا لیا۔ یہ لوگ اپنے کو حضرت ابراہیم کے پیروکار خیال کرتے تھے۔

قُس بن ساعدہ، زید بن عمرو بن نفیل، امیہ بن ابی الصلت، سوید بن عامر، وکیع بن سلمہ، زہیر بن ابی سلمیٰ اور ورقہ بن نوفل کا تعلق اسی جماعت حنفا سے تھا۔

مستشرقین نے بالعموم اور دلہازن نے بالخصوص حسب عادت اس مسئلے میں خواہ مخواہ الجھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسی نے کہا کہ لفظ حنیف ارمی ہے، کسی نے کہا عبرانی الاصل ہے۔ یہ نام نہاد محققین کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اس کا تعلق عیسائیوں کے ایک گروہ سے تھا، حالانکہ ایک تو یہ لفظ اپنے تمام مشتقات کے ساتھ عربی میں مستعمل اور شائع و ذائع ہے، دوسرے قرآن واضح طور پر حضرت ابراہیم کی حنیفیت کے بارے میں کہہ رہا ہے کہ اس کا کوئی تعلق یہودیت و نصرانیت سے نہ تھا یعنی حضرت ابراہیم کا سیدھا سادا مذہب توحید تھا۔

قرآن میں اس وضاحت کی اس لیے ضرورت پیش آئی کہ یہودی اور عیسائی دونوں اس بات کے مدعی تھے کہ وہی حضرت ابراہیم کی تعلیمات کے صحیح معنوں میں وارث ہیں۔ آنحضرت یا مسلمان نہیں۔ اس آیت میں ان کے اس ادعا کی یہ کہہ کر قلعی کھولی گئی ہے کہ تمھاری ان سے کیا نسبت، وہ تو جادۂ توحید کے راہ رو اور اسلام کے مبلغ و داعی تھے اور تم شرک کے حامی و مددگار۔

ح ن ک

اَلْحَنَکُ : تالو، ٹھوڑی۔

حَنَکُ الغراب : کوّے کی چونچ۔

اَلْحَانِکُ : سیاہ۔

اَلْحُنُکُ : تجربہ کار۔

اَلْمُحَنَّکُ : تجربہ کار گھاگ۔

حَنَکَ الشی : سمجھا۔

اِحْتَنَکَ : گھوڑے کے منہ میں رسی دینا، کسی کو اپنے بس میں کر لینا۔ اِحْتَنَکَ الجراد الارض : مکڑی سب کچھ کھا گئی، چٹ کر گئی۔ ابن فارس نے اسی سے کسی چیز پر پوری طرح قابض اور مسلط ہونے کے معنی اخذ کیے ہیں۔

حَنَّکَہُ الدھر : اس کو زمانے نے تجربہ کار بنا دیا۔

قرآن حکیم میں ہے :

لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا ○ (بنی اسرائیل : ۶۲)

[تو میں اس کی ساری اولاد کو اپنے بس میں کر لوں گا بجز ایک قدر قلیل گروہ کے]۔

انسان کی کمزوری یہ ہے کہ یہ اپنے فیصلوں میں عقل و خرد کے تقاضوں اور دینی و اخلاقی پیمانوں کو ملحوظ و مرعی رکھنے کے بجائے ادنیٰ خواہشات اور جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ یہ جذبات اور خواہشات اس پر اس درجہ قبضہ و استیلا حاصل کر لیتے ہیں کہ عقل و فکر یا دین و اخلاق کی لطیف راہ نمائی اس کے مقابلے میں قطعی بے بس اور کمزور ہو کر رہ جاتی ہے۔ شیطان انسانی نفسیات کے اس کمزور پہلو سے آگاہ ہے، اسی لیے وہ پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ میں ذریت آدم کو بہکا کر رہوں گا۔ لیکن کچھ لوگ جو اگرچہ اقلیت میں ہیں ایسے ضرور ہیں جو ہزار کوشش کے باوجود شیطان کے قابو میں آنے والے نہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کو قرآن "عبادنا" کہہ کر پکارتا ہے، جن

کے سوچنے اور عمل کرنے کا انداز دوسروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہ خواہشات جذبات کے ریلے میں بہہ جانے کے بجائے یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کیا چاہتی ہے، عقل کا کیا تقاضا ہے۔ نیز عبد اور بندے کا جو نازک اور حیات آفرین تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، وہ کس بات کا مقتضی ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جن پر شیطان کا قابو چلنے والا نہیں۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ (بنی اسرائیل : ٦٥)

[بے شک میرے جو خاص بندے ہیں ان پر تیرا ذرا قابو نہ چلے گا]۔

ح ن ن

حَنَّ الی وطنہٖ : وطن کی محبت وشوق میں تحریک ہوئی۔ وطن لوٹنے کے لیے اشتیاق کا اظہار کیا۔ بعض لغت نگاروں نے اظہارِ شوق میں اس آواز کو بھی شامل کیا ہے جو ترحم واشتیاق پر دلالت کناں ہو۔

حنین : وہ آواز جس سے محبت واشتیاق کا اظہار ہو۔

حَنَانٌ : قلب کا گداز، رقت اور رحمت۔ کہا جاتا ہے :

حنانیك یارب

یا اللہ اپنی رحمتوں سے مجھے بہرہ مند کر۔

تَحَانَّ : مشتاق ہونا۔

حَانَّةٌ : اونٹنی۔ کہا جاتا ہے :

مالہ حانّۃٌ ولا آنّۃٌ۔

اس کے پاس نہ اونٹنی ہے نہ بکری۔ یعنی وہ مفلس ہے۔

حنَانٌ : واضح طریق۔ ابن فارس کا کہنا ہے کہ اس میں اشتقاقی معنی ملحوظ نہیں رکھا گیا، لیکن زمخشری نے تصریح کی ہے کہ اس میں اشتقاقی معنی ملحوظ رکھا گیا ہے، کیونکہ اس کے معنی ایسے راستے کے ہیں جہاں اونٹنیاں اور بکریاں آتے جاتے وطن سے دوری کی وجہ سے اپنی بے قراری کا اظہار کریں۔ قرآن حکیم میں ہے :

وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ط (مریم : ۱۲)

[اور خاص اپنے پاس سے رقتِ قلب اور پاکیزگی]۔

حضرت یحییٰ کے بارے میں ہے کہ ہم نے جہاں انھیں تمام ان اوصاف سے نوازا جن کا ہونا ایک پیغمبر کے لیے ضروری ہے، وہاں خصوصیت سے انھیں رقتِ قلب اور گداز کی نعمت بھی عطا کی۔ حضرت زکریا کے لیے اس خوش خبری میں تسکین کا یہ پہلو پایا جاتا ہے کہ بڑھاپے میں آپ کو جب کہ آپ قریب قریب مایوس ہو چکے تھے، ایسا فرزندِ ارجمند دیا جاتا ہے، جو نہ صرف نبوت و رسالت کی روایت کو زندہ و تابندہ رکھے گا بلکہ آپ کے حق میں حد درجہ شفیق و مہربان ہوگا اور بڑھاپے میں آپ کے لیے قابلِ اعتماد سہارا ثابت ہوگا۔

" حنان " کے لفظ میں ایک لطیف اشارہ یہ بھی ہے کہ حضرت یحییٰ کے دل میں ایک طرح کی بے قراری اور تڑپ، اللہ تعالیٰ سے ملنے، اس کا قرب چاہنے اور اپنے اصلی وطن یعنی عالم روحی کی طرف لوٹ جانے کی بھی پائی جاتی تھی اور یہی ہر صاحبِ دل کا اصلی وطن ہے : ع

منزلِ ما کبریا است

ح و ب

حَوْبٌ : گناہ۔ حدیث میں ہے :

اللھم اغفر لی حَوْبَتِی

خدایا میرا گناہ معاف کر۔

حَوْبَةٌ : ماں کی طرف سے قرابت۔ حرمت و اعزاز کے معنی میں بھی آتا ہے۔ کہا جاتا ہے:

فعلت کذا بحوبۃ فلان : میں نے فلاں کی حرمت و عزت کے پیشِ نظر ایسا کیا۔

حُوْبٌ : گناہ، غم، وحشت۔

در اصل حوب ایسے گناہ کو کہتے ہیں جس کا تعلق کسی شخص کی حق تلفی سے ہو۔ حدیث

میں آتا ہے کہ ابو ایوب نے جب اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہی تو آنحضرت نے فرمایا: ان طلاق ام ایوب لحُوبٌ: کہ ام ایوب کو طلاق دینا حوب ہے یعنی ان کی حق تلفی ہے۔

حَابَ : گناہ کا ارتکاب کیا، گناہ گار ہوا۔

یَتَحَوَّبُ من الاثم : گناہ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَلَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَهُمْ إِلَىٰٓ أَمْوَٰلِكُمْ ۚ إِنَّهُۥ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ﴿النساء: ۲﴾

[اور ان کا مال مت کھاؤ اپنے مال کے ساتھ، بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے]۔

قرآن حکیم نے ہر نوع کے استحصال و ظلم سے روکا ہے بالخصوص "یتٰمیٰ" کا استحصال تو اس کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے کیونکہ یہ بے چارے اس قابل کہاں ہوتے ہیں کہ آپ اپنے اموال کی دیکھ بھال کر سکیں۔ لامحالہ ان کو انہی نگران حضرات کی دیانت و ایمان پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو از روئے وصیت نگران قرار پاتے ہیں یا جن کو برادری یا ورثا نگران تسلیم کر لیتے ہیں۔ بچوں کی بے چارگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مال دار بن جانے کی کوشش کرنا ان کی حق تلفی ہی نہیں پرلے درجہ کی سنگ دلی اور شقاوت قلبی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت نے جن سات چیزوں کو "موبقات" یا مہلکاتِ ایمان و عمل قرار دیا ہے ان میں ایک یتٰمیٰ کے مال میں ناجائز تصرف بھی ہے۔

ح و ت

حُوْتٌ : ابن فارس نے اس کے معنی تڑپنے اور مضطرب ہونے یا دھوکا دینے کے کیے ہیں۔ مچھلی کی بے قراری اور تڑپ کہ شکاری کے جال سے نکل جانے کی وجہ سے اسے حوت کہتے ہیں۔ راغب نے اس کے معنی بڑی مچھلی کے کیے ہیں۔ بعض نے حوت کے معنی موج بحر کے بھی بیان کیے ہیں۔

حَاوَتَ : دھوکہ دیا۔ مکر و فریب سے کام لیا۔

حَاتَ الطیر : پرندہ منڈلایا۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ مُلِيمٌ ٥ (الصّٰفّٰت : ۱۴۲)

[انھیں مچھلی نے نگل لیا درآں حالیکہ وہ اپنے کو ملامت کر رہے تھے]۔

حضرت یونس کا قصہ ہے، ان کے نسب سے متعلق صرف اس قدر معلوم ہے کہ ان کے والد کا نام متّیٰ ہے۔ اہلِ نینویٰ نے جب کفر و شرک پر اصرار کیا اور اللہ تعالیٰ کی توحید سے انحراف کر کے طرح طرح کے توہمات کا شکار ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح و راہ نمائی کے لیے حضرت یونس کو مبعوث فرمایا۔ ان کا عہد ۸۰۰ قبل مسیح سے تعلق رکھتا ہے جب کہ اشوریوں کا اقتدار عروج پر تھا۔ نینویٰ عراق کا مشہور شہر تھا جس کی آبادی قرآن کی رو سے ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ یہ تہذیب و تمدن کا قدیم گہوارہ تھا۔

حضرت یونس نے ہر چند اس قوم کو توحید کی سیدھی راہ دکھائی لیکن ان کو نہ ماننا تھا نہ مانے۔ معاملہ ضد اور ہٹ تک جا پہنچا، اس پر حضرت یونس نے قوم کو بد عا دی اور کہا کہ عذاب الٰہی تمھاری تاک میں ہے اور خود نینویٰ سے غصے کی حالت میں نکل کھڑے ہوئے، جیسا کہ قرآن میں واضح طور پر مرقوم ہے۔ دریائے فرات کے قریب پہنچے، تو ایک کشتی کو اپنا منتظر پایا، چنانچہ آپ اس پر سوار ہو گئے۔ راستے میں طوفان نے آگھیرا جس سے کشتی ڈگمگانے لگی۔ کشتی میں سوار لوگوں کو از راہِ توہم خیال ہوا کہ آج اس کشتی میں ضرور کسی غلام نے اپنے آقا سے بھاگ کر پناہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ قرعہ اندازی ہوئی اور تین بار حضرت یونس کے نام پر قرعہ نکلا۔ کشتی میں سوار لوگوں نے بدرجہ مجبوری ان کو دریا میں پھینک دیا، ان کا دریا میں گرنا تھا کہ ایک بہت بڑی مچھلی نے انھیں نگل لیا۔ حضرت یونس نے اس پر دعا کی جو قبول ہوئی اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی عنایت و کرم سے انھوں نے مچھلی کی گرفت سے نجات پائی۔ یہ مچھلی کیسی تھی، اس کی سائنسی تفصیل کے لیے ہم اپنے فاضل و محقق دوست سید شبیر محمد سابق ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل پروجیکٹس کے مقالے کو اس کی افادیت و معقولیت کے پیش نظر بجنسہٖ نقل کر دینے پر اکتفا کریں گے۔

لفظ حوت قرآن پاک میں تین مقامات پر آیا ہے۔ اوّل سورہ کہف میں جہاں

اس سے مراد عام مچھلی ہے جس سے حضرت موسیٰ اور ان کے خادم ناشتہ کرنا چاہتے تھے جب وہ حضرت خضر کی تلاش میں نکلے تھے۔ باقی دو مقامات پر "حوت" کا ذکر حضرت یونس کے ضمن میں آیا ہے یعنی سورۃ الصافات اور سورہ القلم میں۔ ان میں سے اول الذکر میں یہ مذکور ہے کہ "حوت" نے حضرت یونس کو نگل لیا۔ لیکن دوسری جگہ حضرت یونس کا ذکر ان کے لقب "صاحب الحوت" سے کیا گیا ہے، جس طرح سورہ الانبیا میں انہیں "ذوالنون" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ گویا "حوت" اور "نون" دونوں ہم معنی ہیں۔ ان کا اطلاق ایک کوہ پیکر آبی جانور پر ہوتا ہے جو سمندروں، دریاؤں اور جھیلوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ہر قسم کی جسامت اکثر دوسری اقسام کی جسامت سے مختلف ہوتی ہے۔ "حوت" کو ہمارے بعض قدیم علما نے "دابۃ" لکھا ہے۔

علم الحیوانات کے ماہرین کے مطابق اسے مچھلی کہنا غلط ہے کیونکہ مچھلی بچے نہیں جنتی بلکہ انڈے دیتی ہے جن سے بچے نکلتے ہیں۔ حالانکہ "حوت" بچے جنتی ہے اور ان کی پرورش اپنے دودھ سے کرتی ہے جو نہایت گاڑھا اور مقوی ہوتا ہے۔ وہیل کے نوزائیدہ بچے کی لمبائی بیس فٹ سے زیادہ ہوتی ہے اور وہ ایک ٹن کے قریب روزانہ دودھ پیتا ہے۔ جس قسم کی وہیل نے حضرت یونس کو نگلا تھا اُسے "Sperm whale" کہتے ہیں جس کا نام ہمارے متقدمین نے "عنبر" لکھا ہے۔ "عنبر" یا "Ambergins" اسی کی انتڑیوں سے نکالا جاتا ہے۔ اس وہیل کی لمبائی ساٹھ ستر فٹ سے لے کر سو سوا سو فٹ تک ہوتی ہے اور اس کا وزن ۱۰۰ سے ۱۵۰ ٹن تک ہوتا ہے۔ اس کے سر کا حصہ اس کے کل جسم کی لمبائی کے $\frac{1}{3}$ سے لے کر $\frac{1}{2}$ تک ہوتا ہے۔ ایک تجربہ کار شکاری نے ایک ایسی وہیل کا جبڑا ۱۹' لمبا پایا۔ پانی میں تیرتے ہوئے یہ وہیل اپنا منہ کھلا رکھتی ہے اور جو جانور یا جان دار بھی اس کے سامنے آتا ہے وہ اس کے کھلے ہوئے منہ کے راستے سیدھا اس کے حلق میں اُتر جاتا ہے۔ بعد میں یہ شکار اس کے پیٹ کے متعدد خانوں میں سے گزر کر بہت دیر بعد ہضم ہوتا ہے۔ اس کے صرف نچلے جبڑے میں فاصلے فاصلے

پر دانت ہوتے ہیں جن سے یہ کاٹ کر چبانے کا کام نہیں لے سکتی۔ البتہ ان کی مدد سے بعض اوقات اپنے بڑے شکار کے ٹکڑے کر لیتی ہے۔ ایک ماہر شکاری نے ایک دفعہ ایک ۱۷ فٹ لمبی شارک مچھلی جسے ایک وہیل نے سالم ہڑپ کر لیا تھا اس کے پیٹ میں پائی۔

وہیل کے ایک تجربہ کار شکاری نے جس کا نام Frank T. Bullen تھا اپنی عمر کا بیشتر حصہ دنیا کے مختلف سمندروں میں Cachalot نامی وہیل پکڑنے والے جہاز پر گزارا۔ اس نے ایک مشہور کتاب لکھی جس کا نام Cruise of The cachalot تھا، اس میں اس نے اپنے تجربات اور مشاہدات لکھتے ہوئے اس قسم کی وہیل کی بعض خصوصیات کا خاص طور پر تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ جب اس قسم کی وہیل قریب المرگ ہوتی ہے تو اپنے حلق سے نیچے اتری ہوئی تازہ خوراک کو اپنے منہ سے اُگل کر باہر پھینک دیتی ہے، اور اس نے ایک دفعہ ایک حیرت انگیز ضخیم چیز سطح سمندر پر تیرتی دیکھی جس کی جسامت ۸´ × ۶´ × ۶´ تھی۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ یہ ایک بڑی Cuttle Fish کا ٹکڑا تھا جسے وہیل نے شکار کر کے کاٹ کے نگل لیا تھا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد اپنی موت سے قبل اسے باہر اُگل پھینکا تھا۔ اس قسم کی وہیل پورے انسان کو آسانی کے ساتھ نگل سکتی ہے اور اسی طرح موت سے کچھ دیر پہلے اُسے اُگل کر باہر پھینک سکتی ہے۔

عام مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض اوقات سمندر، دریا یا جھیل میں مدوجزر آتا رہتا ہے۔ جب پانی چڑھاؤ پر ہوتا ہے تو اکثر طوفانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد جب اُتار پر آتا ہے تو اکثر آناً فاناً اتنی تیزی سے اُترتا ہے کہ اپنے اندر کی اکثر اشیا کو ساحل پر چھوڑ جاتا ہے۔ کئی دفعہ اسی طرح ساحل پر وہیل مچھلی پائی گئی ہے۔ ایسے حالات میں وہیل مچھلی اپنے ہی عظیم بوجھ کو چونکہ سہار نہیں سکتی اس لیے اس کی چھاتی کی ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور اس کے پھیپھڑے پچک جاتے ہیں اور وہیل آہستہ آہستہ

مرجاتی ہے اور مرتے وقت تازہ کھائی ہوئی خوراک باہر اُگل پھینکتی ہے۔

فرانس کے ایک رسالہ Journal des Debats مجریہ ۱۴ مارچ ۱۸۹۸ میں وہیل کے ایک شکاری جیمز بارٹلے Jems Bartley کا قصہ شائع ہوا تھا جو وہیل کا شکار کرنے والے جہاز STon of The East پر ملازم تھا۔ فاک لینڈ کے جزیرے کے قریب اس جہاز کے عملے نے ایک وہیل دیکھی جسے شکار کرنے کے لیے ایک کشتی سمندر میں اُتاری جسے چپوؤں سے بارٹلے چلا رہا تھا۔ جب وہیل سے شدید مقابلہ ہوا تو کشتی دو ٹکڑے ہو گئی۔ بارٹلے سمندر میں گر کر وہیل کے حلق میں چلا گیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد یہ وہیل ماری گئی۔ اگلے روز جب اس کا پیٹ چاک کیا گیا تو اس میں سے بے ہوشی کے عالم میں بارٹلے زندہ نکلا۔ فوری علاج معالجہ، دیکھ بھال اور آرام کے بعد بارٹلے تندرست ہو گیا۔ گو وہیل کے پیٹ کے اندر کی تیزابی رطوبتوں سے اس کی جلد متاثر ہوئی جو اپنا اصلی رنگ کھو بیٹھی۔ معلوم ہوتا ہے حضرت یونس کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ یکایک طوفان اٹھا۔ کشتی یا جہاز والوں نے قرعہ ڈالنے کے بعد حضرت یونس کو پانی میں اٹھا پھینکا۔ وہاں وہیل نے انھیں ہڑپ کر لیا۔ پھر آناً فاناً طوفان ٹل گیا اور وہیل ساحل پر رہ گئی جس نے مرتے دم انھیں باہر اُگل پھینکا اور وہیل کے پیٹ کے پہلے ہی حصے میں کچھ دیر رہنے سے اس کے پیٹ کی رطوبتوں کے کیمیائی عمل سے ان کی جلد متاثر ہوئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے وہ صحت یاب ہو گئے۔ ان کی رہائی اور صحت یابی بالیقین ایک معجزہ تھی جو ان کی مشہور دعا "أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحٰنَكَ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا۔

ہمارے بعض جدید مفسرین نے متذکرہ معجزے کا انکار کیا ہے جو صحیح نہیں۔

یہاں یہ بیان کرنا مناسب ہو گا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں غزوہ سیف البحر کے ضمن میں جو احادیث نقل ہوئی ہیں ان میں "حوت" اور "دابۃ" کا ذکر آیا ہے جس کی جسامت کے پیش نظر اسے ایک بہت بڑے ٹیلے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کا نام "عنبر"

لکھا گیا ہے۔ اس کوہ پیکر آبی جانور کا گوشت تین سو غازیوں نے جو بھوک کے مارے بے حال ہو گئے تھے ۱۸ دن تک سیر ہو ہو کر کھایا اور اس کی چربی Blubber سے اپنے نحیف و نزار جسموں پر کئی روز مالش کی جس کے نتیجے میں ان کے جسم تر و تازہ اور تندرست و توانا ہو گئے۔ ان احادیث کے مطابق اس کا کچھ گوشت جو بچ رہا تھا وہ لشکر کے چند غازی اپنے ساتھ واپس مدینہ منورہ لے گئے اور آنحضرتؐ نے بھی اُسے کھایا۔ اس وہیل کے قد و قامت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ سالارِ لشکر ابو عبیدہ بن جراحؓ نے اس کی ایک پسلی (یا دو پسلیوں) کو زمین میں گڑوا کر ایک طویل القامت غازی کو حکم دیا کہ وہ ایک اونچے سے اونچے اونٹ پر سوار ہو کر اس کے نیچے سے گزرے۔ چنانچہ وہ نہایت آسانی سے اس کے نیچے سے گزر گیا۔

ح و ج

حَاجَۃٌ : ارمان، رشک، احتیاج۔ مطلوب کی احتیاج۔ جمع حاجات و حوائج۔ ضرورت۔ کہا جاتا ہے:

ھٰذِہٖ حاجتی : یہ میری ضرورت ہے۔ یہ وہ شے ہے جو مجھے چاہیے۔

حَوْجَاءُ : ضرورت، احتیاج۔ کہا جاتا ہے:

لیس لی عندہ حوجاء ولا لَوْجَاء

مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے اس سے ملنے کی نہ حاجت ہے نہ ضرورت۔

اَلحَوْجُ : فقر۔

حَاجَ : محتاج ہونا۔

اِحْتَاجَ : محتاج ہونا۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

اِلَّا حَاجَۃً فِیۡ نَفۡسِ یَعۡقُوۡبَ قَضٰھَا ؕ (یوسف: ۶۸)

[وہ تو ایک ارمان تھا یعقوب کے دل میں جو انھوں نے پورا کیا]۔

حضرت یعقوب جب اپنے بیٹوں کو مصر بھیجنے پر آمادہ ہوگئے تو ازراہِ احتیاط ان کو یہ بھی نصیحت کی کہ تم سب بھائی ایک ہی دروازے سے شہر میں داخل نہ ہونا، مبادا لوگوں کی حاسدانہ نظریں تم پر پڑیں اور تمھیں کوئی گزند پہنچ جائے۔ مقصد یہ نہ تھا کہ قضا و قدر میں جو مقدر ہے وہ اس طرح ٹل جائے۔ یہ محض ایک ہمدردانہ احتیاط، ایک شفیق باپ کی نصیحت اور نیک خواہش تھی جس کو حضرت یعقوب نے یہ کہہ کر پورا کیا۔ ورنہ جہاں تک عقیدہ و ایمان کا تعلق ہے، اس کی وضاحت آیت کے اس حصے سے پوری طرح ہوجاتی ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ (یوسف ۶۷)

[اختیار تو بس اللہ ہی کا ہے اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیے بھروسہ رکھنے والوں کو]۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا (الحشر: ۹)

[اور اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں جو انھیں ملتا ہے]

سباقِ کلام، تقسیم اموالِ فیٔ سے متعلق ہے۔ غرض یہ ہے کہ جہاں مہاجرین اس کے مستحق ہیں وہاں ان انصار کا بھی اس میں حصہ ہے جنھوں نے پہلے سے مدینہ کو اپنا مستقر ٹھہرا رکھا ہے۔ انصار کے مناقب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کا دل رشک و حسد کے ادنیٰ جذبات سے پاک ہے، ان کے ایثار کا یہ عالم ہے کہ یہ دوسروں کے بارے میں انتہا درجہ کے ایثار سے کام لیتے ہیں اور ہر طرح ان کو اپنے سے مقدم جانتے ہیں، اگرچہ خود فاقے ہی سے ہوں۔

ح و ذ

حَاذَ : ہانکا، تیز دوڑایا، قابو میں رکھا، چھا گیا۔

حَاذَ الابل الی المَاء۔

اونٹ کو پانی کی طرف ہنکا کرلے گیا۔

اِسْتَحْوَذَ : مستولی ہوگیا، مسلّط ہوگیا۔

حُوْذِیٌّ : کوچوان

اَحْوَذِیٌّ : عقل مند اور دانش ور، وہ شخص جو انتہا درجے کا معاملہ فہم ہو اور ہر امر میں ماہرانہ فیصلہ صادر کرنے پر قادر ہو۔

قرآن حکیم میں ہے :

اِسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِکْرَ اللّٰهِ ط (المجادلہ : ۱۹)

[ان پر شیطان چھا گیا سو اس نے انھیں اللہ کی یاد بھلا دی] ۔

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کو، اس کی تعلیمات کو اور ان روحانی و اخلاقی اقدار کو بھول بیٹھے جن کی انبیا کے ذریعے بار بار تلقین کی گئی تھی اور اب جہنم میں عذابِ الٰہی کا مزہ چکھ رہے ہیں۔

کسی شخص یا قوم پر شیطان اس وقت تسلط جما لیتا ہے جب یہ شخص یا قوم اللہ کی یاد سے غافل ہو جائے ۔ دین اور دینی اعمال سے غفلت برتنے لگے ۔ حقوق اللہ اور حقوق انسانی سے کوئی دلچسپی نہ رکھے اور کھلے بندوں مداہنت اور نفاق کا شکار ہو جائے۔ اللہ کی یاد بھلا دینا دراصل روزمرہ کی زندگی میں اس نظامِ حیات سے روگرداں ہو جانا ہے جو انسان کی روحانی و اُخروی فلاح و کامرانی کے لیے اللہ نے تجویز کیا ہے اور انبیا علیہم السلام نے ہر دور میں جس کی پیروی پر زور دیا ہے۔

ح و ر

اَلْحَوَرُ : ابنِ فارس نے اس کو تین مختلف معانی پر محمول کیا ہے : سپیدی، لوٹنا اور گھومنا ۔ اس کا تعلق اگر آنکھ سے ہو تو اس کے معنی شدتِ بیاض کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ حُوْرُ الْعُیُوْنِ ان عورتوں کو کہتے ہیں جن کی آنکھ کی سفیدی بہت نمایاں ہو۔ اصمعی کے نزدیک اس کے معنی ایسی عورتوں کے ہیں جو گورے رنگ کی ہوں، آنکھ کی سپیدی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔

حَوَّرْتُ الثِّیَابَ : میں نے کپڑوں کو دھو کر اجلا کر دیا۔

اَلْحَوَارِیُّوْن : حضرت مسیح کے رفقا اور انصار۔ انھیں حواری یا تو اس مناسبت سے کہا گیا ہے کہ ان میں اکثر دھوبی اور مچھیرے تھے جو مچھلی کا شکار کرتے تھے اور یا اس بنا پر کہ ان کے دل شفاف اور اُجلے تھے۔

لفظ حواری عربی الاصل ہے، آرامی اور حبشی الاصل نہیں جیسا کہ بعض مستشرقین نے سمجھا ہے۔

آنحضرتؐ نے حضرت زبیر کو اپنا حواری کہا ہے یعنی مددگار اور ناصر۔

حَارَ : لوٹا، حیران ہوا، دھویا، مندا پڑ گیا، شکار کیا۔ کہا جاتا ہے:

الحور بعد الکور: زیادتی کے بعد مندا پڑ گیا۔ کور فراوانی اور حور کمی یا مندا۔

حَاوَرَ : باہمی گفتگو کرنا۔

اَلْحَارَۃُ : گول چوک، محلّہ۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

اِنَّہٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ ۚ (الانشقاق: ۱۴)

[اس نے خیال کر رکھا تھا کہ اُسے لوٹنا نہیں ہے]۔

مشرکینِ مکّہ میں سے اکثر لوگ اُخروی زندگی کے منکر تھے اور نہیں سمجھتے تھے کہ انھیں مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش ہونا ہے۔ یہ دنیا کی عارضی شادمانیوں میں اس طرح مگن اور منہمک رہے کہ احوالِ حشر کا کبھی خیال تک نہیں آیا۔ ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب اِن کا نامۂ اعمال ان کو بائیں ہاتھ میں تھما دیا جائے گا اور انھیں اپنا انجام صاف نظر آ رہا ہوگا۔

کتبِ تاریخ و روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انکارِ آخرت کا عقیدہ عربوں میں دراصل زنادقہ کی وجہ سے پھیلا جو مجوسیت کے رواج سے عربوں میں پیدا ہو گئے تھے۔ یہ لوگ بقاءِ دہر کے قائل تھے۔ قرآن حکیم میں ہے:

قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ (الصف: ۱۴)

[حواری بولے ہم مددگار ہوتے ہیں اللہ کے]

حضرت مسیح نے جب محسوس کیا کہ یہودیوں کے نفاق، ریاکاری اور لفظ پرستی کے خلاف ان کا کلمۂ حق بہت سے لوگوں کو ناگوار گزرا ہے، اور اس وجہ سے بنی اسرائیل میں ان کی شدید مخالفت ہورہی ہے تو انھوں نے اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ حق و باطل کے اس معرکے میں کون مجھ سے تعاون کرتا ہے۔ حواریوں نے یک زبان ہوکر کہا ہم اس معرکہ آرائی میں آپ کے شریک و معاون ہیں، اس لیے کہ یہ جنگ آپ کے خلاف نہیں اللہ کے خلاف ہے۔ اس بنا پر ہم کھلے بندوں ان لوگوں میں سے ہونا پسند کرتے ہیں جو اللہ اور اس کے دین کی نصرت و مدد کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے:

كَذٰلِكَ قف وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝ (الدخان: ۵۴)

[بات اسی طرح ہے اور ہم ان کی زوجیت میں دیں گے گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں کو]۔

یعنی وہ مقامِ امین یا جنت جو اہلِ ایمان کا مسکن بنے گا جسم و روح کی تمام لذتوں سے مالامال ہوگا اور اس میں بہیمیت و نشاط کے ان تمام تقاضوں کی تکمیل کی جائے گی جن کے حصول کے لیے انسان اس دنیا میں پریشان رہتا ہے۔ لیکن جسم اور اس کے لذائذ کا جو تصور اس دنیا میں ہے ضروری نہیں کہ وہاں بھی اجسام کا یہی تصور ہو۔ قرآن ہی میں ہے کہ ان کوائف کا کسی کو بھی صحیح صحیح علم نہیں، جن کا ظہور وہاں ہوگا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ج (السجدہ: ۱۷)

[سو کسی کو علم نہیں جو جو سامان آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لیے خزانۂ غیب میں مخفی ہے]

ح و ط

حَاطَ: گھیر لیا، نگہبانی کی۔

اَحَاطَ: احاطہ کرلیا۔ گھیرے میں لے لیا۔ کہا جاتا ہے:

اَحَاطَ بِہٖ علما: اس کو پوری طرح جان گیا، اس کو پوری طرح علم کے دائرے میں لے آیا حتی کہ اس کا کوئی گوشہ نظر و فکر سے اوجھل نہ رہا۔

اُحِیطَ بفلان: وہ مارا گیا، ہلاک ہوا، یعنی اسباب ہلاکت نے اسے چاروں طرف

سے گھیر لیا۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

وَ اُحِیۡطَ بِثَمَرِہٖ (الکہف: ۴۲)

[اور اس کی دولت کو آفت نے گھیر لیا، یعنی تباہ کر دیا]۔

وَقَعُوْا اُخْتِیَّ تَحِیْطَ: وہ ایسے سال سے دوچار ہوئے جو تباہ کن ثابت ہوا۔

اَلْحَائِطُ: دیوار: باغ جس کے گرداگرد وہ دیوار ہو جو باغ کو اپنے آغوش میں لے لے۔

اَلْحِیْطَۃُ وَ الْحَیْطَۃُ: احتیاط۔

قرآن حکیم میں ہے:

اَلَاۤ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ ۝ (حمٓ السجدہ: ۵۴)

[وہ ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے]۔

مخاطب گروہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے دائرۂ علم کی وسعتوں کا منکر ہے، اور نہیں جانتا کہ اس کی ذات ستودہ صفات ہمہ دانی و ہمہ بینی کی صفات سے پوری طرح اتصاف پذیر ہے۔ اس کے علم و عمل کی کوئی گمراہی ایسی نہیں جس کو وہ نہ جانتا ہو۔

علامہ راغب نے یہاں محیط کے معنی نگران اور نگہبان کے کیے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیۡطَۃٌۢ بِالۡکٰفِرِیۡنَ ۝ (التوبہ: ۴۹)

[بے شک دوزخ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے]۔

دوزخ کی ایک شکل تو وہ ہے جس کا سامنا حساب کتاب کے بعد ہوگا اور ایک وہ روحانی اور ذہنی کرب ہیں جو مکافاتِ عمل کی صورت میں ہر آن انسان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ منکرینِ اسلام یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ وہ کفر و طغیان کے باوجود امن میں ہیں اور انھیں ہر طرح کی آسائش حاصل ہے۔ اس لیے کہ صحیح دین کو تسلیم کیے بغیر اور اقدارِ حیات کو شخصیت کا جزو بنائے بنا انسان ایسے تضادات سے دوچار رہتا ہے جن کی اذیتیں جہنم سے کم تکلیف دہ نہیں ہوتیں۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ۝ (الکہف : ۶۸)

[اور بھلا ایسے امور پر آپ کیسے صبر کریں گے جو آپ کے احاطۂ واقفیت سے باہر ہیں]۔

یہ قول حضرت خضر کا ہے اور مخاطب حضرت موسیٰ ہیں ۔ دونوں کا دائرۂ علم و ادراک مختلف ہے ۔ حضرت موسیٰ رموزِ شریعت کے پاسبان ہیں اور حضرت خضر اسرارِ کونیہ کے شناسا ۔ تدبیر اور توفیقِ ایزدی سے دونوں کی ایک سفر میں ملاقات ہوئی ۔ حضرت خضر نے بعض معاملات میں جب ایسی آرا کا اظہار کیا جو بظاہر شریعت کے خلاف تھیں تو حضرت موسیٰ ازراہِ غیرتِ دینی اس پر چونکے ، لیکن حضرت خضر نے جب اصل وجہ بیان کی تو حضرت موسیٰ نے اطمینان کا اظہار کیا ۔ ان کرشموں کو دیکھ کر جن کا اظہار دورانِ سفر حضرت خضر کی طرف سے ہوا تھا ، حضرت موسیٰ کے دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ وہ بھی اس علم سے بہرہ ور ہوں تاکہ اسرارِ کونیہ اور اسرارِ شرع میں تطبیق دی جا سکے ۔ حضرت خضر نے یہ کہہ کر اس راہ کی مشکلات سے انھیں آگاہ کیا کہ جن باتوں کو آپ نہیں جانتے ان کو آپ برداشت کیسے کر سکیں گے ۔

یہاں یہ بات خصوصیت سے جاننے کی ہے کہ گو حضرت موسیٰ اللہ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں تاہم اسرارِ کونیہ سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے حضرتِ خضر کا تلمذ اختیار کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فقہ و شریعت کا علم ہی علم نہیں ، کائنات کے اسرارِ مخفیہ کو جاننا بھی حصولِ علم کے دائرے میں داخل ہے ۔ نیز اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ پیغمبر اگرچہ دینیات کے لحاظ سے اپنے دور میں اعلم الناس ہوتا ہے تاہم مزید علم کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کو وہ منصبِ نبوت کے منافی خیال نہیں کرتا ۔

ح و ل

حَالَ : بدلنا ، حائل ہونا ، متغیر ہونا ، گزرنا اور پورا ہونا ، کود کر سوار ہونا ۔

حَالَ علیہِ الحول : اس پر پورا ایک سال گزر گیا ۔

حال فی متن فرسہ : اپنے گھوڑے کی پشت پر کود کر سوار ہوا۔
حال لونہ: اس کا رنگ بدل گیا۔
حَوِلَ : بھنگا ہو گیا۔
حُوْل : گرداگرد۔
حَاوَل : قصد کرنا، درپے ہونا، حیلہ و تدبیر سے طلب کرنا۔
اَحْوَلَ الصبیّ: بچہ ایک سال کا ہو گیا۔
تَحَوَّلَ : منتقل ہوا، پھر گیا۔
اَلْحَال : کیفیت، حالت، ہیئت۔
اَلْحَوْلُ : قدرت و توفیق۔ ایک برس یا سال کا عرصہ۔
اَلْحِولُ : ہشیاری، دور بینی، قدرت و تصرف، ہٹنا۔ کہا جاتا ہے:
لا حِوَل عنہ : اس سے ہٹنا ممکن نہیں۔
اَلْمُحَالُ : ناممکن، باطل، ٹیڑھا۔

قرآن حکیم میں ہے:
وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝ (ہود: ۴۳)
[اور دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی، سو وہ ڈوبنے والوں میں ہو گیا]۔

حضرت نوح کے نافرمان بیٹے کا ذکر ہے۔ جب حضرت نوح کی قوم پر طوفان کی شکل میں عذاب آیا اور زمین پانی میں ڈوبنے لگی تو حضرت نوح نے اپنے بیٹے سے ازراہِ شفقتِ پدری کہا کہ کیوں نہ ہمارے ساتھ تم بھی کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اس نے تن کر کہا، اس کی کیا ضرورت ہے، میں پیراکی کے فن میں تاک ہوں، تیرتا ہوا جودی پہاڑ پر پہنچ ہی جاؤں گا۔ لیکن اسے کیا معلوم یہ سیلاب نہیں تھا، عذابِ الٰہی تھا۔ وہ ابھی پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا کہ پانی کا زبردست ریلا آیا اور اس کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (الانفال: ۲۴)

[اور جانتے رہو کہ اللہ آڑ بن جاتا ہے درمیان انسان اور اس کے قلب کے اور تم سب کو اسی کے پاس اکٹھا ہونا ہے]۔

اس سے قبل کی آیت میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ جب تمھیں جہاد کے لیے کہا جائے تو فوراً تیار ہو جاؤ اور صدقِ دل سے بغیر کسی تاخیر کے اس پر آمادہ ہو جاؤ، مبادا نیت بدل جائے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کا آڑ بن جانا یا قلب اور اس کے عزائم میں حائل ہو جانا محض پیرایۂ بیان ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ دل کے حالات و کوائف چونکہ نامعلوم اور مخفی موثرات کے تحت تیزی سے بدلتے رہتے ہیں، اس لیے نیکی اور جہاد کی دعوت پر لبیک کہنے میں لیت و لعل کا اظہار نہ کریں، کیونکہ اس میں یہ خطرہ پنہاں ہے کہ آج جو تمھیں توفیقِ الٰہی سے نیکی اور سعادت سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا ہے کل وہ شاید میسر نہ ہو اور اس طرح تم اپنی اس محرومی پر کفِ افسوس ملتے رہ جاؤ۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ ۚ (البقرہ: ۲۴۰)

[اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، ان پر لازم ہے کہ اپنی بیویوں کے حق میں نفع اٹھانے کی وصیت کر جائیں کہ وہ ایک سال گھر سے نکالی نہ جائیں]۔

زمانۂ جاہلیت میں بیوہ عورتوں کو منحوس سمجھ کر خاوند کے گھر سے نکال دیا جاتا تھا۔ اسلام کا یہ احسان ہے کہ اس نے پہلے تو ان عورتوں کے لیے یہ تحفّظ فراہم کیا کہ وہ اپنے مرحوم شوہر کے گھر ہی میں ایک سال تک قیام کریں۔ پھر ان کے لیے خاوند کے ترکے میں باقاعدہ چوتھایا آٹھواں حصہ مقرر کر دیا تاکہ شوہر کی موت کے بعد وہ کسی کی محتاج نہ رہیں۔ حضرت ابنِ عباس کا کہنا ہے کہ آیتِ میراث کے نزول کے بعد یہ آیت آپ سے آپ منسوخ ہو گئی۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (البقرہ، ۲۳۳)

[اور مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں پورے دو سال]۔

طبِ جدید و قدیم کے محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ ماں کے دودھ کا کوئی صحیح بدل نہیں، اس میں اللہ تعالیٰ نے تمام وہ غذائی اجزا جمع کر دیئے ہیں جو بچوں کے جسمانی و ذہنی نشو و نما کے لیے ضروری ہیں۔ مزید برآں مائیں بچوں کو جب دودھ پلاتی ہیں تو صرف دودھ ہی نہیں پلاتیں بلکہ دودھ کے ساتھ ساتھ محبت و شفقت کے ان دل آویز نقوش کو بھی ان کے قلب و ذہن پر ابھارتی ہیں جو آئندہ چل کر ان میں رشتوں کے احترام اور ان کی پہچان کا سبب بنتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے :

خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ۝ (الکہف : ۱۰۸)

[ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے نہ وہ کہیں اور نکلنا چاہیں گے]۔

اہلِ جنت کا ذکر ہے کہ وہاں ان کو اس طرح ہر آن نوازا جائے گا اور اس طرح مہمان نوازی کی جائے گی کہ ان کے دل یہ چاہیں گے کہ سرور و شادمانی کی یہ کیفیتیں ہمیشہ باقی رہیں۔ نہ انھیں اس فضائے بہجت و کیف سے بے دخل کیا جائے گا اور نہ یہ خود ہی اس سے نکلنا اور ہٹنا پسند کریں گے۔

قرآن حکیم میں ہے :

لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ۝ (النساء: ۹۸)

[کہ کوئی تدبیر ہی کر سکتے ہوں اور نہ کوئی راہ پاتے ہوں]۔

قرآن حکیم ہر مسلمان کو آزاد گردانتا اور اس بات کا مکلّف قرار دیتا ہے کہ حتی الامکان وہ اپنے عقائد، اقدارِ حیات اور عبادات کی آزادی و تحفظ کے لیے کوشاں رہے، اور اگر کہیں مزاحمت ہو اور مزاحمت قتال کی شکل اختیار کرلے تو اس کو دور کرنے کے لیے جہاد کرے اور خدانخواستہ اگر جہاد پر قدرت نہ رکھتا ہو، اس لیے

مسلمان بحیثیت مجموعی اس پر آمادہ نہیں ہیں تو پھر دارالکفر سے ہجرت کر کے کسی ایسے اسلامی ملک میں چلا جائے جہاں اسے عقیدہ و عمل کی پوری پوری آزادی ہو۔

جہاد و ہجرت اسلام کے دو بنیادی اصول ہیں جن میں سے مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے صرف وہی لوگ مستثنیٰ قرار پائیں گے جو بربنائے ضعف و ناتوانی نہ تو جہاد و قتال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں اور نہ ہجرت کرنے کی کسی تدبیر اور جتن پر قدرت رکھتے ہیں۔ معلوم رہے کہ یہاں "حیلہ" کے معنی عربی میں ایسی تدبیر اور جتن اختیار کرنے کے ہیں جس کی وجہ سے ہجرت کرنا آسان ہو جائے، مکر اور بہانہ کے نہیں۔

ح و و (ح و ی)

اَحْوٰی : سبز رنگ کی وہ شی جو سیاہی مائل ہو۔ شَعْرٌ احوی : سیاہ بال۔ رَجُلٌ احوی : جوانِ رعنا جس کے سب بال کالے ہوں۔

حَوَایَا : آنتیں، سمٹی ہوئی آنتیں۔

حَوٰی : جمع کیا، سمیٹا۔

اِحْتَوٰی : سمیٹا، جمع کیا۔

قرآن حکیم میں ہے :

فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی ۝ (الاعلیٰ : ۵)

[پھر اس کو سیاہ کر دیا]۔

اوّل تو یہ سورۃ اس لطیفۂ ادبی کی حامل ہے کہ پہلی آیت سے لے کر آخری آیت تک سجع اور آہنگ کے خاص اسلوب کی حامل ہے، دوسرے اس میں قدرت کے مختلف مظاہر کا اس انداز سے ذکر کیا ہے کہ ہر مظہر گویا اپنے اندر تکمیل و اتمام کی وہ تمام منزلیں پنہاں رکھتا ہے جن پر اس کی زندگی اور وجود کا انحصار ہے۔ دوسرے لفظوں میں قرآن حکیم اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ یہ عالم رنگ و بو بخت و اتفاق کا کرشمہ نہیں۔ نہ معنی، علّت اور سبب سے تہی اور عاری ہے۔ اس میں ہر شے بامقصد

اور ارتقا کی حامل ہے۔ انسان کو پیدا کیا تو اس کے لوازمِ حیات بھی مہیا کیے۔ ہر شے کی تخلیق کی تو اس کا انداز بھی مقرر کیا، اسی پر بس نہیں، اس کو تکمیل کی راہیں بھی سجھائیں۔ چنانچہ چارہ ہی کو دیکھو، اس کو زمین سے نکالا تو اس کو سیاہی مائل سبز رنگ عطا کر کے اس لائق بنایا کہ جانور اس کو خوشی اور رغبت سے کھا سکیں۔

ح ی د

حَادَ : ہٹ جانا، کنارہ کشی اختیار کرنا، کترانا۔

حَادَ عن الطریق : راہ سے ہٹ گیا۔

حَیدٌ : کسی چیز کا اُبھرا ہوا حصّہ۔ کہا جاتا ہے:

ضربة علی حیدۃ راسه : اس نے اس کے سر کے ابھرے ہوئے حصّے پر ضرب لگائی۔

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذَٰلِكَ مَا كُنتَ مِنْهُ تَحِيدُ ۝ (ق : ۱۹)

[اور وہ آپہنچی موت کی بے ہوشی سچائی کے ساتھ، یہی وہ حقیقت ہے جس سے تو بدکتا رہتا تھا]۔

مومن ہر آن اس چشم کشا حقیقت کو فکر و نظر کا محور بنائے رکھتا ہے کہ ایک نہ ایک دن زندگی کی نشاط آفرینیوں سے محروم ہو کر اسے موت کے آغوش میں جانا ہے اور اپنے پروردگار کے روبرو پیش ہونا ہے، لیکن منکر یا غافل موت کے نام ہی سے کتراتا اور بدکتا اور کنارہ کش رہنے کی کوشش کرتا ہے، حالانکہ موت بہرحال آ کے رہتی ہے خواہ انسان چاہے خواہ نہ چاہے اور اس سے گریز کی راہیں اختیار کرتا رہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب موت انسان کا مقدر ہے اور اس سے مفر نہیں تو کیوں نہ زندگی اس ڈھب سے بسر کی جائے کہ انسان ہنسی خوشی اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر سکے۔ موت پر انسان کو قابو نہیں لیکن زندگی پر تو ہے۔ کیوں نہ اسے سنوارا جائے، کیوں نہ اسے جمیل سے جمیل تر بنایا جائے اور اس طریق سے صبح و شام کی مصروفیات کو ترتیب دیا جائے کہ انسان دنیا و آخرت میں سرخرو ہو۔

ح ی ر

حَارَ الماء: پانی کا کہیں جمع ہو جانا اور رُک جانا۔

حَارَ الرجل فی امرہ: اپنے معاملے کے حل وکشود میں متردّد ہوا۔

حَائِرٌ: حیران وششدر۔ پانی کا حوض جس میں پانی بہتا نہ ہو۔

جَفْنَةٌ مستحیرۃ: بھرا ہوا قدح۔

استحار شباب المرأۃ: عورت کی جوانی تکمیل واتمام کو پہنچی۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ ص (الانعام: ۷۱)

[جیسے کوئی شخص ہو کہ اسے شیطانوں نے زمین پر بے راہ کر دیا ہو اور بھٹکتا پھرتا ہو]۔

مشرکینِ مکہ مسلمانوں سے اکثر کہتے رہتے تھے کہ کیا اچھا ہو اگر تم لوگ اسلام کو چھوڑ کر پھر اپنے آبائی مذہب کی طرف لوٹ آؤ۔ یہ آیت اس کا جواب ہے کہ رشد وہدایت کی لذتوں سے بہرہ ور ہونے کے بعد اور گمراہی کو چھوڑ کر صراطِ مستقیم پر گام زن ہو جانے اور اپنی منزل کو پا لینے کے بعد بھلا کون ایسا احمق ہو گا جو شرک و بت پرستی کے اندھیروں میں پھر سے کود پڑے۔ کیونکہ اگر ہم ایسا کریں تو ہماری مثال اس شخص سے مختلف نہ ہوگی جو لق و دق صحرا میں راستہ بھول جائے اور بھٹکتا پھرے۔ جو نہ یہ جانتا ہو کہ اس کے سفر کا آغاز کہاں سے ہوا تھا اور نہ یہ جانتا ہو کہ اسے کہاں پہنچنا ہے۔

ح و ز

حَازَ: اکٹھا کیا، جمع کیا، سمیٹا، ہانکا۔ حَازَ المرأۃ: اس نے اس عورت سے نکاح کر لیا۔

حَازَ المال: مال جمع کیا۔

حَازَ الابل: اونٹوں کو تیزی سے ہانکا۔

انحاز: ہٹ گیا، علیحدہ ہو گیا۔

تحوّزت الحیۃ : سانپ نے کُنڈلی مارلی۔
اَلحوزۃ : گوشہ، مرکز۔ کہا جاتا ہے :
فلان یحمی حوزۃ الاسلام : وہ مرکزِ اسلام کی حمایت کرتا ہے۔
انا فی حَیِّز فلان : میں اس کی نگرانی میں ہوں۔
اَلاَحْوَذِیُّ : وہ شخص جو اپنے کاموں کو پھرتی اور مہارت سے انجام دے۔
قرآن حکیم میں ہے :
اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ (الانفال : ۱۶)
[یا اپنی جماعت کی طرف پناہ لے رہا ہو، تو وہ اللہ کے غضب میں آجائے گا]۔
سیاقِ کلام یہ ہے کہ مسلمان سپاہیوں کا جب کفار سے مقابلہ ہو تو ان کو چاہیے کہ ڈٹ کر لڑیں اور کسی بھی صورت میں اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ اِلّا یہ کہ جنگی چال کا تقاضا یہ ہو کہ سرِ دست پیچھے ہٹ جائیں اور پھر حملہ آور ہوں یا مقصد یہ ہو کہ بھاگ کر اپنے گروہ سے جا ملیں اور اس طرح دشمن کے حملوں سے نہ صرف خود محفوظ ہو جائیں بلکہ اس پوزیشن میں ہوں کہ اپنے ساتھیوں سے مل کر دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ متحیزا، حیّز سے ہے جس کے معنی جگہ، مقام اور مکان کے ہیں اور متحیز کا مطلب یہ ہوگا کہ جنگ میں اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ پناہ لینے والا۔

غرض یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں جہاں بہادری اور شجاعت کا ہونا سپاہی کی ایک خوبی ہے، وہاں اس کے لیے حربی چالوں سے آگاہ ہونا بھی لازم ہے۔ اس لیے کہ جنگ صرف قوت و طاقت سے نہیں جیتی جاتی، اس کے لیے تدبیر و حکمت سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

ح ی ص

حَاصَ حیاصَۃً : کپڑا سیا۔
حاصَ عنہ : اس سے ہٹ گیا، اس سے علیحدہ ہو گیا۔
حَاصَ حولہ : اس کے گرد منڈلایا۔

اَلْحَوَاصُ : چھوٹی آنکھ، تنگ آنکھ۔

حَاوَصَ : گوشہ چشم سے دیکھنا۔

اِحتاصَ : احتیاط کی۔

حَیصَ بیصَ : تنگی، مشکل۔ کہا جاتا ہے :

وَقعوافی حیص بیص : وہ مشکل میں پڑ گئے۔

محیص : جائے پناہ، مفر، بچ نکلنے کی تدبیر۔

رَجُل احوص : یک چشم، دھنسی ہوئی آنکھ والا۔

بیر حوصاء : تنگ کنواں۔ کہا جاتا ہے :

لَاَطْعَنَنَّ فی حَوصِهِم : انھوں نے جو سیا ہے میں اسے اُدھیڑ کر رکھ دوں گا یعنی ان کے کیے دھرے پر پانی پھیر دوں گا۔

مَاطَعَنْتَ فی حوصهم : تو ان کا جواب نہیں دے پایا۔

قرآن حکیم میں ہے :

سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ۝ (ابراہیم : ۲۱)

[اب تو ہم دونوں کے لیے برابر ہے خواہ ہم چیخیں چلائیں خواہ ہم صبر کریں بہرحال ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں]۔

یوم حشر عجب منظر ہوگا، ایک طرف اکابر شیوخ اور کج کلاہان اقتدار صف باندھے اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہوں گے، دوسری طرف اصاغر، بندگان حکم اور مریدان باصفا کا ہجوم ہوگا۔ دونوں کے سامنے ان کا عبرتناک انجام ان کو جھنجھوڑ رہا ہوگا اور دونوں گردنیں نوہڑائے ندامت و خجالت اور عجز و بے چارگی کا پیکر بنے ہوئے سوچ رہے ہوں گے کہ کیوں نہ ہم نے گمراہی کو چھوڑ کر راہ حق اختیار کی، اور کیوں نہ ہم نے شرک کی تاریکیوں سے روگرداں ہو کر توحید کے اجالوں سے قلب و ذہن کو روشنی بخشی۔ کیوں ہم آنکھیں بند کر کے ان بڑوں کے پیچھے چلے اور غور و فکر سے اپنے لیے کوئی راہ عمل متعین نہ کی۔ اتنے میں اصاغر، اکابر سے سفارش کی درخواست کریں گے۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ یہ وہ مقام ہے

جہاں صرف مکافاتِ عمل کے قانون کی فرماں روائی ہے ۔ اکابر کہیں گے اب بہرحال ہمیں سزا پانا اور عذاب و عقوبت سے دوچار ہونا ہے اور اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا کہ اپنی بداعمالیوں کا خمیازہ بھگتیں ۔

ح ی ض

حَیْض : ماہواری، وہ مخصوص خون جو متعین دنوں میں رحم سے خارج ہوتا ہے ۔

حاضتِ المرءۃ : ماہواری خون جاری ہوا ۔

حَیَّض : پانی بہایا ۔

الحِیاض : حیض کا خون ۔

محیض : حیض، مقامِ حیض، حیض کا جاری ہونا ۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَیَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ (البقرہ: ۲۲۲)

[اور لوگ آپ سے حیض کا حکم دریافت کرتے ہیں] ۔

حیض کا جاری ہونا فطرتِ نسوانی کا ایک معمول ہے ۔ محض اس بنا پر کہ ایک عورت کو حیض آنے لگا ہے، یہ ہرگز جائز نہیں کہ اس کو یہودی فقہ کے مطابق قابلِ نفرت قرار دیا جائے، اس کو افرادِ خانہ سے الگ تھلگ کسی کمرے میں بند کر دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ جو بھی اس سے چھو جائے گا ناپاک اور نجس ہو جائے گا ۔ حائضہ عورتوں کے بارے میں صحیح اور صحت مند موقف یہ ہے کہ ان دنوں میں ان سے صرف جنسی تعلقات کی حد تک اجتناب روا رکھا جائے ۔ قرآن حکیم سے متعلق یہ کہنا درست نہیں کہ اس میں صرف زندگی کے بنیادی مسائل ہی مذکور ہیں، جزئیات نہیں ۔ یہ کتابِ ہدیٰ تاریخ کے ایک خاص موڑ پر ایک معتین معاشرے میں تئیس برس کے طویل عرصے میں نازل ہوئی ۔ اس میں ان تمام امور، مسائل اور الجھنوں کا تسلی بخش حل پایا جاتا ہے جو اس معاشرے کو پیش آئیں ۔ حائضہ عورت کا مسئلہ چونکہ سراسر معاشرتی مسئلہ

تھا اور اس کا بالواسطہ تعلق عورت کی توقیر اور حرمت سے تھا، اس لیے ضروری تھا کہ اس کی وضاحت کی جائے۔ بالخصوص اس لیے بھی اس کی وضاحت ضروری تھی کہ یہودیوں اور عربوں کے نزدیک ایام حیض میں عورت خاندان اور معاشرے سے متعلق اپنے فرائضِ منصبی کو ادا کرنے سے بالکل قاصر رہتی تھی، یعنی اس دوران اسے یہ حق نہ تھا کہ گھر کے دوسرے افراد سے مل جل کر گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹا سکے اور خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے افرادِ خانہ سے مل جل کر کوئی کام سرانجام دے سکے۔ قرآن حکیم نے اس غلط فہمی کو دور کیا اور بتایا کہ یہ ایک ناگزیر نسوانی عارضہ ہے اور اس سے اس کے مقام و منصب اور عزت و حرمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ح ی ف

اَلْحَیْفُ : ظلم، فیصلہ کرتے وقت ایک ہی فریق کی طرف جھک جانا۔

حَافَ علیہ : اس پر زیادتی کی، ظلم ڈھایا۔

حَافَتِ المرٔۃ : عورت حوض کے کنارے پر بیٹھی۔

اَلْحِیْفَۃُ : گوشہ۔

تَحَیَّفتُ الشیئَ : میں نے اس کو اطراف سے گھٹایا۔

حَافَۃُ الشیء : کسی چیز کا کنارہ، گوشہ یا حصہ۔

قرآن حکیم میں ہے :

اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ وَرَسُوْلُہٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (النور : ۵۰)

[یا ان کو یہ خوف ہے کہ خدا اور اس کا رسول ان کے حق میں ظلم کریں گے (نہیں) بلکہ یہ خود ظالم ہیں]۔

ذکر منافقین کا ہے کہ ان میں جب کوئی جھگڑا پیدا ہوتا ہے تو اس کو آنحضرتؐ کے سامنے پیش کرنے کے بجائے ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں کہ مبادا ہماری کمزوریوں کا

کا بھانڈا پھوٹ جائے یا آنحضرتؐ کو حکم ٹھہرانے میں یہ اندیشہ کارفرما ہے کہ آنحضرتؐ فیصلہ صادر فرمانے میں کہیں عدل و انصاف کے دامن کو نہ چھوڑ دیں۔ انھیں کیا معلوم کہ پیغمبر کا تو منصب ہی کمالِ عدل کا متقاضی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی فریق کی ناجائز طرف داری کرے۔ منافقین کی بہانہ سازی سے قطع نظر اصل بات یہ ہے کہ یہ خود ظالم اور حق و انصاف کا گلا گھونٹنے والے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی طرف ظلم و تعدی کا انتساب یا گمان غلط اور نامناسب ہی نہیں، بجائے خود بہت بڑا ظلم ہے۔

ح ی ق

حَاقَ : گھیر لیا، نازل ہوا، احاطہ کر لیا، لپیٹ میں لے لیا۔ کہا جاتا ہے :

اَلْمَکْرُ حَائِقٌ بِاَھْلِہٖ : مکر مکاروں کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے۔

اَلْحَیْقُ : بُرائی کا خمیازہ، وبال۔

قرآنِ حکیم میں ہے :

وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّیءُ اِلَّا بِاَھْلِہٖ ط (فاطر : ۴۳)

[اور بُری چالوں کا وبال انھی چال والوں پر پڑتا ہے]۔

کفارِ مکہ کی یہ دیرینہ آرزو تھی کہ کاش ہم میں کوئی پیغمبر پیدا ہو اور ہم بنی اسرائیل سے بربنائے فخر یہ کہہ سکیں کہ تم میں اتنے انبیا آئے لیکن تمھیں توفیق نہ ہوئی کہ اُن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔ ہمیں دیکھو کہ ہم میں اللہ تعالیٰ نے ایک پیغمبر بھیجا اور ہم بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس پر ایمان لے آئے۔ ناشکری اور نافرمانی کا یہ منظر بھی دیدنی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا پیغمبر سچ مچ ان میں ان کی آرزو کے مطابق آ ہی گیا تو نہ صرف ان لوگوں نے اس کو ماننے سے انکار کیا بلکہ الٹا اس کے خلاف مکارانہ سازشوں کا جال بچھا دیا اور مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر دی۔

قرآن کی اس آیت میں اس درخشاں حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ مکر و فریب کی کوئی چال حق اور سچائی کے مقابلے میں کامیاب ہونے والی نہیں۔ حق بہرحال کامران و سرخرو

ہوتا ہے اور باطل کا خمیازہ بالآخر انہی لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے جو اس کی سرپرستی کرتے ہیں۔

ح ی ن

حَانَ : وقت آپہنچا۔

حَانَ حینہ' : اس کی موت کا وقت آپہنچا۔

تحیّن : انتظار کرنا۔ کہا جاتا ہے :

هُوَ یتحیّن طعام الناس : وہ لوگوں کے کھانے کے وقت کا انتظار کرتا ہے۔

حینُ : ہلاکت، موت۔

حینۃُ : ہلاکت، موت۔ کہا جاتا ہے :

نزلت بہ کائنۃ حائنۃ : اس پر ایسی افتاد پڑی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔

حین : اس کا اطلاق مطلق وقت، غیر متعین عرصہ یا زمانے پر بھی ہوتا ہے اور مخصوص مدت اور وقت پر بھی۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ حین سال اور فصل کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے :

قرآن حکیم میں ہے :

فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ ۝ (الصّٰفّٰت : ۱۴۸)

[سو ہم نے ان کو زمانے تک عیش دیا]۔

یعنی حضرت یونس کی قوم کفر و انکار کے بعد ایمان لے آئی تو ہم نے ایک وقتِ مقرر تک ان کو زندگی کی عیش کوشیوں سے نوازا۔

قرآن حکیم میں ہے :

هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (الدھر : ۱)

[بے شک انسان پر ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے]۔

یہاں حین سے مراد مطلق عرصہ یا زمانہ ہے۔

لہ، ی) آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ بے شک انسان پر ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے، جب یہ

کوئی قابلِ ذکر شی نہ تھا۔ آگے چل کر قرآن نے ارتقا کی ان منزلوں کی نشان دہی کی ہے جو اس نے شکمِ مادر میں طے کیں۔ غرض یہ ہے کہ آج انسان جو اچھی خاصی سوجھ بوجھ رکھتا اور عقل و خرد کی ترک تازیوں پر نازاں ہے ہمیشہ ایسا نہیں تھا بلکہ بتدریج ترکیب و ساخت کی مقررہ تبدیلیوں کے بعد اللہ تعالیٰ کی عنایتِ خاص سے زندگی اور شعور کے ان مرحلوں سے گزرا ہے اور اب یہ اس لائق ہوا ہے کہ حق و باطل میں امتیاز کر سکے۔ اس بنا پر چاہیے تو یہ تھا کہ انسان اپنے اس رب کا شکر گزار ہو جس نے اُسے قطرۂ آب سے اس مقام تک پہنچایا اور یہ آب و تاب عطا کی لیکن بُرا ہو اس کی بدنصیبی کا کہ جس پروردگار نے اسے حیاتِ وجود سے بہرہ مند کیا اور شعور و فہم کی بے شمار صلاحیتوں سے نوازا، یہ اسی کا منکر اور اسی کا نافرمان ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ (ابراہیم: ۲۵)

[اور وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے پروردگار کے حکم سے دیتا رہتا ہے]۔

یہاں لفظ حین سے مراد فصل ہے تمثیل کا تعلق کلمۂ توحید اور نظریۂ توحید سے ہے، یہ ایسا کلمۂ طیبہ، ایسا نظریۂ حیات اور فکر و عمل کی ایسی محکم و استوار دستاویز ہے جس کے فیوض و برکات کا سلسلہ ابد تک جاری رہنے والا ہے۔ قرآن حکیم کے اپنے الفاظ میں اس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ "یہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں خوب اونچائی میں جا رہی ہیں اور اپنا پھل اپنے پروردگار کے حکم سے ہر فصل میں دیتا رہتا ہے"۔ یعنی اس کی فیض رسانیاں مکان و زمان کی حد بندیوں سے بالا ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○ (الاعراف: ۲۴)

[اور زمین میں تمھارے لیے ٹھکانا رکھا گیا ہے اور نفع حاصل کرنا ایک وقت معلوم تک]۔

سیاقِ کلام یہ ہے کہ جب بنی آدم کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیجا گیا تو کہا گیا کہ اب تمھیں یہیں رہنا اور یہیں جینا اور مرنا ہے اور یہ کہ زمین ہی پر تمھارے لیے وہ تمام لوازمِ

حیات مہیا کر دیے گئے ہیں جن سے تمھیں استفادہ کرنا اور زندگی کے قافلے کو آگے بڑھانا ہے لیکن زندگی کا یہ دور بھی عارضی اور وقتی ہے۔ یہاں "الی حین" کہہ کر دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ایک یہ کہ اس کرۂ ارض پر تمھارا قیام عارضی ہے اور اس کے بعد تمھیں مرنا اور ابدی زندگی کی دہلیز پر قدم رکھنا ہے۔ دوسرے یہ کہ عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف سفر کرنے کا جو وقت ہے، وہ مقرر اور متعین ہے۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ○ (ص: ٣)

[کتنی ہی اُمتوں کو ان سے پہلے ہم ہلاک کر چکے ہیں سو انھوں نے بڑی ہائے پکار کی، درآں حالیکہ وقت خلاصی کا گزر چکا تھا]۔

یہاں "لات حین" میں حرف لات اصل میں وہی لا ہے جو نفی کے لیے آتا ہے، اس میں حرف تا کو بڑھا دیا گیا ہے، جیسے "ثم" میں حرف تا کا اضافہ کر دیتے ہیں اور ثُمَّتَ کہتے ہیں — یا رُبَّ کو رُبَّتَ کی شکل میں ڈھال دیتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ بہت سی قوموں نے اس وقت عذابِ الٰہی سے فرار اور نجات کے لیے شور مچایا جب کہ عذاب سے فرار و نجات حاصل کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ لات حین مناص، کا ترجمہ یہ ہوگا۔ اور یہ وقت فرار اور نجات یا ہائے پکار کا وقت نہیں تھا۔

ح ی ی

حَيِيَ : زندہ رہنا۔

حَيَاة : زندگی۔

اَحْيٰى : زندہ کیا، زندگی بخشی۔

اَحْيَيْتُ النَّارَ : میں نے آگ سلگائی۔

اَلْحَیَا : بارش، شرم - کہا جاتا ہے :

وَقَعَ فی الارض الحیا : زمین پر بارش ہوئی۔

حَیِیٌّ : زندہ شے، فیصلہ - خدا کی صفت، سرچشمۂ زندگی یا حقیقی زندگی سے اتصاف پذیر

بیوی، اہل و عیال - کہا جاتا ہے :

کیف الحیی : اہل و عیال کا کیا حال ہے - یعنی تمھاری بیگم کیسی ہیں۔

المحیّا : چہرہ -

حیی علی الغذاء : کھانا تیار ہے جلدی آؤ۔

حَیَّا : سلام کرنا، زندگی کی دعا کرنا، باقی رکھنا۔

حیات کا اطلاق جن جن معانی پر ہوتا ہے، وہ کچھ یوں ہیں :

(۱) قوتِ نامیہ کا کرشمہ -

قرآن حکیم میں ہے :

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ (الحدید : ۱۷)

[جانتے رہو کہ اللہ ہی زمین کو اس کے خشک ہونے کے پیچھے زندہ کر دیتا ہے]۔

یعنی بارش ہونے سے جو زمین کی قوتِ نامیہ پیدا ہو جاتی ہے اور مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے تو اس لیے کہ یہ اللہ کا قانون ہے کہ بارش سے زمین تر و تازہ ہو جائے۔ اس آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ توبہ کرنے اور اپنے گناہوں پر اشک بہانے سے لوحِ قلب سے گناہ و معصیت کا غبار دور ہو جاتا ہے اور قلبِ مردہ زندہ ہو جاتا ہے -

(۲) قوتِ حساسہ سے بہرہ ور انواع۔

قرآن حکیم میں ہے :

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۙ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ۙ (المرسلٰت : ۲۵-۲۶)

[کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کو سمیٹنے والی نہیں بنایا]۔

یہاں احیاءً سے مراد زندگی اور احساس سے بہرہ ور تمام حیوانات اور نباتات ہیں جن کا

تعلق زمین سے ہے، زمین ہی ان کی زندگی کی ضامن ہے اور زمین ہی ان کا آخری ملجا و ماویٰ ہے۔

(۳) سمجھ بوجھ سے آراستہ انسان۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (الانعام: ۱۲۲)

[کیا جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا]۔

یہاں ایسے لوگ مراد ہیں جو شرک و جہالت کی وجہ سے مردہ ہو گئے تھے لیکن اللہ کے فضل سے انھیں سمجھ بوجھ عطا ہوئی اور توحید کی برکات سے یہ پھر زندگی کی راہ پر چل پڑے۔

(۴) حیاتِ برزخی۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ (آل عمران: ۱۶۹)

[اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں انھیں ہرگز مردہ خیال نہ کرو بلکہ وہ لوگ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں، رزق پاتے رہتے ہیں]۔

غزوۂ احد کا ذکر ہے، کچھ لوگوں نے جو اپنی دوں ہمتی اور نفاق کی وجہ سے اس غزوے میں شرکت کا شرف حاصل نہیں کر سکے تھے، اپنے دل کو بہلانے کی خاطر مسلمان شہدا کے بارے میں یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ بے چارے یونہی مارے گئے، اگر ہمارا ساتھ دیتے اور گھروں میں بیٹھ رہتے تو موت کے منہ میں جانے سے بچ جاتے۔

قرآن نے ان کی اس بات کا جواب دیا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے، وہ مردہ کب ہیں؟ ان کو عالمِ برزخ میں ایک مخصوص قسم کی زندگی سے لوازا گیا ہے، جس میں یہ اللہ تعالیٰ کے الطافِ کریمانہ سے بہرہ مند ہو رہے ہیں اور یہ وہ بلند تر زندگی ہے جو بزدلوں اور منافقوں کے مقدر میں نہیں۔

(۵) علمی، فلاحی اور روحانی زندگی کا احیا۔

قرآن حکیم میں ہے:

اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ج (الانفال: ۲۴)

[اللہ اور اس کے رسول کو لبیک کہو جب کہ وہ تم کو تمھاری زندگی بخش چیز کی طرف بلائیں]۔

یعنی اللہ اور ان کے رسول کی اطاعت وہ شی ہے جس سے زندگی کے علمی، اخلاقی اور روحانی گوشے دمک اٹھتے ہیں، اور انسان جیتے جاگتے اور حسین و جمیل کردار کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ خصوصیت سے اطاعتِ رسول کی کیا اہمیت ہے، اس کو جاننے کے لیے اس آیت کے اندازِ بیان پر غور کیجیے۔ آغاز میں گو اللہ اور رسول دونوں کی اطاعت کا ذکر ہے، لیکن اس کے بعد جہاں تک دعوت و ارشاد کا تعلق ہے، اس میں صرف آنحضرت کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دین کی جامع اور مکمل اطاعت کا تقاضا اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک کہ براہِ راست اطاعتِ رسول کا اصول اختیار نہ کیا جائے۔

(۶) سرچشمۂ زندگی، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی۔

قرآن حکیم میں ہے:

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ط (المؤمن: ۶۵)

[وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں سو تم اس کو پکارو خالص اعتقاد کرکے]۔

زندگی کے معنی ایسی حقیقت کے ہیں جو اپنے ماحول کے اثرات کو قبول بھی کرے اور ماحول پر اثر انداز بھی ہو۔ زندگی کا مصداقِ صحیح حضرتِ انسان ہے لیکن اس کی زندگی اپنے آغوش میں تضادات و نقائص کی اتنی بڑی مقدار لیے ہوئے ہے کہ جس سے زندگی کی تگ و تاز کا دائرہ سمٹا ہوا سا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان معنوں میں حی ہے کہ اس کی ذاتِ گرامی ہر طرح کے نقص و عیب اور تضاد و تناقض سے نہ صرف پاک اور مبرا ہے، بلکہ زندگی کی نشاط آفرینیوں کا مرکزِ کامل بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان معنوں میں بھی حی ہے کہ زندگی کے دھارے اسی کے سرچشمۂ فیض سے پھوٹے ہیں یعنی ہر زندہ شے اس لیے زندگی اور حیات کی ترکتازیوں سے بہرہ ور نہیں ہے کہ اس کی اندرونی ساخت اور ترتیب یا میکنزم کا یہ قدرتی نتیجہ ہے بلکہ ہر

شے اس بنا پر زندہ ہے کہ اس کی رگ و پے میں اللہ تعالیٰ نے زندگی کی لہروں کو دوڑا دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تجربے کی سطح پر یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ زندگی اعضا و جوارح یا ترتیب و امتزاج سے علیحدہ کوئی شے ہے۔ لیکن وجدان و بصیرت کا یہ فتویٰ ہے کہ زندگی جو غیر محدود امکانات اور وسعتوں کی حامل ہے، اپنے وجود کے لیے ایسی شے کی رہینِ منت ہو جو سراسر محدود، سمٹی ہوئی اور فانی ہو۔ کیونکہ محدود شے لامحدود کی تخلیق و آفرینش کا سبب نہیں قرار پا سکتی۔ محدود بہرحال محدود ہی کو جنم دے گا لامحدود کو نہیں۔ لہٰذا زندگی کا خالق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہو سکتی ہے جو اپنے فیوض و صفات کے اعتبار سے ہر طرح کی حدبندیوں سے ورا اور بلند ہے۔

خ

خ ب ء

خَبَأَ - پوشیدہ رکھا، چھپایا - کہا جاتا ہے -

خَبَأَھا الیوم حاجتہٖ - کسی شئ کو اس بنا پر چھپا رکھا ہے کہ بوقت ضرورت اس کو نکال لے اور اس سے کام لے -

لا مخبأ لعطر بعد عروس - شادی کے بعد عطر کو چھپا رکھنے کے کچھ معنی نہیں - یعنی شادی کے بعد عطر کا کیا کام -

خبأٌ - پوشیدہ اور مستتر شئ -

اَخْرَجَ خَبَأُ السمآء خبأَ الارض - آسمان کے پوشیدہ خزانے نے زمین کے پوشیدہ خزانے کو نکال باہر کیا - یعنی بارش کے قطروں نے زمین میں ڈھکے چھپے اناج کو ظاہر کر دیا -

جَارِیَۃٌ مخبأۃ و نسآءٌ مخبآت - حیادار لڑکی اور حیادار مستورات، جو مرد کی اطلاع پاکر مارے شرم کے سمٹ جائیں -

اختبأ - چھپ گیا -

قرآن حکیم میں ہے :

اَلَّا یَسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ یُخْرِجُ الْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النمل ۲۵)

[اللہ کی عبادت نہیں کرتے جو باہر لاتا ہے آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو]۔

عہدِ سلیمانی میں یمن اور حضر موت کے رہنے والے اُن مشرکین کا ذکر ہے جو آفتاب کی پرستش کرتے تھے، ان سے کہا گیا ہے کہ نجوم و کواکب اور شمس و قمر کی پرستش کے بجائے کیوں نہ تم اس اللہ کی پرستش کرو جس نے زمین اور آسمانوں میں تمھارے لیے بوقلموں خزائن کو چھپا رکھا ہے اور بوقتِ ضرورت تمھارے لیے اُن خزائن کو پردۂ خفا سے ظہور میں لاتا رہتا ہے۔

خَبَاءُ السَّمَاءِ اور خَبَاءُ الْاَرْضِ سے متبادر معنی تو بارش اور نباتات ہی کے ہیں۔ لیکن جس طرح نباتات کے علاوہ زمین میں معدنیات، گیس اور تیل وغیرہ بھی پوشیدہ ہیں اور ان کا شمار اللہ تعالیٰ کے خاص انعامات میں ہوتا ہے اسی طرح کیا عجب کہ فضا میں پھیلے ہوئے ستاروں میں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں موجود ہوں، طلب و جستجو شرط ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ وقت دُور نہیں جب زمین پر بسنے والا یہ انسان خزائنِ سماوی سے اسی طرح استفادہ کر سکے گا، جس طرح کہ آج کا انسان زمین کے دفینوں سے استفادہ کناں ہے۔

خ ب ت

خَبْتٌ۔ زمین کا نشیبی، کشادہ اور نرم حصّہ۔

اَخْبَتَ الْقَوْمُ۔ لوگ زمین کے نشیبی، کھلے اور نرم قطعے میں ٹھہرے۔

اَلْاِخْبَاتُ۔ خشوع و خضوع، نرمی اور تواضع۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ۔ (الحج: ۳۴)

[اور خوش خبری سنا دیجیے گردن جھکا دینے والوں کو]۔

اس سے قبل کی آیات میں شعائرِ حج اور توحید کا تذکرہ ہے جو تمام نیکیوں کی جڑ اور تمام اخلاقی و روحانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ ان شعائر پر ایمان لانا

اور اللہ تعالیٰ کے آگے بہ کمال تواضع، فروتنی اور اخلاص گردن جھکا دینا اس توحید کا تقاضا ہے۔ آیت میں بتایا گیا ہے کہ ازراہِ کبر و غرور اللہ تعالیٰ کے آگے سر خم نہ کرنے والوں کا انجام بہتر نہیں۔ خوش خبری اور بشارت صرف اللہ تعالیٰ کے اُن بندوں کے لیے ہے، جن کا دل، گردنیں اور سر اللہ تعالیٰ کی جلالتِ قدر کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ ۗ (الحج: ۵۴)

[تاکہ جن لوگوں کو فہم عطا ہوا ہے وہ یقین کر لیں کہ یہ آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے سو اس کے ایمان پر اور زیادہ قائم ہو جائیں۔ پھر اس کی طرف ان کے دل اور بھی جھک جائیں]

آیت کے معنی یہ ہیں کہ جہاں حق و صداقت کے بارے میں ہمیشہ سے شکوک و شبہات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اللہ تعالیٰ کے کارخانۂ قدرت میں اس امر کا اہتمام بھی موجود ہے کہ علم و ایمان کی روشنی سے شکوک و شبہات کے دل بادل چھٹتے ہیں اور ایمان و ایقان کے کوائف میں اور اضافہ ہوتا رہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ علم و ایمان کے دلوں میں گداز، رقت اور اللہ تعالیٰ کے آگے جھکنے کا جذبہ زیادہ فراواں اور مستحکم ہو جاتا ہے۔

خ ب ث

خَبُثَ ۔ خیال، فکر، عمل اور کسی شئے کا گندا، غلیظ، مکروہ، ردّی یا ناپسندیدہ ہونا۔

اَلْخَبِيْثُ ۔ گھٹیا، ناپاک، حرام، نامرغوب ۔ کہا جاتا ہے۔

هٰذَا مَا يُخْبِثُ النَّفْسَ ۔ یہ نفس کو مکدر کر دیتا ہے۔

لیس الْإِبْرِيز كَالْخَبَثِ ۔ سونا اور اس کا میل یکساں نہیں۔

خبثت رائحته ۔ اس کی بُو ناپسندیدہ ہو گئی۔

خَبث طعمه ۔ اس کا مزہ بگڑ گیا۔

خبثت بفلانة ۔ اس نے فلاں عورت کے ساتھ بُری حرکت کی۔ زنا کیا۔

هٰذا الاخبثة بِه ۔ اس میں کوئی عیب نہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ۔ (الاعراف: ۱۵۷)

[اور اُن پر گندی چیزیں حرام رکھتا ہے]

تورات اور انجیل میں آنحضرتؐ کا کیا مقام ہے، ان کے فرائضِ نبوت میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں اور یہ کہ انھیں انسانیت اور دین کی خدمت کے سلسلے میں کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دینا ہے۔ ان سب باتوں کی تفصیل اس آیت مبارکہ میں مذکور ہے۔ ان کے فرائض میں ایک شئے یہ شامل ہے کہ ان تمام امور کی وضاحت کریں جن کا ارتکاب گھٹیا، حرام اور گھناؤنا ہے تاکہ اسلامی معاشرہ پاکیزہ، عمدہ اور صحت مند بنیادوں پر استوار ہو۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ لحاظ ہے کہ آنحضرت کو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہونے کی حیثیت سے اختیار حاصل ہے کہ پاکیزہ چیزوں کے حلال وطیب ہونے کا اعلان کریں اور جو استعمال میں آنے والی چیزیں مکروہ، مضر اور ناپسندیدہ ہیں ان کی حرمت کا تعین فرمائیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ (ال عمران: ۱۷۹)

[جس حال پر تم ہو اللہ اس پر ایمان والوں کو چھوڑے رکھنے کا نہیں جب تک

وہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کرے]

ابتدا میں اسلامی معاشرہ ملا جُلا تھا۔ جہاں اس میں کثیر تعداد مخلص صحابہ کی تھی وہاں چند منافقین بھی تھے جو مسلمانوں کے بھیس میں رہتے اور فتنے بپا کرتے رہتے تھے۔ ان کو اس بات پر ناز تھا کہ ہمارا راز مسلمانوں پر کھلا نہیں۔ ہم مزے سے ان میں رہ بھی رہے ہیں اور ان کے خلاف سازشوں کا جال بھی بچھا رہے ہیں۔ اس آیت میں ان کو متنبہ کیا گیا کہ یہ صورت حال باقی رہنے والی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ بالآخر ان کے چہرے بے نقاب ہوں اور مسلمان جان لیں کہ کون لوگ پاک ہیں اور کن کے ارادے فاسد اور ناپاک ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ (النور: ۲۶)

[گندی عورتیں گندے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے]

فتنہ افک کے بارے میں اس نکتے کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ کمبختو! یہ تو دیکھ لیا ہوتا کہ گندی اور بدکردار عورتیں کبھی نیک لوگوں کو جچی ہیں، اور انھوں نے کبھی ان کو اس درجہ درخورِ اعتنا سمجھا ہے کہ ان کو اپنے حرم کی زینت قرار دینے پر راضی ہو جائیں۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوا ہے کہ بدکردار لوگ کسی پاک باز خاتون کو اپنی بیوی بنانے پر راضی ہو جائیں۔ بات یہ ہے کہ نفسیاتی طور پر گندے ذہن والے مرد اور گندے ذہن والی عورتیں ازدواجی تعلق استوار کرتے وقت ہمیشہ ہم جنسی اور فاسقانہ ہم آہنگی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

کہنا یہ ہے کہ حضرت عائشہ پر تہمت لگانے والوں کو اگر عائشہ کا تقدس و احترام ملحوظ خاطر نہیں تھا تو اس حقیقت پر تو غور کر لیا ہوتا کہ ان کو کس ذاتِ گرامی اور پاکیزہ صفات ہستی کی بیوی ہونے کا شرف حاصل ہے اور اس ذات گرامی کو ان سے کس درجہ انس ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝ (ابراہیم: ۲۶)

[اور گندے کلمے کی تمثیل ایسی ہے جیسے ایک گندہ درخت ہو کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر اکھاڑ لیا جائے (اور) اس کے لیے کچھ ثبات نہ ہو]

جس طرح کلمہ طیبہ سے مراد توحید اور نظام اسلام کی فیض رسانیاں ہیں اسی طرح گندے کلمے سے مقصود کفر و شرک اور مذاہب و افکار کا وہ شجرہ خبیثہ ہے، جس کو انسانی کوششوں نے ہوا و ہوس اور طغیان و سرکشی کے جذبے کی بنا پر پروان چڑھانے کی کوششیں کی ہیں۔ اس کلمہ خبیثہ کے مقدر میں ثبات و کامیابی نہیں، اسے اس وجہ سے مٹنا اور ناکام ہونا ہے کہ اس میں وہ منطقی گیرائی و حکیمانہ عمق اور افادیت اور نفع رسانی نہیں، جو کلمہ طیبہ کا خاصہ ہے۔ مزید براں اس کی جڑیں قلب و ذہن اور ضمیر و وجدان کی گہرائیوں کے بجائے محض سطح پر قائم ہیں۔

خ ب ر

خَبَرَ الشَّیْءَ ۔ جانچا پرکھا۔ آزمایا۔

خَبَرَ الْأَرْضَ ۔ کھیتی باڑی کے لیے زمین کو جوتا۔

خَابَرَ ۔ بٹائی پر کھیتی باڑی کا معاملہ کیا۔

خَبُرَ ۔ آگاہ ہوا حقیقت حال سے واقف ہوا۔

اَلْخُبْرُ ۔ حقیقت حال کا جاننا۔ علم، تجربہ۔

اَلْخَبَرُ ۔ علم۔ اطلاع۔

اَلْأَخْبَارِیُّ ۔ مؤرخ۔ روایات و اخبار نقل کرنے والا جو محدث نہ ہو۔

اَلْخَبِیْرُ ۔ واقف۔ آگاہ، اللہ کی صفت۔ بواطن امور کو جاننے والا۔

کہا جاتا ہے:

مَالِیْ بِہٖ خُبْرٌ۔ مجھے اس کی کوئی اطلاع نہیں۔
مِنْ اَیْنَ خَبَرتَ ھٰذَا۔ تمھیں یہ اطلاع کہاں سے ملی۔
خَرَجَ یَتَخَبَّرُ۔ خبریں معلوم کرنے کے لیے گھر سے نکلا۔
اَعْطَاہُ خُبْرَتَہٗ۔ اس نے اس کا حصہ دے دیا۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَکَیْفَ تَصْبِرُ عَلٰی مَا لَمْ تُحِطْ بِہٖ خُبْرًا ۝ (الکھف ۶۸)

[اور آپ صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں ایسے امر پر جو آپ کے احاطۂ واقفیت میں نہیں ہے]

حضرت موسیٰ کی یہ خواہش تھی کہ جناب خضر انھیں بواطن امور جاننے کا علم بتا دیں۔ حضرت خضر نے کہا کہ تم جب بظاہر خلافِ شرع ایک امر دیکھو گے تو از راہِ بے صبری فوراً اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دو گے۔ اس لیے بواطن امور جاننے کی تمھاری خواہش کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔ پھر خود ہی ان کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ان حالات میں صبر ممکن بھی کیسے ہے، جب کہ بظاہر خلاف شرع حکم کے پیچھے جو مصلحت پنہاں ہے اس تک تمھاری رسائی ہی نہیں۔ یہاں خبر سے مراد حقیقی اطلاع اور پوری پوری واقفیت ہے جس میں ظاہری شریعت بھی داخل ہو اور حکمت باطنی بھی۔

خضر اور حضرت موسیٰ کے ذوقِ علم کا دائرہ مختلف ہے۔ حضرت موسیٰ پیغمبر ہیں، اس لیے قانون، فقہ، اور ضابطۂ حیات کے ترجمان ہونے کی حیثیت سے ظواہر امور کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ خضر کا کردار چونکہ ایک حکیم، صوفی اور عارف کا ہے جو پیغمبر بھی ہے، اس بنا پر ان کی توجہ اس طرف زیادہ مبذول رہتی ہے کہ حقیقت کیا ہے، اور حقیقت امر کا یہ عالم ہے کہ جہاں یہ ظواہر امور میں جلوہ گر ہوتی ہے وہاں بعض اوقات باطن امور میں بھی پائی جاتی ہے۔ موسیٰ و خضر کی اس ملاقات کا حاصل یہ ہے کہ کسی امر میں فیصلہ کرتے وقت جہاں یہ دیکھنا ضروری

ہے کہ الفاظ و حروف یا ظواہر امور کن معانی پر دلالت کناں ہیں وہاں اس امر کا جائزہ بھی لینا چاہیے کہ یہ ظواہر اپنے باطن میں کن حکم و معارف کے حامل ہیں۔

یہاں یہ بات جان لینا چاہیے کہ موسیٰ و خضر کی یہ ملاقات محض اتفاقی نہیں تھی بلکہ تدبیر الٰہی کا نتیجہ تھی۔ مقصود یہ تھا کہ حضرت موسیٰ کو چونکہ ایک قوم کا سربراہ اور قائد بننا تھا اس لیے آغاز کار ہی میں ان کی ضروری تربیت ہو جائے اور انھیں اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ کسی بھی معاملے کا فیصلہ کرتے وقت اس معاملے کے ظاہر و باطن دونوں پہلوؤں کا جائزہ لینا چاہیئے

قرآن حکیم میں ہے۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا۔ (الزلزال ۴)

[اس روز زمین اپنی سب خبریں بیان کر گزرے گی۔]

زمین قیامت کے روز اپنے راز اگلے گی اور وہ سب کچھ بتا دے گی جو اس پر بیتی ہے اور جو جو اہم کام اس پر ہوا ہے۔ یہ بتانا زبانِ حال سے بھی ہو سکتا ہے اور ان نقوش و اثرات کے ذریعے بھی، جو ہماری تگ و دو اور سعی و عمل سے اس پر غیر مرئی انداز مرتسم ہوتے رہتے ہیں۔

اور اگر آیت کے معنی یہ سمجھے جائیں کہ اس کا تعلق قرب قیامت کے علائم سے ہے، تو پھر اس میں یہ پیشین گوئی مضمر ہے کہ زمین ان بوقلموں دفائن کو ظاہر کر دے گی جو اس میں پنہاں ہیں جیسے معدنیات، تیل اور گیس وغیرہ۔

خ ب ز

خُبْزٌ۔ روٹی۔

خَبَزَ۔ روٹی پکائی۔

کہا جاتا ہے:

خَبَزَ الْقَوْمَ وَ تَمَرَهُمْ۔ لوگوں کو روٹی بھی کھلائی اور خرما بھی۔

اَلْخَابِزُ۔ روٹی والا۔
اَلْخَبَّازُ۔ نانبائی۔
قرآن حکیم میں ہے:
وَقَالَ الْآخَرُ اِنِّیْٓ اَرٰنِیْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا۔ (یوسف ۳۶)
[دوسرے نے کہا کہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر خوان میں روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں]

حضرت یوسف جب زندان میں تھے تو اس دَوران ان کا دو قیدیوں سے ربط و ضبط بڑھا، جو اُن کے مواعظ، زندگی اور کردار سے خاص طور پر یہ متاثر ہوئے تھے۔ ان دونوں نے ایک ایک خواب دیکھا اور چاہا کہ اس کی تعبیر حضرت یوسف سے دریافت کریں۔ ایک کا خواب یہ تھا کہ یہ انگور کا شیرہ نچوڑ رہا ہے۔ دوسرے نے یہ دیکھا کہ یہ اپنے سر پر خوان میں روٹیاں اٹھائے ہوئے ہے اور پرندے ان کو نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ حضرت یوسف نے پہلے خواب کے بارے میں تو فرمایا کہ تم بادشاہ کے مقرب بنو گے اور ساقی گری کی خدمت انجام دو گے۔ دوسرے کے متعلق کہا کہ تمھیں دار پر چڑھایا جائے گا۔ دونوں کے ساتھ بعینہٖ یہی معاملہ ہوا۔ ایک بادشاہ کا مقرب ہوا اور دوسرا سولی پر جھولا۔

تعبیر رؤیا کا تعلق سراسر ذوق و وجدان کی پاکیزگی سے ہے۔ یہ خداداد ملکہ ہے۔ ہمارے علما نے اگرچہ اس فن پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں تاہم یہ فن ہرگز نہیں۔ بلکہ فن سے کہیں زیادہ اسے فراست، علم اور اللہ تعالیٰ کے فیضانِ خاص سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس علم کی تہ میں دو اصول کارفرما ہیں۔ ایک یہ کہ خواب ہمیشہ مہیجات خارجی و باطنی کا نتیجہ نہیں ہوتا جیسا کہ جدید نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے۔ اس کے برعکس اس میں کبھی کبھی رمز و اشارہ کے لطائف بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ذہن انسانی کی اڑان صرف ایسی

فضا میں نہیں ہوتی جس کو زمان و مکان کی حدبندیاں ترتیب دیتی ہیں بلکہ اس
اڑان کا رشتہ ماورائی احوال وکوائف سے بھی ہے۔ یہی وجہ ہے ہمیں
کبھی خواب میں اور کبھی وجدان میں مستقبل کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔

خ ب ط

خَبَطَ۔ پاؤں سے روندا، مارا، ٹیڑھا ٹیڑھا چلا۔

کہا جاتا ہے۔

اِنَّہٗ یَخْبِطُ خَبْطَ عَشْوَاءَ۔ وہ اس اونٹنی کی طرح ٹیڑھا ٹیڑھا چلا
ہے جسے رتوندی کا عارضہ لاحق ہو۔

خَبَطَہُ الشَّیْطَانُ۔ اس کو بھوت پریت نے دیوانہ کر دیا ہے۔

خُبِطَ۔ اُسے زکام ہو گیا۔

رَجُلٌ مَخْبُوْطٌ۔ وہ شخص جسے زکام ہو۔

اَلْخُبَاطُ۔ پاگل پن۔ دیوانگی۔

کہا جاتا ہے:

خَبَطَہٗ بِالسَّیْفِ۔ اس نے اس کو تلوار سے مار ڈالا۔

تَخَبَّطَتِ الْبِلَادُ۔ شہروں میں قحط پڑ گیا۔

مَالَہٗ خَابِطٌ وَّلَا نَاطِحٌ۔ نہ اس کے پاس اونٹ ہے اور نہ بیل یعنی
وہ مفلس ہے۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔

قرآن حکیم ہے:

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ
یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ۔ (البقرۃ: ۲۷۵)

[جو لوگ سود کھاتے رہتے ہیں وہ لوگ نہ کھڑے ہو سکیں گے، سوا اس کے
کہ جیسے وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے خبطی بنا دیا ہو]

منظر قیامت کا ہے کہ جب سُود خوار قبروں سے نکلیں گے تو یوں گھبرائے ہوئے اور مضطرب کہ ٹانگیں لڑکھڑا رہی ہیں۔ گویا مسِ شیطانی نے ان سے عقل و حواس کو چھین لیا ہے اور یہ پاگلوں کی طرح کھڑے اپنے اس انجام کو دیکھ رہے ہیں جس کی ان کو ہرگز توقع نہ تھی ان کا خیال تو یہ تھا کہ جس طرح دنیا میں ان کو ان کے مالدار ہونے کی وجہ سے عزت و توقیر سے دیکھا جاتا تھا اسی طرح یہاں بھی ان سے اچھا سلوک کیا جائے گا۔ لیکن یہاں کا تو معاملہ ہی جدا ہے۔ یہاں مال و دولت کے بجائے قدر و منزلت یا نجات کا معیار کردار ہے، ایمان ہے، عمل اور نیکی ہے۔ مالدار سے تو الٹا یہاں یہ پوچھا جائے گا کہ تو نے مال و دولت کیونکر جمع کیا، کس کس کا حق مارا، کس کس کا استحصال کیا۔ اور کس کس کی زندگی میں افلاس اور کس مپرسی کا زہر گھولا۔ یعنی تمہاری خوئے حرص و آز کی وجہ سے کتنے گھرانوں کا امن و چین برباد ہوا، یا کس کس بیوہ اور یتیم کا تم نے خون چوسا اور انھیں موت کے گھاٹ اتارنے کی مذموم کوشش کی۔

یہاں مسِ شیطانی کا استعمال مجاز و تشبیہ کی بنا پر ہوا ہے، امرِ واقع کی بنا پر نہیں۔ جیسے اردو میں ہم کہتے ہیں کہ وہ یوں خاموش ہے جیسے اس کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ حالانکہ نہ سانپ کسی کو سونگھتا ہے اور نہ اس کے نتیجے میں کوئی شخص خاموشی اختیار کرتا ہے۔ یہ محض تشبیہ اور مجاز کی ایک شکل ہے۔

خ ب ل

خَبَلَ - بگاڑا - تباہ کیا۔

کہا جاتا ہے:

بِہٖ خَبْطٌ وخَبَلٌ - اسے جنون کا عارضہ ہے۔

خَبَلَہ الجِنّ - بھوت پریت نے اس کی عقل کو مسخ کر ڈالا ہے۔

خَبَلَہ العشق - عشق نے اس کی عقل کو بگاڑ دیا ہے۔

عَاشِقٌ مُخْبَلٌ ۔ دیوانہ عاشق ۔
خَبَلَ یَدَہٗ ۔ اُس کا ہاتھ کاٹ ڈالا ۔ اسے لنجا کر دیا، ہاتھ مفلوج اور بے حس کر دیا ۔
فُلَانٌ خَبَالٌ عَلٰی اَھْلِہٖ ۔ وہ اپنے گھر والوں پر بوجھ ہے ۔
دَھْرٌ خَبِلٌ ۔ برا زمانہ ۔
خَبَالٌ ۔ فساد، بگاڑ، نقصان ۔
اَلْخَابَل ۔ شیطان، بھوت پریت ۔

قرآن حکیم میں ہے :

لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا ؕ (آل عمران : ۱۱۸)

[وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھتے]

سباق آیت یہ ہے کہ کفار اور اعدائے اسلام سے جو ہمیشہ تم سے برسر پیکار رہتے ہیں دوستی اور مودت کے رشتے استوار نہ کرو ۔ ان سے معاہدہ ہو سکتا ہے، سیاسی اور کاروباری تعلقات بھی قائم کیے جا سکتے ہیں لیکن یارانہ نہیں گانٹھا جا سکتا، دوستی نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کی سرشت میں مسلم دشمنی کے جراثیم سرایت کیے ہوئے ہیں ۔ چنانچہ جب بھی یہ موقع پاتے ہیں مسلمانوں کو دھوکہ دینے، نقصان پہنچانے اور ان کی صفوں میں بگاڑ اور فساد پیدا کرنے کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے ۔

خ ب و

خَبَا ۔ خَبْوًا ۔ آگ بجھ جانا، حدت اور تیزی کا دھیما پڑنا ۔
خَبٰی ۔ چھپانا ۔
اَخْبٰی ۔ خیمہ لگانا ۔
اَلْخِبَاءُ ۔ چھلکا، پردہ ۔

کہا جاتا ہے:

خَبَتْ حِدَّةُ النَّاقَه۔ اونٹنی کا جوش و غضب ماند پڑ گیا۔

اَلْحَبُّ فِي خِبَائِهٖ۔ دانہ غلاف کے اندر ہے۔

هُمْ اَهْلُ الْخِبَاءِ۔ وہ خیموں میں رہنے والے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل:۹۷)

[جب وہ آگ ذرا بھی دھیمی ہونے لگے گی ہم اسے اور بھڑکا دیں گے]

یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو حیاتِ اُخروی کے قائل نہیں تھے۔ جو برملا یہ کہتے تھے کہ "جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو بھلا کیا ہم اس وقت دوبارہ پیدا کیے جائیں گے"۔ یعنی ان کے نزدیک زندگی صرف امتزاجِ عناصر سے تعبیر ہے اور جب ان عناصر ہی میں باہمی ربط و ضبط نہ رہا تو زندگی کا شعلہ آپ سے آپ بجھ جائے گا۔ اس صورت میں کہاں کا حشر نشر اور کیسا محاسبہ اور سزا جزا کا تصوّر۔ جب آیندہ زندگی کا امکان ہی نہیں تو پھر ہم بالکل آزاد ہیں۔ جو چاہیں مانیں، جس کو چاہیں پوجیں، اور اپنی خواہشاتِ جسمانی کی آسودگی کا جس طرح چاہیں اہتمام کریں۔ ہم پہ اخلاقی و دینی قدغن اور پابندیاں عائد کرنے والا کون ہوتا ہے۔

اس آیت میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ منکرینِ آخرت کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔ ان کے انکار و کفر کا انجام بہت بُرا ہے۔ انھیں ایسی آگ میں جلنا اور اس کی اذیّتوں سے مسلسل و پیہم دوچار ہونا ہے جو کسی بھی مرحلے میں دھیمی پڑنے والی اور ٹھنڈی ہونے والی نہیں۔

آخرت کا عقیدہ ایسا جانا بوجھا اور مسلمہ ہے جس کو تمام بڑے مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ میں تسلیم کیا ہے۔ عمل، نیکی اور پاکبازی کا تمام تر مدار یومِ حساب کے تصوّر پر ہے۔ زندگی سے متعلق یہی وہ مثبت اور پُرمنفعت نقطہ نظر ہے،

جس سے اخلاق، کردار اور ذمہ داری کا احساس ابھرتا ہے۔ اس لیے کہ اگر زندگی کا کارواں آگے نہیں بڑھتا، پھیلتا پھولتا اور ترقی نہیں کرتا۔ یا حساب و محاسبہ اور سزا و جزا کے متعلق عمل سے بے نیاز ہے تو پھر یہ زندگی زندگی ہی نہیں کچھ اور ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آپاتی کہ آخرت کے عقیدے میں آخر استحالہ کیا ہے اور اس کو مان لینے میں قباحت یا تناقص کیا لازم آتا ہے۔ جس خدا نے اس پوری کائنات کو وجود کا خلعت پہنایا وہ اس پہ کیوں قادر نہیں کہ انسان کو دوبارہ زندگی سے بہرہ ور کر سکے۔

آخرت کے مسئلے میں کئی نکات اور سوالات کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ مثلاً یہ کہ اگر پوری کائنات میں علت و معلول کا قانون جاری و ساری ہے تو خیر و شر میں کیوں نہیں۔ اگر آخرت کا تصور باطل ہے تو پھر اس زندگی میں جو ناہمواریاں اور تضادات پائے جاتے ہیں ان کے ازالے کی اس کے سوا اور کیا متبادل صورت ذہن میں آتی ہے۔ اگر زندگی قدرت کا عظیم و حسین مظہر ہے تو یہ مکمل کیوں نہیں۔ زندگی کے تصور میں غرض و غایت اور مقصدیت کی جھلک نمایاں ہے تو یہ منزل مقصود تک رسائی حاصل کرنے سے پہلے ہی کیوں دم توڑ دے۔ زندگی امتزاج عناصر سے مختلف اور بالکل ایک زائد شئی یا معنی ہے جسے جسم سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ اسے دوبارہ کیوں کسی جسم سے منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اور اس نوع کے سوالات و نکات پر غور کرنے سے حقیقتِ مسئلہ نکھر کر فکر و نظر کے افق پہ تابندہ ہوگی کہ ایمان کے ساتھ فکر اور تدبر شرط ہے۔

خ ت ر

خَتَرَ۔ بے وفائی یا غداری کرنا۔ علامہ زمخشری نے اس کے معنی بدترین قسم کی غداری کرنے کے کیے ہیں۔

ختر۔ بے حس کرنا۔ کہا جاتا ہے۔

خَتَّرَہُ الْخَمر - شراب نے اسے بے حس کر دیا۔ سُست کر دیا۔
خَتارٌ - غدار، بے وفا اور بد عہد۔
قرآن حکیم میں ہے:
وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا کُلُّ خَتَّارٍ کَفُوْرٍ ۝ (لقمان: ۳۲)
[اور ہماری آیتوں کے منکر تو بس وہی ہوتے ہیں جو بد عہد اور ناشکرے ہیں]
یہ کائنات رب دانش و حکمت کی آفریدہ ہے، اس لیے قدم قدم پر اور ذرّہ ذرّہ پر اس کی حکمت و دانائی، اس کے کرم و عنایت اور ربوبیت کی داستانیں رقم ہیں۔ لیکن ان داستانوں کے مطالعہ کے لیے بصیرت و تدبر، سعی، فکر و تامل اور جذبۂ سپاس گزاری شرط ہے۔ اسی آیت سے قبل اس حقیقت کو قرآن حکیم نے یوں بیان فرمایا ہے:
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ (لقمان: ۳۱)
[بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر صابر شاکر کے لیے]
یعنی کائنات کی اعجوبہ کاریوں پر غور و فکر کرنے اور اُن سے حکمت و دانائی کے نتائج اخذ کرنے کے لیے اور خصوصیت سے اس حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کے لیے صبر و شکر کی فراوانیاں درکار ہیں کہ اس عالم رنگ و بو کی تخلیق و آفرینش نہ تو بخت و اتفاق کی رہینِ منت ہے اور نہ یہ بے مقصد اور بے جان اسباب و علل گورکھ دھندے سے عبارت ہے بلکہ اس کو پیدا کرنے، سنوارنے اور اس کی نوک پلک میں جس دستِ ہنر پرور کا ہاتھ ہے وہ خدائے قادر و حکیم کی ذاتِ ستودہ صفات ہے جس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔
لیکن جس کے دل میں کھوٹ، کفر اور اس عہد سے غداری و بے وفائی کا جذبہ پایا جائے، جس کا تعلق عہدِ الست یا فطرتِ انسانی کے اقتضا سے ہے تو اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی۔

خ ت م

خَتَمَ - مُہر لگانا، ختم کرنا، انگوٹھی پہنانا، مٹی وغیرہ سے برتن کو بند کر دینا۔ کہا جاتا ہے:

خَتَمَ الْكِتٰبَ: کتاب اچھی طرح پڑھ لی۔

خَتَمَ عَلَيْكَ بَابَهٗ - اس نے تم پر اپنے گھر کا دروازہ بند کر دیا۔ یعنی تم سے اعراض روا رکھا۔

خَتَمَ الزَّرْعَ - کھیتی کو پہلی بار سینچ لیا۔

خَتَّمَهٗ - اس کو انگوٹھی پہنائی۔

اَلتَّحْمِيْدُ مُفْتَتَحُ الْقُرْاٰنِ وَالْاِسْتِعَاذَةَ مُخْتَتَمُهٗ - حمد و ستائش قرآن کا نقطۂ آغاز ہے اور استعاذہ اس کا نقطۂ اختتام۔

خَتَمَ النَّحْلُ - شہد کی مکھی نے شہد کے خلیوں کو شہد سے بھر دیا۔

اَلْخَتْمُ - انگوٹھی۔

خَاتِم و خَاتَم - انگوٹھی، انجام، آخری۔

خِتَامٌ - مُہر لگانے کی مٹی وغیرہ، شراب کا آخری گھونٹ، آخری جُرعہ۔

قرآن حکیم میں ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (البقرہ: ۷)

[مہر لگا دی ہے اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کی شنوائی پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے]

دلوں اور کانوں پر مُہر لگا دینے کا مطلب یہ ہے کہ قریش مکہ کی کجروی، گمراہی اور حق کے مقابلے میں ہٹ اور ضد اس مقام تک پہنچ گئی ہے کہ اب گویا یہ بہرہ ہو گئے ہیں اور سچی بات سننے پر ہرگز آمادہ نہیں۔ اندھے ہو

گئے ہیں، لہٰذا اللہ کی روشن اور تابندہ نشانیوں کو دیکھنے کے روادار نہیں۔ دلوں کی وضع ایسی ہو گئی ہے کہ ان میں کوئی سچائی اور حق بات نفوذ نہیں کر پاتی۔

انسان جب نیکی اور حق کی پذیرائی سے مسلسل اعراض کناں رہتا ہے تو اس کے فہم و بصیرت کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ نہ روشنی اسے دکھائی دیتی ہے اور نہ نیکی اس کی نظروں میں جچتی ہے۔ کفر و عناد کی اس نفسیاتی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے بکمال بلاغت و استعارہ کے انداز میں بیان کیا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ (المطففین: ۲۶)

[جس پر مُشک کی مُہر ہو گی۔]

جنت میں اہلِ ایمان کی جو مہمان نوازی ہو گی اس میں پاکیزہ، لذیذ اور خوشبودار شراب بھی داخل ہے۔

آیت کے دو معنیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ یہ شراب جن ظروف میں پیش کی جائے گی ان پر مشک کی مہر ہو گی تاکہ جونہی یہ مہر ٹوٹے ساری فضا مشک کی خوشبو سے مہک اُٹھے۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ یہ شراب ایسی ہو گی کہ اس کے آخری جرعوں میں مشک کی مہک ہو گی۔

راغب نے دوسرے معنوں کو اس بنا پر اختیار کیا ہے کہ شراب کی اپنی مہک ہوتی ہے اس میں اگر مشک کی آمیزش ہو جائے تو کیا کہنے۔ مُہر کے خوشبودار ہونے سے شراب کی کیفیت اور مزے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

قرآن حکیم میں ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ (الاحزاب: ۴۰)

[محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں البتہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے ختم پر ہیں]

بظاہر تو آنحضرت کے خاتم النبیین ہونے کے یہ معنی ہیں کہ آپ سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں اور آپ کے بعد فیضانِ ربوبیت کی یہ شکل باقی نہیں رہنے کی۔ لیکن غور کیجیے تو اس سے مطلوب اس حقیقت پر روشنی ڈالنا ہے کہ وہ دین جس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ہزاروں انبیا آئے، اب تکمیل و اتمام کی اس منزل تک پہنچ گیا ہے کہ اس کے آگے رشد و ہدایت کی اور کوئی منزل ہی نہیں۔ یعنی آنحضرت نے رشد و ہدایت کے وہ تمام طور طریقے اور پیمانے متعین کر دیے ہیں جن سے قیامت تک کے لیے ہم استفادہ و استفاضہ کے عمل کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ گویا آنحضرت کے بعد نبوت و رسالت کے کواڑوں کو بند کر دیا گیا ہے اور اب کوئی نیا رسول اور نیا پیغمبر آنے والا نہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ اسلام کے نزدیک معاشرہ ساکن و راکد ہے اور اس میں آیندہ کوئی تبدیلی اور تغیر رونما ہونے والا نہیں۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں، آیندہ وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں سے نمٹنے کے لیے اسلام میں اجتہاد کا ایک ایسا اصول موجود ہے، جس کی روشنی میں ہر نئے مسئلے کا حل ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

قرآن کا اعجاز دیکھیے کہ چودہ صدیاں ہوتی ہیں، کوئی ایسا شخص کبھی تو پیدا نہیں ہوا جس نے اسلام سے ہٹ کر اور اسلامی تعلیمات سے قطع نظر کر کے نوعِ انسانی کو ایسا جامع پیغام دیا ہو جو اس کی زندگی کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہو، اور اس کے جملہ امراضِ روحی و جسدی کا تسلّی بخش مداوا ہو۔

خ د د

اَلْخَدُّ۔ طریق، چھوٹی ندی، افسار مستطیل گڑھا، لمبی کھائی، گروہ،

طبقہ۔ کہا جاتا ہے:

مضٰی خَدٌّ مِنَ النَّاس۔ لوگوں کا ایک طبقہ آگے بڑھ گیا۔

خَدَّدَ۔ مہمان کی آؤ بھگت کی۔ اس کو بیٹھنے اور ٹیک لگانے کے لیے تکیہ دیا۔

بَعِیْرٌ مُخَدَّدٌ۔ وہ اونٹ جس کے رخسار پر داغ یا نشان ہو۔

تَخَدَّدَ۔ دُبلا ہو گیا، جسم پر جھریاں پڑ گئیں۔

تَخَدَّدَ الْقَوْمُ۔ قوم ٹکڑیوں میں بٹ گئی۔

اُخْدُوْدٌ۔ جمع اَخَادِیْد۔ کھائی، لمبا گڑھا، خندق۔

قرآن حکیم میں ہے:

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ (البروج: ۴)

[غارت ہوئے خندق والے]

کتب حدیث اور تفسیر میں اس نوع کے کئی واقعات مذکور ہیں جن میں اہلِ حق کو آگ کی بھٹی میں جھونکا گیا۔ لیکن ان سے ان کی حرارتِ ایمانی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ سرمستانِ مئے توحید آگ میں کود کود پڑے اور سخت ترین اذیتوں کو ہنسی خوشی برداشت کیا۔ مگر اُن کے لیے یہ کسی طرح گوارا نہیں ہوا کہ اپنی زبان کو کلماتِ کفر سے آلودہ کریں۔

یہاں جس واقعہ کا ذکر ہے، جمہور کی یہ رائے ہے کہ اس کا تعلق حمیری خاندان کے اس سفاک سے تھا، جس کا نام فردنوس تھا۔ اس نے یمن میں عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ ان کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ کیونکہ یمن میں نہ صرف عیسائیت پھل پھول رہی تھی، بلکہ اس کے ساتھ عیسائیوں کی اقتصادی حالت بھی سدھر رہی تھی اور اندیشہ پیدا ہو چلا تھا کہ مبادا عیسائی یمن کی کاروباری منڈیوں پر چھا جائیں، کہا گیا کہ تم عیسائیت کو ترک کر کے کفر کی راہ پر دوبارہ لوٹ آؤ۔۔۔ عیسائیوں نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شہر کے ارد گرد

خندقیں کھودی گئیں اور ان میں آگ دہکا کر ہزاروں کی تعداد میں عیسائیوں کو بے دریغ اس میں جھونک دیا گیا۔

ثباتِ قدمی، ایمان کی استواری اور اپنے دین سے عشق و محبت کا یہ منظر خوفناک ہونے کے باوجود کس درجہ حیات افروز ہے۔ تاریخ کے صفحات میں وہی تو ہیں بقائے دوام کی سزاوار ٹھہرتی ہیں جو کڑی سے کڑی آزمائش جھیل جائیں اور اپنے عقیدے سے منحرف نہ ہوں۔

خ د ع

خَدَعَ - دھوکا دینا، خلافِ حقیقت طرزِ عمل اختیار کرنا۔ کہا جاتا ہے۔

خَدَعَ الْمَطَرُ۔ بارش کم ہوئی۔

خَدَعَتِ السُّوْقُ - بازار ماند پڑ گیا۔

خَدَعَتِ الشَّمْسُ - آفتاب غروب ہو گیا۔ چھپ گیا۔

خَدَعَتِ الطَّرِيْقُ - راستہ الجھ گیا۔

طَرِيْقٌ خَادِعٌ، وہ راستہ جو اصل راستے سے ہٹا ہوا ہو۔

خَيْدَعٌ - چمکتا ہوا ریت جس پہ پانی کا شبہ ہو، ناقابلِ اعتبار شخص۔

رَجُلٌ خَادِعٌ - نکما اور بیکار شخص۔

اَخْدَعٌ - گردن کی ایک باریک رگ، جو نظر نہیں آتی۔ کہا جاتا ہے:

لَوّٰى فُلَانٌ اَخْدَعَهٗ - اس نے اظہارِ کبر کیا، اعراض کیا۔

اَلْمِخْدَعُ - کوٹھڑی جو بڑے کمرے کے اندر ہو۔

اَلْمُخْدَعَةُ - دھوکہ، مکر، چال۔

خَادَعَ - دھوکہ دیا۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ۔ (البقرہ: ۹)

[اور وہ خود ہی دھوکے میں پڑے ہیں]

منافقین کا شیوہ تھا کہ ایک طرف تو اسلامی معاشرے کی کھلی ہوئی اور واضح منفعتوں میں شریک رہنے کی غرض سے اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے۔ دوسری طرف دلوں میں کفر و عناد کی خباثتیں چھپائے رکھتے اور بزعمِ خود یہ سمجھتے کہ اس طرح ہم مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ قرآن حکیم کی اس آیت میں ان کی اس غلط فہمی کا پردہ یوں چاک کر دیا گیا کہ جسے تم مسلمانوں کو فریب دینا کہتے ہو، اس پر غور کرو، وہ تو خود تمہارے ساتھ ایک طرح کا فریب ہے جس کو تم خود ہی روا رکھ رہے ہو۔ سوچو اس چالاکی کا وبال آخر کس پر ہے، مسلمانوں پر یا تم پر۔ یعنی دنیا میں ذلیل کون ہوا اور عقبیٰ کی محرومیوں سے دوچار کون ہوگا، مسلمان یا تم لوگ؟

دراصل کسی عقیدہ کے بارے میں دو ہی شجاعانہ موقف ہیں۔ یا تو اس کو ماننے سے صاف انکار کرو، اور یا پھر آگے بڑھ کر اس کو قلب و ذہن کی گہرائیوں میں اتار لو۔ نفاق بہرحال بزدلی ہے اور اس کے ساتھ نفسیاتی مرض بھی اور ایسا روگ بھی ہے کہ جس سے انسان کی شخصیت بالکل تباہ ہو جاتی ہے۔ اور اس کے مرتکب سے یقین و آگاہی کی دولت چھین لی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ نہ حق اور سچائی پر یقین رکھتا ہے، نہ کفر اور جھوٹ کے لیے اپنے سینے میں کوئی جوش و خروش محسوس کرتا ہے۔

خ د ن

اَلْخِدْنُ - دوست، آشنا، ساتھی۔ مذکر و مونث اور اچھے اور برے دوست دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے:

هُوَ خِدْنِی۔ وہ میرا دوست ہے۔

هُمْ اَخْدَانُ صِدْقٍ۔ وہ سچے دوست ہیں۔ اچھے دوست ہیں۔

هُمۡ اَخۡدَانُ سوء - وہ برے دوست ہیں۔
خَادَنۡتُہٗ - میں نے اس سے دوستی کی، یارانہ گانٹھا۔
قرآن حکیم میں ہے:
وَلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ ؕ (النساء: ۲۵)
[اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والیاں]
ان آیات میں باندیوں کو حق دیا گیا ہے کہ وہ مالکوں کی رضامندی سے قیدِ نکاح میں آکر اپنے درجہ و منزلت میں اضافہ کر سکیں، اور مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ بغیر کسی عار کو محسوس کیے وہ اچھے چال چلن کی لونڈیوں کو اپنے حرم میں بار پانے کی اجازت دیں، تاکہ لونڈی اور آزاد مسلمان عورت میں تفریق و امتیاز کی جس دیوار کو اس دور کی اجتماعی مجبوریوں نے کھڑا کر رکھا ہے، وہ ایک حد تک گر جائے۔
اُس زمانے میں باندیاں چونکہ کھلے بندوں گھومتی پھرتیں اور مختلف گھرانوں اور لوگوں سے ربط و ضبط رکھتی تھیں، اس لیے ان کا کردار بسا اوقات بگڑ جاتا۔ اس آیت میں نکاح کی حرمت، تقدس کے پیشِ نظر فرمایا کہ تمھارے دائرۂ عقد میں آنے والی لونڈیوں کے لیے عفیف اور پاکباز ہونا ضروری ہے۔ ایسی عورتیں تمھاری زوجیت میں نہیں آسکتیں جو کھلے بندوں بدکردار یا چوری چھپے آشنائی کرنے والیاں ہوں۔
یہاں "خِدن" کے معنوں میں "چوری چھپے کی دوستی" تقاضائے سیاق کی وجہ سے ہے ورنہ اس کے اصل معنی عام دوستی ہی کے ہیں۔

خ ذ ل

خَذَلَ - مدد نہ کرنا، مدد چھوڑ دینا، پیچھے رہ جانا۔ کہا جاتا ہے۔
خذلت الظبیہ - ہرنی ریوڑ سے پیچھے رہ گئی۔

خَذَلَ ۔ کم ہمتی پر اکسانا، مدد نہ کرنے پر آمادہ کرنا۔
الاحنف کو اَلْمُخَرِّلُ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو جنگ جمل میں حضرت عائشہ صدیقہ کی مدد سے باز رہنے پر اکساتا تھا۔
تَخَاذَلَتْ رِجْلَاہُ ۔ اس کے دونوں پاؤں کمزور ہو گئے، ایک دوسرے کی مدد نہیں کر پاتے۔
رَجُلٌ خَذُوْلٌ ۔ ایسا آدمی جو ساتھ چھوڑ کر رہنے والا ہو۔
قرآن حکیم میں ہے:
وَكَانَ الشَّيْطٰنُ خَذُوْلًا ہ (الفرقان: ۲۹)
[اور شیطان تو انسان کو امداد کرنے سے جواب دے ہی دیتا ہے]
یوم حشر جب شریر اور گنہ گار لوگ اپنے نامۂ اعمال کو دیکھیں گے تو پچھتائیں گے کہ کیوں نہ ہم نے رسول کی پیروی کی اور کیوں نہ ان دوستوں کی رفاقت سے دست کش ہوئے، جنھوں نے ہمیشہ ہم کو برائی کی راہ ہی پر ڈالا۔ قرآن حکیم کی اس آیت میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ برائی، برے لوگ اور شر پر آمادہ کرنے والے شیاطین اور شیطانی قوتیں، عاقبت میں ہرگز کام آنے اور مدد کرنے والی نہیں۔ عقیدہ و عمل کی پاکیزگی اور نیکی ہی کام آئے گی، وہاں تو صرف یہ پوچھا جائے گا کہ تم اپنی ادنیٰ خواہشات ہی کی تکمیل و اتمام میں مصروف رہے یا خدا اور رسول کے پیغام کو بھی تم نے سنا، سمجھا اور اس پر عمل پیرا ہونے کے بارے میں کبھی سنجیدگی سے غور کیا۔
مقامِ حشر ان لوگوں کے لیے کس درجہ عبرت کا مقام ہو گا کہ جن غیر اللہ قوتوں پر دنیا میں بھروسہ کرتے آئے، جن لوگوں کو یہ اپنا دوست اور رہ نما گردانتے آئے اور جن عقائد و نظریات کی تائید میں یہ صبح و شام سرگرداں رہے، انجام کار یہ سب کے سب بودے کھوکھلے اور بے کار سہارے ثابت ہوئے۔ ان میں کوئی شخص اور کوئی بھی چیز تو کام نہ آئی۔

"کَانَ الشَّیْطٰنُ" کی ترکیب اس حقیقت پر دلالت کناں ہے کہ بُرائی، شمر اور شیطان سے کبھی نفع کی امید نہ رکھو۔ کیونکہ ان کی فطرت ہی میں دھوکا اور بے وفائی داخل ہے۔

خ ر ب

خَرِبَ الْبَیْتُ ۔ گھر ویران ہو گیا۔

خَرَّبَ الْبَیْتَ ۔ گھر کو ویران کر دیا، ڈھا دیا۔

اَلْخُرْبَةُ ۔ خلل، بگاڑ، فساد، چھید ۔ کہا جاتا ہے:

مَا فِی دِیْنِهٖ مِنْ خُرْبَةٍ ۔ اس کے دین میں کوئی خلل نہیں ۔

فِی اُذُنِهٖ خُرْبَةٌ ۔ اس کے کان میں چھید ہے ۔

فلان خُرْبٌ ۔ وہ بزدل ہے ۔

هُوَ خَرِبُ الْاَمَانَةِ ۔ وہ امانت کے معاملے ناقابلِ اعتماد ہے ۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ؕ (البقرہ: ۱۱۴)

[اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ کی مسجدوں کو اس سے روک دے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے]

مسجدیں اللہ کا گھر ہیں۔ ان کی تعمیر کا اولین مقصد ہی یہ ہے کہ ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے، اس کی تعلیمات پر عمل کیا جائے اور اس کے لیے ایسے لوازم مہیا کیے جائیں، جن سے دلوں میں اللہ کی محبت کے سوتے جاری ہوں، اللہ سے عبودیت و بندگی کا تعلق بڑھے اور اس سے فکری و عملی آشنائی کا ولولہ پیدا ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص مسجدوں میں لوگوں کو ذکرِ الٰہی سے روکتا ہے اور ایسے حالات پیدا کرتا ہے کہ جس سے مسجد کی رونق کم ہو اور لوگ مسجدوں میں

جا کر انوار و کوائف روحانی سے بہرہ مند نہ ہو سکیں۔ تو وہ ذکر الٰہی کے ان مقدس مقامات کی ویرانی اور بربادی کا باعث بنے گا۔ ایسا شخص عند اللہ بہت بڑا ظالم ہے کہ اس ذاتِ گرامی کے ذکر سے انسانوں کو روکنے کا ذریعہ بنتا ہے جس کے ذکر سے دل مردہ نہ صرف زندگی کی نشاط آفرینیوں کا مرکز بن جاتا ہے بلکہ قلب و ضمیر کے اجالوں سے منور و مستنیر بھی ہوتا ہے۔

مسجدوں کے بارے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بنی نوع انسان کے لیے یہ آزاد عبادت گاہیں ہیں۔ ان کا تعلق کسی گروہ فرقہ اور جماعت کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہر شخص جو اللہ کو پوجنا چاہتا ہے، اللہ کا نام لینا چاہتا ہے اور اس کے سامنے طلب و سوال کا دامن پھیلانا چاہتا ہے۔ اس بات کا مجاز ہے کہ مسجدوں میں آئے اور اپنے آقا و مولا کے آگے عقیدت و نیاز کے نذرانے پیش کرے۔

خ ر ج

خَرَجَ - اپنی جگہ، مقام یا صورت حال سے باہر آیا۔ نمودار اور آشکار ہوا۔

خَرَجَ فِی الْعِلْمِ - علم میں آگے نکل گیا۔ فائق ہوا۔

خَرَجَ عَلَیْہِ - اس کے خلاف بغاوت کی۔

خَرَجَتِ السَّمَآءُ - بادل چھٹ گیا اور آسمان اپنی اصلی حالت پر لوٹ آیا۔

خَرَّجَ الغلام لوحہ۔ لڑکے نے تختی پر کچھ لکھا، کچھ چھوڑ دیا۔

خَرَّجَ الْاَرْضَ - زمین کا خراج مقرر کیا۔

تَخَرَّجَ الْوَلَد - بچہ تعلیم یافتہ ہو گیا۔

اِسْتَخْرَجَ الشَّیَٔ - استنباط کیا۔ مسئلے کا حل پیش کیا۔

اَلْخَرْجُ - خراج، بادل جب افق پر پہلے پہل نظر آئے۔

اَلْخَارِجِی - باغی، ایک فرقہ جس نے حضرت علی کی مخالفت کی۔ ایسا شخص

جو خوبی یا بُرائی میں قوم سے مختلف ہو۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَّتَرَقَّبُ۔ (القصص: ۲۱)

[سو موسیٰ وہاں سے نکل کھڑے ہوئے خوف و اندیشہ کے ساتھ]

حضرت موسیٰ اس سے پہلے کہ منصبِ نبوت پر فائز ہوں، ایک قبطی سے اس کی زیادتی اور ظلم کی وجہ سے جو وہ ایک اسرائیلی پہ ڈھا رہا تھا، الجھ پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قبطی مر گیا۔ اس حالت میں حضرت موسیٰ ڈر رہے تھے کہ کہیں حکومت کے آدمی ان کو اس جُرم میں پکڑ نہ لیں۔ اتنے میں ان کے ایک مخلص دوست نے اطلاع دی کہ پولیس والے واقعی آپ کی ٹوہ میں ہیں، لہٰذا جتنی جلدی ہو سکے، آپ مصر چھوڑ دیں۔ حضرت موسیٰ نے ان کی اس نصیحت پہ عمل کیا اور مصر سے نکل کھڑے ہوئے۔ حضرت موسیٰ کی قبطی سے یہ جھڑپ محض ہمدردیٔ بنی نوع انسان کی وجہ سے تھی۔ ان کی غیرت نے یہ برداشت نہ کیا کہ قبطی حکمرانی کے غرہ میں غریب اسرائیلی پر زیادتی کا مرتکب ہو۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ (الکھف: ۹۴)

[تو کیا ہم آپ کے لیے کچھ سرمایہ جمع کر دیں جس سے آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دیں]

یہاں خرج سے مراد سرمایہ نہیں، اُجرت ہے۔ غرض یہ ہے کہ ہمیں اگر آپ یاجوج ماجوج کی تاخت سے محفوظ رکھنے کے لیے سدّ یا روک کی تعمیر میں مدد دیں تو ہم اس کا مناسب معاوضہ یا اُجرت ادا کر دیں گے۔

قرآن حکیم میں ہے:

اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝

(مومنون : ۷۲)

[کیا ان سے کچھ معاش طلب کرتے ہیں۔ سو معاش آپ کے پروردگار کی دی ہوئی سب سے بہتر ہے]

قریش اور قریش کے ائمۂ کفر سے خطاب ہے کہ تم آخر اللہ کے پیغام کو کیوں نہیں مانتے اور کیوں یہ بے جا توقع رکھتے ہو کہ پیغمبر تمھاری خواہشات کے مطابق اللہ کے احکام کو بدل دے گا۔ وہ تم سے کوئی اجر، معاوضہ اور معاشرہ تو طلب نہیں کرتا کہ اس کے بدلے میں تمھاری مشرکانہ توقعات کا احترام کرے اور ایک اللہ کی پرستش کے بجائے بتوں کی پوجا کا اعلان کرے۔

بعض فقہا اور صوفیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ تبلیغ و تعلیم دین پر معاوضہ طلب کرنا جائز نہیں۔

خ ر د ل

خَرْدَلٌ۔ رائی، رائی کا دانہ۔ اسے عربی میں حب الرشاد بھی کہتے ہیں۔ برہان قاطع میں مرقوم ہے کہ خردل فارسی الاصل ہے۔ اس کا اطلاق قلیل ترین مقدار پر ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝

(الانبیاء : ۴۷)

[اور اگر رائی کے دانے کے برابر کسی کا کوئی عمل ہوگا تو ہم اس کو بھی لا حاضر کریں گے اور حساب لینے والے ہم ہی کافی ہیں]

قرآن حکیم کی یہ اساسی تعلیم ہے کہ فکر و عمل کی کوئی جنبش اچھی ہو یا بُری، اثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ اچھے افکار، صحت مند نظریات، ایمان و عقیدہ، یعنی

سب کا ایک متعین حساب اور انداز ہے۔ ان کا اثر بہر حال ہماری جسمانی صحت پر بھی ہوتا ہے اور ذہنی اور نفسیاتی صحت پر بھی۔ یہ محاسبے کی ایک شکل ہے جس کا ہم دنیوی زندگی میں روزانہ تجربہ کرتے رہتے ہیں۔ اخروی زندگی میں ہمارے اعمال و افکار کی پوری تصویر، ہماری آنکھوں کے سامنے عیاں ہوگی۔ اور ہمارا ہر عمل اور ہر عقیدہ تولا اور جانچا پرکھا جائے گا۔ اسی حقیقت کا اس آیت میں اظہار ہے۔

خ رر

خَرَّ۔ راغب کے نزدیک اس کے معنی بلندی سے اس انداز میں گرنے کے ہیں جس سے آواز پیدا ہو۔

ابن فارس نے خَرَّ کے معنی چیرنے، شق کرنے اور پھاڑنے کے بھی کیے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے:

خَرَّ الماءُ الارْضَ۔ پانی نے زمین کو شق کر دیا۔

ایک معنی کہیں اترنے اور آ بسنے کے بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے:

الاعراب یخرون من البداوی الی القریٰ۔

بدوی صحراؤں کو چھوڑ کر شہروں اور قصبوں میں آ بستے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

كَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ ۔ (الحج : ۳۱)

[تو جیسے وہ گر پڑا آسمان سے]

ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے توحید کی صراط مستقیم کو چھوڑ کر شرک کی ٹیڑھی راہ اختیار کی، ان کی مثال ایسے لوگوں کی ہے جو انسانیت کی بلند تر چوٹی پر فائز ہونے کے بعد گمراہی کے گڑھوں میں آ پڑے، یا شرف و بزرگی کے آسمان پر مکین ہونے کے باوصف زمین پر آ رہے۔

دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں انسان جن جن عقائد و نظریات کو اختیار کرتا ہے ان میں توحید کے سوا کوئی رائے، نظریہ اور عقیدہ ایسا نہیں جو انسان کو معرفت و ادراک کی بلندیوں تک پرواز عطا کر سکے، عبادت و بندگی کی معراج تک پہنچا سکے اور انسانی شرف و خوبی کو آسمان تک اچھال سکے۔

قرآن حکیم میں ہے:

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۝ (مریم ۵۸)

[اور جب ان کے سامنے خدائے رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو زمین پر گر پڑتے تھے سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے]

حضرت ابراہیم، اسرائیل اور ان بندوں کے کمال عبودیت کا ذکر ہے کہ جب وہ خدا کے فضل و رحمت کی آیتیں اور فرمان سنتے تھے تو ان کے تاثر، خشیتِ الٰہی اور اظہارِ تشکر کا یہ عالم ہوتا تھا کہ زمین پر سجدہ کناں گر پڑتے اور ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے۔

خ رص

خَرْصٌ - جھوٹ، اٹکل سے کوئی بات کرنا۔ کسی عقیدہ و نظریہ کے اثبات کے لیے محض تخمین و ظن سے کام لینا۔ کہا جاتا ہے:

تَخَرَّصَ عَلَيَّ - اس نے مجھ پر تہمت لگائی۔ میرے بارے میں غلط بات کہی۔ مَا تَمْلِكُ فُلَانَةُ خُرْصًا - اس عورت کے پاس کچھ بھی نہیں۔

قَالَ ذٰلِكَ تَخَرُّصًا - اس نے یہ بات ظن و گمان کی بنا پر کہی۔

خَرَصَ النَّخْلَ - یہ اندازہ کیا کہ کھجور کے درخت سے کس قدر پھل حاصل ہو گا۔

قرآن حکیم میں ہے:

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (الانعام: ۱۱۶)

[یہ تو بس اٹکل ہی کی پیروی کرتے ہیں اور محض گمان میں پڑے رہتے ہیں]

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کتبِ الٰہیہ پہ ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بارے میں غور و فکر کی بنیاد محض اٹکل اور قیاس پہ رکھتے ہیں۔ اسلام عقل و دانش کا دین ہے اور چاہتا ہے کہ جو لوگ دینی مسائل اور حقائق پر تفحص و تحقیق سے کام لینا چاہتے ہیں وہ اثبات و انکار دونوں صورتوں میں فکر و عقل اور بصیرت و ادراک کے جانے بوجھے پیمانوں پر اعتماد کریں۔ دین کے معاملے میں صرف دو ہی ماخذ یقینی اور عقل و دانش کے قرین ہیں قرآن اور سنت۔ لہٰذا اگر کوئی شخص خالص دینی مسائل میں ان دو ماخذوں سے قطع نظر کر کے سوچتا اور اعتبار کرتا ہے تو وہ ظن و گمان کا زندانی ہے۔

اس آیت کے معنی بہت وسیع اور پھیلے ہوئے ہیں۔ علم و آگہی کی ہر وہ صورت جو غیر یقینی مفروضات پہ مبنی ہو، قرآن کے نزدیک 'خرص' یا جھوٹ ہے۔ علامہ راغب نے اس سلسلے میں بہت معقول اور جی کو لگتی ہوئی بات کہی ہے، جو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص استدلال میں غیر منطقی اور غیر معقول انداز اختیار کرتا ہے اور اس سے جس نتیجے پہ پہنچتا ہے وہ صحیح ہے تب بھی وہ خرص اور ظن و گمان کے دائرے میں داخل ہے۔ دست شناسی اور کسی شخص کے نام کے حروف و اعداد سے قسمت و مقدر کا تعین کرنا یا ستاروں کی قدرتی و طبعی چال سے مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرنا، یہ سب چیزیں، ان اوہام کا نتیجہ ہیں جو علم و آگہی کے غیر صحیح مفروضات یا خرص پہ مبنی ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ - (الذاریات ۷ - ۱)

[غارت ہوں اٹکل پچو باتیں بنانے والے]

اس آیت کریمہ میں عقائد و خیالات کے بارے میں اس عظیم حکمت کا انکشاف کیا گیا ہے کہ خرص اور علم میں اور خراص اور عالم میں امتیاز کیا شئے

ہے۔ علم یقین و آگہی اور شواہد و دلائل پر مبنی ہوتا ہے، اور خرص سنی سنائی باتوں اور اٹکل پچو قائم کیے گئے افکار سے عبارت ہے۔ علم آگے بڑھتا، پروان چڑھتا اور تکمیل و ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا تحقیق و تفحص کے نئے آفاق کی تلاش میں رواں دواں رہتا ہے۔ جب کہ وہ نظریے، عقائد، یا افکار جو کسی دلیل، تجربے اور منطق پر مبنی نہیں ہوتے، علم و آگہی کی کسی نہ کسی منزل میں ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ خراص جو اپنے دَور میں ان خیالات کی وجہ سے عوام میں حد درجہ مقبول اور عقیدت و احترام کا مرکز بن جاتے ہیں، اس وقت غارت ہو جاتے ہیں اور فکری اعتبار سے موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں، جب حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

اس آیت کا تعلق بھی دراصل ان لوگوں سے ہے جو آخرت کے بارے میں یونہی بغیر کسی ثبوت کے شکوک و شبہات کی گرد اڑاتے تھے۔

خ ر ط م

اَلْخَرْطُوْمُ ۔ ناک، تھوتھنی اور سونڈ۔ وہ شراب جو جلد نشہ پیدا کر دے۔

اس میں صرف ر زائد ہے۔ دراصل یہ لفظ خطم ہے اور قرآن حکیم میں صرف ایک ہی مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

خَرَاطِیْمُ الْقَوْمِ ۔ سربراہانِ قوم۔

وَسَمَہٗ علَی الْخُرْطُوْمِ ۔ تذلیل کے معنوں میں آتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

سَنَسِمُہٗ عَلَی الْخُرْطُوْمِ ۝ (القلم: ۱۶)

[ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگائیں گے]

مکّہ کے ان دشمنانِ حق و صداقت کے بارے میں ہے جو حد درجہ کے کمینے ذلیل، بلا دریغ جھوٹی قسمیں کھانے والے، چغل خور، نیکی سے نہ صرف خود

گریزاں بلکہ لوگوں کو باز رکھنے والے گنہ گار اور مزاج کے اکھڑ تھے۔ اور مزید براں جن کا حسب نسب بھی مشکوک تھا۔ قرآن ایسی انقلاب آفرین کتاب سے متعلق یہ کہتے تھے کہ اس میں اگلوں کی خرافات کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ ان میں کھاتے پیتے اور صاحب اولاد اشخاص بھی تھے۔ قرآن کی اس آیت میں ان کو یہ وعید سنائی گئی ہے کہ آج ان کو بلاشبہ جاہلوں میں جاہ و وقار حاصل ہے اور اسی جھوٹے اعزاز و وقار کے بل پر یہ اسلام کے خلاف گستاخانہ کلمات کہتے ہیں۔ یہ سن رکھیں کہ دنیا و آخرت دونوں جگہ یہ ذلیل ہوں گے۔ ان کی پیشانیاں اور ناک داغی جائے گی۔

یہ آیت وعید بھی ہے اور پیشین گوئی بھی۔ چنانچہ ان میں کئی بلند مرتبہ لوگ جنگ بدر میں بری طرح مارے گئے اور ذلیل ہوئے۔

خ ر ق

خَرَقَ۔ پھاڑا، سوراخ کر ڈالا، چھین لیا۔ نہج البلاغہ میں ہے خَرَقَتِ الشَّهَوَاتُ عَقْلَهُ شہوتوں نے اس کی عقل چھین لی۔

خَرَقَ الثَّوْبَ۔ کپڑا پھاڑ ڈالا۔

خَرَقَ الْكَذِبَ۔ جھوٹ گھڑا۔

خَرَقَ الْعَادَةَ۔ غیر معمولی بات کی۔

خَرِقَ۔ دہشت زدہ ہونا، بے وقوف ہونا۔

خَرِقَ فِي الْبَيْتِ۔ گھر میں مسلسل قیام کیا۔

کہا جاتا ہے:

لَا تَخْتَرِقْ فِي الْمَسْجِدِ۔ مسجد کو گزرگاہ نہ بناؤ۔

قرآن حکیم میں ہے:

حَتّٰى إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا۔ (کہف : ۷۱)

[یہاں تک کہ جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو اس میں سوراخ کر دیا]
یعنی حضرت خضر نے، جب حضرت موسیٰ و خضر ایک ہی کشتی میں سوار تھے، کشتی میں سوراخ کر دیا، تاکہ اس دور کا ظالم بادشاہ کشتی کو عمدہ و نفیس پا کر چھین نہ لے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍ (الانعام: ۱۰۰)

[اور لوگوں نے خواہ مخواہ اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تراش رکھی ہیں]
مشرکین کا یہ عقیدہ تھا کہ اس کائنات میں دیوتا اور دیویاں ہیں جنھوں نے اس عالم کا نظم و نسق سنبھال رکھا ہے اور یہی اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ جو ہماری دعاؤں کو سنتی اور ہماری ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔

یہاں خَرَقُوْا کا لفظ اس عقیدے کو گھڑ لینا اور تراش لینا ہے، جو بے دلیل اور احمقانہ ہو۔ لغت و ادب کی کتابوں میں ایسی امثلہ بھی ملتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خود اس لفظ کے اطلاق میں ضروری نہیں کہ ذم کا پہلو ضرور پایا جائے۔

خ ز ن

خَزَنَ ۔ مال وغیرہ جمع کرنا، اس کی حفاظت و نگرانی کرنا۔

کہا جاتا ہے:

خَزَنْتُ السِّرَّ ۔ میں نے راز دل میں محفوظ رکھا۔

اخزن لِسَانَكَ ۔ اپنی زبان لغزش خطا سے بچائے رکھ۔

اجعله فِي خِزَانَتِكَ ۔ اس کو دل کی گہرائیوں میں محفوظ کر لے۔

خَزِنَ اللحم ۔ گوشت میں بُو پیدا ہو گئی۔ بُو کی جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے سے غالباً یہ مناسبت ہے کہ گوشت کو اگر زیادہ دیر تک ذخیرہ

کر کے رکھا جائے تو اکثر اس میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔

ابنِ فارس نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ دراصل یہ لفظ مقلوب ہے اصل میں خَنِزَ تھا جس کے معنی بدبو دار ہونے کے ہیں۔

خِزَانَہ ۔ جہاں چیزیں یا اموال جمع کی جائیں۔

اَلْمَخْزَنُ ۔ ذخیرہ کرنے کی جگہ۔

مَخَازِنِ الطَّرِیْق ۔ مختصر ترین راستہ۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَلِلّٰہِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَفْقَهُوْنَ ۝ (المنافقون ۷)

[حالانکہ اللہ ہی کے تو ہیں آسمانوں اور زمین کے خزانے، البتہ منافق نہیں سمجھتے]

منافقین مدینہ انصار کو یہ کہہ کر ورغلاتے تھے کہ تم اگر مہاجرین کی مدد سے ہاتھ کھینچ لو تو یہ اسلام و ایمان سب کچھ کھو جائیں۔ قرآن کی اس آیت میں ان کی تنگ ظرفی پر طنز ہے اور اس حقیقت کا اظہار ہے کہ آسمانوں اور زمین میں اللہ کے جس درجہ خزائن پنہاں ہیں، ان کا مالک انسان یا کوئی گروہ کب ہے؟ یہ سب اللہ کے دستِ قدرت میں ہے اور سب کو حسب سعی و توفیق عطا کرتا ہے۔ تم اس معاملے میں بخل کرنے والے کون ہوتے ہو؟ انسان نے خزائن ارضی تک تو کسی حد تک دسترس حاصل کر لی ہے لیکن قرآن کہتا ہے ابھی لاکھوں ستارے اور کہکشائیں ایسی ہیں کہ ان میں دولت ثروت اور اللہ کے انعامات کے لاتعداد خزائن مستور ہیں۔ انسان کو ان سے بھی بہرہ مند ہونا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَقَالَ الَّذِیْنَ فِی النَّارِ لِخَزَنَۃِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّکُمْ یُخَفِّفْ

عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ۝ (مؤمن: ۴۹)

[اور جو لوگ آگ میں پڑے ہوں گے وہ دوزخ کے پہرہ داروں سے کہیں گے تم ہی اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ کسی دن تو ہم سے عذاب ہلکا کر دے]

جنت اور جہنم دونوں کے لیے خزنہ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد، نگہبان، نگران اور وہ ملائکہ ہیں جن کے ذمے، ان دونوں مقامات کی حفاظت و نگرانی ہے۔

خ ز ی

اَلْخِزْیُ - ذلّت، رسوائی، احساس ندامت، ایسی حرکت جس کے ارتکاب سے انسان شرم سار ہو۔

خَزِیَ - ذلیل ہونا۔

خَزٰی - ذلّت و رسوائی سے دوچار کرنا۔

کہا جاتا ہے:

اَخْزِهَا بِالْبِرِّ - اس کو نیکی سے شرمندہ کرو برائی سے نہیں۔

خَزِیَ منه - وہ اس کی طرف سے نادم ہوا۔

کبھی کبھی اس کا اطلاق ایسی شرمندگی پر ہوتا ہے جو بجائے خود خوبی ہے۔

ایک دعا کے الفاظ ہیں:

اَللّٰهُمَّ احْشُرْنَا غَيْرَ خَزَايَا وَّلَا نَادِمِيْنَ -

اے اللہ حشر میں ہمیں اس حالت میں زندگی عطا کرنا کہ اپنے کیے دھرے پر ہم شرم سار اور نادم نہ ہوں۔

قرآن حکیم میں ہے:

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (بقرہ: ۱۱۴)

[اس کے لیے دنیا میں بھی بڑی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے]۔

یہ اُن مشرکین مکہ کے انجام کے بارے میں ہے جو مسلمانوں کو اسلام کی راہ پر چلنے سے روکتے تھے کہ ان کو دنیا میں بھی رسوائی اور ذلّت کا سامنا کرنا ہے اور آخرت کے عذاب سے بھی دوچار ہونا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح کامیابی و کامرانی کے پیمانے اور اصول واضح کر دیے ہیں، اسی طرح یہ بھی بتا دیا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر کون چیزیں دنیا و عقبیٰ میں عذاب و خسران کا موجب ہو سکتی ہیں۔ قرآن حکیم کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ اسلام اور مسلمان واقعی کامرانیوں سے ہم کنار ہوئے اور مشرکین مکہ رسوا و ذلیل۔

قرآن حکیم میں ہے:

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ (آل عمران ۱۹۲)

[اے ہمارے پروردگار! تو نے جس کو دوزخ میں داخل کر دیا اسے واقعی رسوا بھی کر دیا]

غرض یہ ہے کہ اصل رسوائی دنیا کی بدنامی یا رسوائی نہیں، اصل رسوائی یہ ہے کہ فکر ذلیل ہو، عقیدہ غلط ہو، روشنی و عمل کی سمتیں غیر عقلی، غیر منطقی اور نادرست ہوں، اور انجام یہ ہو کہ انھیں جہنم کا عذاب چکھنا پڑے۔

خ س ء

خَسَأَ۔ کتّے کو دھتکارنا۔ تھک جانا۔ اس میں ذلّت و تحقیر کا پہلو نمایاں ہے۔
خَسَأَ الْبَصَرَ۔ آنکھ چندھیا گئی۔ تھک گئی۔

قرآن حکیم میں ہے:

قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ٥ (المؤمنون: ۱۰۸)

[ارشاد ہوگا دھتکارے ہوئے اس میں پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو]

یہ اہلِ جہنم کی اللہ سے درخواست ہو گی کہ پروردگار! ہماری بدنصیبی نے ہمیں دھوکا دیا کہ ہم گمراہی کے جال میں پھنس گئے، ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے تو اس نوع کی کوئی غلطی ہم نہیں کریں گے۔

جواباً کہا جائے گا کہ یہ ذلت و رسوائی، یہ اللہ کی رحمتوں سے دوری اور محرومی، جس سے آج تم دوچار ہو، تمہارے ہی اعمالِ بد کا تو نتیجہ ہے۔ اس لیے اس بارے میں ہم تمہاری کوئی سننے کے لیے تیار نہیں۔ جس طرح عمل و عقیدہ کی گمراہی و اصابت دو مختلف انداز ہیں، اسی طرح ان کے نتائج بھی مختلف ہیں۔ نیکی کا صلہ کامرانی ہے اور شر کی جزا رسوائی، اور اللہ کے فیوض و رحمت سے دوری۔

قرآن حکیم میں ہے:

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا (الملک ۴)

[پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو نگاہ آخر ذلیل و درماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی]

اس کارگاہِ عالم کے بارے میں دو رائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ دنیا اپنی تخلیق و ارتقا میں مادے کی رہینِ منت ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کو تسلیم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری یہ کہ یہ کائنات بہ ظاہر اگرچہ مادی نظر آتی ہے لیکن اپنی فطرت، ترتیب و نظام اور مقاصد کی تکمیل و ارتقا کے لحاظ سے قطعی مادی نہیں۔ روحی، ماورائی اور اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت کاملہ کا فیضان ہے۔ دلیل میں فلکی نظام کی محکمی و استواری اور اس کی جمالیاتی جھلکیوں کو پیش فرمایا ہے اور کہا ہے کہ کائنات کے اس عظیم تر ظہور پر فکر و نظر کرو، اسے بار بار دیکھو، جانچو اور پرکھو، اس میں کہیں بھی تمہیں خلل و نقص نظر نہیں آئے گا۔ تمہاری نظریں چندھیا جائیں گی اور تھک ہار کر پلٹ آئیں گی، مگر اس عظیم تر نظام میں کوئی عیب دریافت نہ کر سکیں گی۔ کیا اسی سے تمہارے دلوں میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا نقش مرتسم نہیں ہوتا۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝ (البقرہ: ۶۵)

[تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ]

بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ سبت کا احترام کریں اور اس دن تمام کاروبار چھوڑ کر صرف عبادت بجا لائیں۔ لیکن ایک گروہ نے کچھ ایسے حیل اختیار کیے کہ جن سے بظاہر الفاظ کی حد تک تو سبت کا احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا لیکن روح کے اعتبار سے ان حیل سے سبت کی بے حرمتی ہوتی تھی۔ اس پر سزا و عقوبت کے طور پر ان سے کہا گیا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔ یہ بندر ہو جانا بندر صفت ہونا ہے، یا واقعی یہ حیلہ باز بندر ہو گئے۔ اس بحث کی تفصیل لفظ قردۃ کے تحت دیکھیے۔

قرآن حکیم میں ہے:

الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ (البقرہ: ۲۷)

[جو اللہ تعالیٰ سے اپنے عہد معاہدہ کو اس کے استحکام کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا جوڑے رکھنے کا اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، تو بس یہی لوگ ہیں نقصان اٹھانے والے]

اللہ تعالیٰ کا عہد، اس کی ہستی اور توحید کا وہ اقرار ہے جو بالکل فطری ہے اور ہر شخص کی سمجھ میں آنے والی حقیقت ہے۔ اب جو شخص اس بنیادی اور فطری سچائی کو جھٹلاتا ہے جس پر کہ پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی اور اصابتِ فکر و عقیدہ کا انحصار ہے وہ روحانی و اخلاقی نقصان اٹھانے والا نہیں تو اور کون ہے۔ اسی طرح، فکر و عمل کی دنیا میں انتشار پھیلانے

والا اور حقوق العباد سے اعراض کرنے والا شخص یا گروہ بھی خسارے اور نقصان کا سودا کرنے والا ہے۔

خ س ر

اَلْخُسْرَان - گھاٹا، ٹوٹا، راس المال کا کم ہو جانا، ہلاکت اس کا اصل استعمال تجارت اور کاروبار میں ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے:

خَسِرَتْ تِجَارَتُه - اس کو کاروبار میں گھاٹا پڑا۔

کبھی کبھی اس کا اطلاق معانی پر بھی ہوتا ہے، مثلاً کسی کا دولت عقل و فکر سے محروم ہونا، دنیا کی تگ و دو میں ناکام ہونا، صحت گنوا بیٹھنا، ایمان و عقیدہ اور اس کے ثمرات سے ہاتھ دھو بیٹھنا۔

خَسَرَ الْمِيْزَان - تول میں کمی کرنا۔

مِيْزَانٌ مَخْسُوْر - غلط حساب۔

کہا جاتا ہے۔

مَنْ لَمْ يُطِعِ اللهَ فَهُوَ خَاسِرٌ - جس نے اللہ کی اطاعت نہ کی وہ خسارے میں رہا۔

لَا يَكُوْنُ السَّاخِرُ اِلَّا خَاسِرًا - غیر سنجیدہ روش رکھنے یا مذاق اڑانے والا ہمیشہ خسارے میں رہتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝ (النازعات : ۱۲)

[اس صورت میں واپسی بڑے خسارے کی ہوگی]

مشرکین مکہ آخرت کے اسی طرح منکر تھے جس طرح کہ آج کل کے مادیین - اُن کا کہنا تھا کہ اگر ہمیں دوبارہ جلایا یا زندہ کیا گیا تو یہ زندگی بڑے

گھاٹے کی رہے گی۔ اس لیے کہ نہ تو ہم نے ایک خدا کو مانا نہ اپنے عہد کے رسول کو پہچانا، نہ قیامت اور حشر و نشر کی کیفیات پر ایمان لائے۔ ان حالات میں احتساب و جزا کے لیے اگر ہمیں زندگی عطا کی گئی تو یہ زندگی ہمیں بہت مہنگی پڑے گی۔

آخرت کا انکار دراصل ایسی زندگی بسر کرنا ہے جس میں کوئی اخلاقی بازپرس نہ ہو، کسی دینی و روحانی ذمہ داری کا سوال نہ ابھرے، اور فلسفے کی سطح پر اس کارگاہِ حیات کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس کے پیچھے کوئی حکمت، کوئی غرض و غایت یعنی علم و افادہ اور حسن و خیر ایسی اقدار کا وجود نہیں۔ یہ دنیا کھری مادیت پر مبنی ہے اور اس کا مزاج قطعی مابعد الطبیعی یا روحانی نہیں، جیسا کہ تمام مذاہب بالعموم اور اسلام بالخصوص تسلیم کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝ (الرحمٰن: ۹)

[اور وزن کو ٹھیک رکھو انصاف کے ساتھ اور تول کو گھٹاؤ مت]۔

علاوہ اس حقیقت کے کہ اس آیت کا سیاق و سباق انتہا درجے کی بلیغ و فصیح اور صوت و آہنگ کی نغمگی سے مالامال آیات پر مشتمل ہے، وزن، تول اور خرید و فروخت کے بارے میں قسط و عدل کو ملحوظ رکھنے کا جو اصول بیان کیا گیا ہے اس کا اظہار کچھ اس ڈھنگ سے ہے کہ میزان و عدل کا نظام جس کو تمھیں ملحوظ رکھنا ہے، کائناتِ ارضی و سماوی کے تمام مظاہر میں جاری و ساری ہے، اور اسی پر شمس و قمر، اشجار و نباتات اور آسمان کی بلندیاں قائم ہیں۔ اس لیے اس کا قیام، اس پر عمل اور اس نہج پر زندگی گزارنا اور بسر کرنا گویا نہ صرف دین و شرع کا ماننا ہے بلکہ خود کائنات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کے مترادف بھی ہے۔

خ س ف

اَلْخَسْفُ ۔ ذلّت و تحقیر ۔ بھوکا رہنا ۔ دُبلا ہو جانا ۔
سَامَہٗ خَسْفًا ۔ اس کی تذلیل کی ۔
بَاتَ عَلَی الْخَسْفِ ۔ وہ رات بھر بھوکا رہا ۔
اَلْخَسَفُ ۔ اخروٹ ۔ اس نے ذلت برداشت کی ۔
تَحَمَّلَ فُلَانٌ الْخَسف ۔ اس نے ذلت برداشت کی ۔
اَلْخُسُوْفُ ۔ چاند کا گہنا جانا ۔
خَسَفَ ۔ دھنس گیا ۔ زوال پذیر ہوا ۔ گہن لگنا ۔
خَسَفَتْ العین ۔ آنکھ کی بینائی جاتی رہی ۔ آنکھ اندر کو دھنس گئی ۔
اَلْخَسِیْفُ ۔ وہ کنواں جو چٹان میں کھودا جائے ۔
اَلْخَاسِفُ ۔ دھنسی ہوئی آنکھ ۔ دُبلا پتلا ۔

قرآن مجید میں ہے :
لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰہُ عَلَیْنَا لَخَسَفَ بِنَا (القصص : ۸۲)
[اگر ہم پر اللہ نے کرم نہ کیا ہوتا تو ہم کو بھی دھنسا دیتا]

قارون، دولت و ثروت کے خزائن کا مالک تھا ۔ بڑے ٹھاٹھ اور شان کے ساتھ رہتا تھا کہ اس کو دیکھ کر بعض اسرائیلی للچا گئے، اور اس کی خوش نصیبی اور ٹھاٹھ پر رشک کرنے لگے لیکن وہ یہ نہ دیکھ پائے کہ قلب و ذہن کے لحاظ سے تو یہ انتہا درجے کا مفلس اور بد نصیب انسان ہے ۔ ایمان اور عمل صالح کی نعمت خداوندی اس کے مقدر میں نہیں ۔ اس کی بداعمالیوں اور ان مظالم کی وجہ سے جو اس نے غریب انسانوں پر ڈھائے، اللہ نے اس کو اور اس کے حواریوں کو زمین میں دھنسا دیا ۔ اس کا یہ عبرت ناک منظر جب ان لوگوں نے بچشمِ خود دیکھا جنھوں نے اس کی دولت و ثروت کی فراوانیوں

سے متاثر ہو کر اس کا مسلک قبول نہیں کیا تھا، اللہ کا شکر بجا لائے کہ ہماری قناعت کے سبب اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس عذاب سے بچا لیا۔

زمین میں دھنسا دینا، سزا و عقوبت کا ایک معجزانہ انداز ہے، اور جب تک ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وجود تکوینی قوانین کی پابندی سے کہیں اونچا اور بلند ہے اور وہ اپنے بندوں کو سمجھانے کا کوئی بھی انداز اختیار کر سکتا ہے، اس وقت تک معجزات کو ماننے بغیر کوئی بھی چارا نہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۚ (القیامۃ: ۷-۱۰)

[سو جب آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند اور سورج ایک حالت کے کر دیے جائیں گے اس روز انسان کہے گا اب کدھر بھاگوں]

یہاں خسوف قمر سے مراد، چاند کا اس درجے گہنا جانا ہے کہ اس سے روشنی اور نور چھین لیا جائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ قیامت جب آئے گی، جب سارے نظامِ عالم کی بساط الٹ دی جائے گی، جب اس عالمِ رنگ و بو کی تمام رنگینیاں ختم ہو جائیں گی، نہ چاند چمکے گا، اور نہ آفتاب کی روشنی اور حرارت اس دنیا تک پہنچے گی، اور پھر جب انسان زندہ ہو گا تو ایسے مرحلے پر جو لوگ۔ دنیا میں حشر و نشر کا انکار کرتے تھے، اپنے ہولناک انجام کے بارے میں حیران و ششدر رہ کر بے اختیار پکار اٹھیں گے کہ اب جائیں تو کہاں اور بھاگیں تو کس طرف۔

خسوف قمر و شمس کا ذکر خصوصیت سے اس لیے کیا ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کی دیو مالا میں قمر خدا تھا اور سورج اس کی معشوقہ - یہی وجہ ہے کہ عربی

زبان میں قمر مذکر ہے اور آفتاب مؤنث۔

خ ش ب

خَشَبٌ : موٹی لکڑی۔

خَشَبَ السیف : تلوار کو لکڑی کے آلے سے صیقل کیا، چمکایا۔

رَجُلٌ اَخشَبٌ : وہ سخت دل آدمی جو ذوقِ آگہی سے محروم ہو۔ علامہ راغب کے نزدیک بے حیا انسان۔

ھُمْ یخشبون الشعر : وہ شعر کی نوک پلک سنوارے بغیر شعر کہتے ہیں۔
فرزدق کے بارے میں کہا جاتا ہے :

کَانَ ینقح الشعر : کہ وہ جب شعر کہتا بہت بنا سنوار کر کہتا۔
اور جریر کے بارے میں کہا جاتا ہے :

کان یخشب الشعر : وہ بغیر نوک پلک سنوارے برجستہ شعر کہتا۔

کان خشب جریر خیر من ینقح الفرزدق : اور جریر کا فی البدیہہ بغیر فکر و کاوش کے شعر فرزدق کے شعر سے زیادہ بہتر ہوتا جو تکلف، تنقیح اور احتیاط کے بعد کہا جاتا۔

قرآنِ حکیم میں ہے :

کَاَنَّھُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ ﴿ (المنافقون : ۴)

[گویا یہ لکڑیاں ہیں سہارے سے لگائی ہوئی]۔

ان منافقین کے بارے میں ایک تشبیہ ہے جو ایمان لانے کے بعد پھر کفر کی جانب لوٹ آئے۔ یہ لوگ اگرچہ اپنے ڈیل ڈول اور وضع قطع کے اعتبار سے بھاری بھرکم اور خوش منظر دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان کی باتیں سنیے تو معلوم ہو گا کہ چوبِ خشک کی طرح ذوقِ آگہی کے اعتبار سے بالکل تہی دامن ہیں۔ نہ ان پر وعظ و نصیحت کا اثر ہوتا ہے اور نہ ان کے قلب و ذہن میں یہ صلاحیت ہی ہے کہ توحید و نبوت

کے انوار سے ان میں کوئی جلا یا روشنی پیدا ہو سکے۔ مقصد یہ ہے کہ آنحضرت ان لوگوں کی باتوں، سازشوں اور حیلہ تراشیوں سے متاثر نہ ہوں اور دعوت و تبلیغ کے کام کو برابر جاری رکھیں۔ جو لوگ عقل اور فکر و تدبر کی دولت سے مالا مال ہوں گے جن کے دل کی بصیرت روشن اور واضح ہوگی اور جو لوگ درحقیقت سچائی کے جویاں ہوں گے، آپ سے آپ اسلام کی سچائیوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیں گے۔

خ ش ع

خَشَعَ : عجز و تذلل کا اظہار کرنا، دب جانا، جُھک جانا، جسم و بدن کے اعتبار سے یا قلب و ذہن کے لحاظ سے اور مرجھا جانا۔

خَشَعَ ببصرہ : نظریں جھکا لینا۔

اَرْضٌ خَاشِعَةٌ : جہاں بارش نہ ہو۔

خَشَعَ الورق : پتا مرجھا گیا۔

راغب نے خشوع و خضوع کو دو مترادف الفاظ قرار دیا ہے۔ جوہری مصنف صحاح کی بھی یہی رائے ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۙ (المومنون: ۲،۱)

[یقیناً وہ مؤمن فلاح پا گئے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں]۔

نماز حقیقی معنوں میں اسی وقت نماز کہلا سکتی ہے جب اس میں خشوع و خضوع کا احساس پایا جاتا ہے۔ جب انسان اپنے جوارح و اعضا اور قلب و ذہن سے اپنی فروتنی، اپنا عجز اور اللہ تعالیٰ کی جلالتِ قدر کے جذبات لیے ہوئے ہو اور اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ میری روحانی، ذہنی اور فکری تکمیل اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و کمال اور اپنی کم مائیگی کا اعتراف نہیں کرتا یعنی عبودیت اور اُلوہیت میں فرق کو محسوس کیے بغیر اللہ تعالیٰ

کی ذاتِ گرامی ہمارے لیے سرچشمۂ ہدایت اور نمونہ قرار نہیں پاتی اور نہ یہ ہمارے لیے ممکن ہے کہ ہم اپنے حدود اختیار و ادراک سے آگاہ ہو سکیں۔

فقہا نے خواہ مخواہ اس سلسلے میں یہ بحث چھیڑ دی کہ خشوع و خضوع فرض ہے یا اس کے بغیر بھی نماز ہو جاتی ہے۔ قرآن کی اس آیت کا منشا یہ ہے کہ خشوع و خضوع کی حقیقت اور اس سے بہرہ مند ہونے کے ذرائع پر غور کریں اور پھر اس کیف و ذوق کے ساتھ نماز ادا کریں۔ ورنہ ہماری نمازیں حرکاتِ جسمانی کی ایک خاص ترتیب کے سوا اور کچھ نہ رہیں گی۔

قرآن حکیم میں ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ط (الحشر: ۲۱)

[اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو اس کو دیکھتا کہ اللہ کے خوف سے دب جاتا پھٹ جاتا]۔

قرآن حکیم میں جہاں اظہار و بیان کی بے شمار خوبیاں ہیں اور لسانیات کے لحاظ سے تمام الہامی کتابوں میں اس کا ایک منفرد مقام ہے، وہاں اس میں غضب کی تاثیر بھی ہے، ادھر سنا اور ادھر دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔

تاثیر کی اسی خصوصیت کو ایک مثال کے ذریعے یوں بیان فرمایا ہے کہ اگر یہ قرآن پہاڑ ایسی جامد اور اثرات کو کم قبول کرنے والی شے پر نازل کیا جاتا اور اس میں فہم و تدبر کی صلاحیتیں بھی پیدا کی جاتیں تو تم دیکھتے کہ اس پر کس قدر رقت طاری ہو گئی ہے، اور کیونکہ یہ اللہ کے ڈر سے ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ (الاحزاب: ۳۵)

[اور خشوع والے اور خشوع والیاں]۔

پوری آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جنھیں اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا انعام ملنے

والا ہے اور ان میں عورتیں بھی شامل ہیں اور اس سلسلے میں ان تمام اقدارِ اخلاق و ایمان کا تذکرہ ہے جن کا ہونا مردوں اور عورتوں میں یکساں ضروری ہے، ان میں ایک قدر خشوع بھی ہے جس سے ذمہ دارانہ کردار کی تخلیق میں مدد ملتی ہے۔

خ ش ی

خَشِیَ : ڈرنا، پروا کرنا۔

اَلْخَشِیُّ : ڈرنے والا۔

اَلْخَشْیَۃُ : ڈر، اندیشہ۔

کلیات ابی البقاء میں ہے کہ خشیت لفظِ خوف سے زیادہ شدت کا حامل ہے۔ علامہ راغب کا کہنا ہے کہ خشیت میں تعظیم کا پہلو بھی پایا جاتا ہے، شعوری یا غیر شعوری اتصال اور تاثر پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: ۲۸)

[اللہ سے ڈرتے تو بس وہی بندے ہیں جو علم والے ہیں]۔

یہاں خشیتِ الٰہی سے مراد وہ رُعب، وہ تاثر اور اپنی عاجزی و فروتنی کا وہ احساس ہے جو اس نظامِ کائنات کے اندر پوشیدہ حکمتوں کو دیکھ کر انسان کے دل میں موجزن ہوتا ہے۔ راغب نے ٹھیک کہا ہے کہ اس لفظ میں تعظیم و احترام کا مفہوم بھی داخل ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَلَا تَخْشَوْھُمْ وَاخْشَوْنِیْ ق (البقرہ: ۱۵۰)

[سو تم ان سے نہ ڈرو صرف مجھ ہی سے ڈرو]۔

تحویلِ قبلہ کے موقع پر کچھ معاندین نے آنحضرت کی مخالفت میں ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ اس پر فرمایا: تم ان لوگوں کی ہرزہ سرائی سے نہ ڈرو۔ یہاں نہ ڈرنے

کے معنی پروانہ کرنے کے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ؕ (البقرہ : ٧٤)

[اور کوئی ان میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ کی ہیبت سے نیچے آگرتا ہے]۔

وہ لوگ جو نہ تو ان نشانات اور دلائل سے متاثر ہوتے ہیں جو پوری کائنات میں پھیلے ہیں اور نہ اللہ کی وعید سے۔ ان کا حال پتھروں سے بھی بڑا ہے، وہ طبیعی قوانینِ الٰہی کو تو بہرحال مانتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جن سے نہریں رواں ہوتی ہیں، چشمے پھوٹتے ہیں اور کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو قانونِ کششِ ثقل سے بلندی سے نیچے زمین پر آرہتے ہیں، لیکن یہ معاندینِ اسلام ایسے ہیں کہ ان کے دل تاثر، عبرت پذیری اور اطاعتِ الٰہی کے جذبوں سے بالکل تہی ہیں۔

خ ص ص

خَصَاصٌ : دراصل اس فاصلے کو کہتے ہیں جو چولہے کی تین اینٹوں کے درمیان ہوتا ہے، اس کے بعد خلل اور امتیاز کے معنی اُبھرے۔

خَصَّهٗ بکذا : اس کو اس کام کے لیے مخصوص کر لیا۔

هُمْ خاصّتی : وہ میرے مخصوص آدمی ہیں۔

خَصَّ : محتاج ہوا، یعنی اس کی زندگی اور ضروریاتِ زندگی میں خلل اور فاصلہ پیدا ہوگیا۔

خَصَاصَہ : فقر و احتیاج۔

کہا جاتا ہے :

سددت خصاصة فلان : میں نے فلاں انسان کی ضرورت و حاجت پوری کر دی۔

اختص الرجل : انسان محتاج ہو گیا۔ یہ لفظ لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی۔ متعدی ہونے کی صورت میں اس کے معنی اختصاص کے ہوں گے یعنی اس کو مخصوص کر لیا یا چن لیا۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط (البقرہ : ۱۰۵)

[حالانکہ اللہ اپنی رحمت سے جسے چاہے مخصوص کرے]۔

یہودیوں کو حسد اور غیظ و غصہ کی اس کیفیت نے بے قرار کر رکھا تھا کہ نبوت کے حق دار تو ہم تھے، یہ بنی اسمٰعیل کیونکر اس کے حق دار ہو گئے۔ مشرکینِ مکہ بھی کچھ اسی قسم کی کیفیاتِ حاسدانہ سے دوچار تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ نبوت سے اگر کسی کو سرفراز کرنا تھا تو ہم میں سے کسی بڑے اور دنیوی وجاہت کے اعتبار سے عظیم انسان کو کیا ہوتا۔ آنحضرت کو اس نعمت سے کیوں نوازا گیا۔ اس آیت میں اس اعتراض کا جواب مذکور ہے۔ نبوت بلاشبہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے، لیکن یہ صرف بہت بڑا اعزاز ہی نہیں، رشد و ہدایت کے پھیلانے، حکمت و بصیرت کو عام کرنے اور نوعِ انسانی کو تہذیب کی بلندیوں تک اچھال دینے کا ذریعہ بھی ہے۔ اور اس کے لیے خاص قسم کی استعداد، صلاحیت اور ہمت و عزیمت درکار ہے، جو ظاہر ہے ہر شخص میں نہیں ہوتی۔ اس حقیقت سے صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی اچھی طرح باخبر ہے کہ کون اس بارِ گراں کو اٹھانے کا حوصلہ رکھتا ہے، اور کس کے کردار اور روحانیت سے لوگوں کے دلوں میں ایمان کی شمعیں فروزاں ہو سکتی ہیں۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ ہی انبیا علیہم السلام کو چنتا اور منتخب کرتا ہے۔ یہ کسی قوم، گروہ یا شخص کا کام نہیں کہ وہ اپنے لیے کسی شخص کو نبوت کا سزاوار قرار دے یا کوئی شخص ریاضت و مجاہدہ سے اس مقام پر فائز ہو جائے، نبوت وہبی ہے، اکتسابی نہیں۔

قرآنِ حکیم میں ہے :

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۛ قف (الحشر: ۹)

[اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود فاقے ہی میں ہوں]۔

انصار کے فضائل اور خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ مہاجرین کو غنائم میں جو کچھ ملتا رہتا، اس سے نہ صرف ان کے دل میں بغض و حسد کے جذبات نہ بھڑکتے بلکہ بسا اوقات خود اپنی ضرورت و احتیاج کو روک کر ہر وقت ان کی مدد و اعانت کے لیے آمادہ رہتے۔ خود افلاس و بھوک کی اذیتوں کو برداشت کر لیتے مگر یہ صورت حال برداشت نہ کر پاتے کہ ان کا مہاجر بھائی رات کو بھوکا سوئے۔ ایثار و قربانی کی یہ وہ روح تھی جس پر اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی گئی تھی یعنی ایک دوسرے کی مدد کرنا، ایک دوسرے کی ضرورت و احتیاج کا خیال رکھنا اور اس کی تکمیل و اتمام کے بارے میں ذرائع اور تدبیر کا سوچنا اور اس کے نتیجے میں ایسا نظام وضع کرنا جس سے تمام مسلمانوں کی بنیادی احتیاجیں آپ سے آپ پوری ہو جائیں۔ یہ اسلامی معاشرے کی اصل روح ہے۔

خ ص ف

خَصَفَ : جوتا۔

خَصَفَ النَّعل : جوتا سیا، گانٹھا، کسی چیز کو چپکانا۔

اِخْتَصَفَ : کپڑے سے بدن کو ڈھانپا۔

قرآنِ حکیم میں ہے :

وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ (الاعراف : ۲۲)

[اور دونوں لگے اپنے اوپر درخت کے پتے جوڑنے]۔

آدم و شیطان کا قصہ جہاں قرآن حکیم میں مذکور ہے وہاں بائیبل میں بھی بعض جزوی اصطلاحات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہاں آدم و حوّا کی زندگی کے اس مرحلے کی تفصیل ہے، جس میں انھوں نے شجر ممنوعہ کا استعمال کیا اور اس کے

نتیجے میں ان میں پہلی بار جنسی جذبات کی تاثیر و تاثر کا احساس ہوا اور انھوں نے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپ لینے کی ضرورت محسوس کی۔ قصے کی اصلی روح دراصل ان حقائق کو بیان کرنا ہے کہ :

(۱) نیکی اور برائی کے محرکات اس وقت سے برسرِ پیکار ہیں جب سے انسان نے تہذیب کے ایک خاص دور میں قدم رکھا۔

(۲) نیک لوگ برائی کو برائی جانتے ہوئے برائی کو اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ برائی بھول چوک یا فکر و استدلال کی غلط فہمی سے ابھرتی ہے۔ جیساکہ افلاطون کہتا ہے: "انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے نیکی ہی کو پسند کرتا ہے"۔ اور یہ کہ برائی نہ جاننے سے پیدا ہوتی ہے۔

(۳) انسانی کردار کی محکمی و استواری کے لیے قانون، ضابطہ اور کسی نہ کسی نظام کا ہونا بہرحال ضروری ہے۔

(۴) انسان کی تہذیبی و افلاحی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب مرد اور عورت کو حیا، عفاف اور شرم کا عرفان ہوا۔

(۵) جس طرح معاشرتی تعلیم اور عقائد و تصوراتِ انسان کی اخلاقی و تہذیبی زندگی کی تشکیل میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح اسلوبِ تقدمہ بھی انسانی سلوک و انداز پر اثر انداز ہوتا ہے اور ایک خاص طرح کا مزاج پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

خ ص م

اَلْخَصْمُ : حریف، مخالف، مدِمقابل، واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اَلْخُصْمُ : گوشہ، کنارا۔

اِخْتَصَمَ : باہم جھگڑے، اختلاف کیا، مدِمقابل کو دلیل سمجھائی۔

تَخَاصَمَ : باہم جھگڑنا۔

خصام : جھگڑا۔
زجاج اور خلیل نحوی کے مابین اختلاف رائے ہے کہ یہ خصیم کی جمع ہے یا مصدر ہے۔
اَلْخَصِیْمُ : جھگڑالو۔ راغب کے نزدیک زیادہ جھگڑنے والا۔
قرآن حکیم میں ہے :
هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ ز (الحج : ۱۹)
[یہ دو فریق ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کے بارے میں اختلاف کیا]۔
یعنی جہاں تک مسلمان اور کافر کا تعلق ہے، ان میں کوئی وجہ اشتراک نہیں۔ یہ دونوں الگ الگ اور ایک دوسرے کے مخالف فریق ہیں۔ عقیدے کے اعتبار سے بھی اور انجام کے لحاظ سے بھی۔ مسلمان اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان رکھتے ہیں، اس لیے ان کا انجام یہ ہے کہ یہ جنت کی خوش عیشیوں سے بہرہ مند ہوں اور کافر چونکہ دلیل و برہان اور خود فطرتِ انسانی پر مبنی اللہ کی توحید کے منکر ہیں، اس بنا پر ان کا انجام جہنم کی اذیتوں کو سہنے کے سوا اور کچھ نہیں۔
قرآن حکیم میں ہے :
اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ○ (یٰس : ۷۷)
[ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا سو وہ کھلا ہوا معترض بن بیٹھا]۔
مشرکین مکہ کے بارے میں ہے کہ قرآن کو ایک پیغام، ایک دعوت اور ایسی کتاب ماننے کے بجائے جو رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے، اسے محض شعر و شاعری کی ایک قسم قرار دیتے ہیں، اور تو اور خود ہماری شان میں گستاخیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہم نے انھیں پیدا کیا اور ان کی زندگی کے لیے تمام سہولتوں کا اہتمام کیا۔ اس پر بھی یہ ہمیں چھوڑ کر بتوں کو پوجتے ہیں۔ کیا انھیں اپنے آغاز کا علم نہیں۔ ایک قطرۂ آب، اور خدا اور رسول سے متعلق یہ گستاخیاں۔ انھیں خود سوچنا چاہیے کہ آخر یہ کیا تُک ہے۔
قرآن حکیم میں ہے :

اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝ (الزخرف: ۱۸)

[تو کیا جو زیورات میں پرورش پائے اور مباحثہ میں بھی ژولیدہ بیان ہو، اللہ کی اولاد بننے کے قابل ہے]۔

اس آیت میں مشرکینِ مکہ کے اس فکری تضاد کی قلعی کھول دی ہے کہ یہ خود تو اپنے لیے بیٹیوں کو پسند نہیں کرتے لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیاں نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ ان کو پوجتے بھی ہیں۔ یعنی فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں ٹھہراتے اور ان کا حد درجہ احترام کرتے ہیں۔ اظہارِ تضاد کے علاوہ اس آیت میں ایک لطیف طنز بھی ہے کہ بیوقوفو، اللہ کا شریک ٹھہرانا تھا تو عورتوں کا انتخاب چہ معنی دارد۔ یہ بے چاریاں تو بناؤ سنوار کی فضا میں پرورش پاتی ہیں اور بات تک قرینے اور ڈھب سے نہیں کر پاتیں۔

مقصود نہ تو عورت کی سرشت بیان کرنا ہے اور نہ یہ بتانا ہے کہ عورتیں ہر پہلو سے چونکہ مردوں سے فروتر ہیں، اس لیے انھیں ہمیشہ مردوں سے فروتر ہی رہنا چاہیے۔ غرض اس دور کے حالات و کوائف کی وضاحت کرنا ہے اور یہ کہنا ہے کہ ان حالات میں ان کو بیٹیاں ماننا اور اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا کیونکر صحیح فعل قرار دیا جا سکتا ہے، جب کہ ان کی زیادہ تر توجہ صرف بناؤ سنوار ہی پر مرکوز رہتی ہے اور عقل و فکر سے ان کا رابطہ صرف برائے نام ہی ہوتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ آج کل کی پڑھی لکھی اور مہذب عورتیں بھی رنگا رنگ کپڑوں اور آرائش و زینت کے سامان پر جس قدر خرچ کرتی اور اس پر جان دیتی ہیں، اتنا حصول علم و کمال پر توجہ نہیں کرتیں۔

خ ض د

خَضَدَ : توڑنا، کانٹوں کو الگ کرنا، جھکانا، پھلوں کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا۔

مَخْضُوْدٌ : جس سے کانٹے الگ کر دیے گئے ہوں یعنی بے خار، عاجز انسان۔

قرآن حکیم میں ہے :

فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ۙ (الواقعہ : ۲۸)

[اور وہ وہاں ہوں گے جہاں بے خار بیریاں ہوں گی] ۔

جنت میں مکین لوگوں کا تذکرہ ہے جو اصحاب الیمین کہلاتے ہیں ۔ عربوں کے ذوق ، پسند اور علم کے مطابق جو چیزیں ان کے ہاں مرغوب تھیں ، ان کے بارے میں کہا ہے کہ تمھیں یہ سب وہاں میسر ہوں گی بشرطیکہ تم اسلام کو اپنے فکر و عمل میں سمو لو ۔ یعنی تہ بہ تہ درختوں کے لمبے لمبے سائے ، چلتا ہوا پانی اور پھلوں کی کثرت فراوانی وغیرہ ۔ مقصود بہرحال ترغیب ہے اور ان ناموں اور اصطلاحوں میں ان کو جنت کی خوشیوں اور مسرتوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کو وہ جانتے بوجھتے اور سمجھتے تھے ۔ فکر و فہم کی یہ بھی ایک سطح ہے ۔ دوسری سطح وہ ہے جس کو قرآن حکیم نے رضوانِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے ۔

وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ ؕ (التوبہ : ۷۲)

[اور اللہ کی رضامندی سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے] ۔

اس رضا کے صلے میں مسلمانوں کو کن کن روحانی ، فکری ، ذہنی اور محسوس و مرغوب لذتوں اور کامرانیوں سے نوازا جائے گا ، ان کو ہم اس دنیا میں اپنے محدود علم و عرفان کے بل پر سمجھنے سے یکسر قاصر ہیں ۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ ج جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (السجدہ : ۱۷)

[سو کسی کو علم نہیں جو جو سامان آنکھوں کی ٹھنڈک خزانہ غیب میں مخفی ہے ۔ یہ صلہ ہے ان کے نیک اعمال کا] ۔

خ ض ر

خَضِرَ : سبز ہونا ، شاداب ہونا ۔

اَلْخَضِرُ : سبز شاخ۔

اَلْخُضْرَۃ : سبز رنگ۔

اَلْمخاضرہ : پھل کے پکنے سے پہلے اس کا سودا کرنا۔

اَلْخَضْرَآء : آسمان نیل گوں۔

کہا جاتا ہے :

ما تحت الخضراء اکرم منہ : آسمان نیلی فام کے نیچے اس سے زیادہ شریف آدمی کوئی نہیں۔

فلان اَخْضَرَ : وہ بہت اچھا انسان ہے۔

اِیاکم وخضراء الدمن : گھورے پر اُگے ہوئے پھول سے احتراز کرو یعنی ایسی عورت سے شادی نہ کرو جو اگرچہ خوب صورت ہو مگر اچھے خاندان سے نہ ہو۔

اخضر الجناحین : رات سیاہ رات۔ کنایہ ہے یا تشبیہ ہے، ایسے پرندے سے جس کے دونوں پر سیاہ ہوں۔

قرآن حکیم میں ہے :

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ز فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّۃً ط (الحج : ۶۳)

[کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ ہی آسمان سے پانی برساتا ہے سو زمین سرسبز ہو جاتی ہے]۔

آیت کا تعلق براہِ راست تذکیر بآلاء اللہ سے ہے، یعنی دیکھو اللہ کیونکہ تمھاری ہر طرح کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، خصوصاً جب ہری بھری کھیتیاں بارش نہ ہونے کی وجہ سے سوکھ جاتی ہیں اور باغ ویران ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ پانی برسا کر ان کو پھر سے شادابی و رونق سے نواز دیتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝ (یٰس : ۸۰)

[اور وہ ایسا ہے کہ ہرے درخت سے آگ تمھارے لیے پیدا کر دیتا ہے، پھر تم

اس سے آگ سلگا لیتے ہو]۔

آیت کا سیاق اُخروی زندگی کے ثبات سے تعلق رکھتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جو خدا درختوں سے آگ کے شراروں کو پیدا کر سکتا ہے وہ زندگی کے تسلسل کو کیوں قائم نہیں رکھ سکتا اور موت کے بعد انسانوں کو کیوں زندگی نہیں عطا کر سکتا۔ جس طرح چقماق کی رگڑ سے آگ پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح عربوں کے ہاں مرخ و عفار دو ایسے درخت تھے جنھیں آپس میں رگڑنے سے آگ پیدا ہو جاتی تھی، اور عرب اس سے آگ جلانے کا کام لیتے تھے۔ یہاں "الشجر" سے مراد عام درخت نہیں۔ بلکہ یہ دو خاص درخت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں الشجر معرف باللام ہے۔

خ ض ع

خَضَعَ : جھکنا، اظہارِ عجز و خشوع کرنا، نرمی برتنا، سرفگندہ ہونا۔ بعض اہلِ لغت نے خشوع و خضوع کو ہم معنی قرار دیا ہے۔

خَضَعتُ اللحم : میں نے گوشت کے ٹکڑے کر دیے۔

رَجُلٌ خُضَعَۃٌ : جو ہر شخص کے سامنے جھک جائے۔

خضع مِن الذل : ذلت و خجالت سے گردن جھکا دی۔

خَضَعَت الشمس : آفتاب غروب ہونے لگا۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ (الاحزاب: ۳۲)

[تو تم بولی میں نزاکت مت کرو کہ اس سے ایسے شخص کو خیال فاسد پیدا ہونے لگتا ہے جس کے دل میں خرابی ہے]۔

عورتوں کا شیوہ ہے کہ ان کے اندازِ گفتگو میں لطافت، نزاکت اور ایک طرح کا لوچ ہوتا ہے اور یہی ان کا حسن اور امتیاز ہے۔ اس آیت میں ازواجِ مطہرات کے احترام کے پیشِ نظر یہ فرمایا ہے کہ تمھارا چونکہ اُمتِ مُسلمہ میں ایک درجہ اور مقام ہے، اس لیے بات چیت میں خصوصیت سے تم احتیاط برتو۔ کیونکہ بعض مردوں

میں یہ کمزوری عام ہے کہ وہ عورت کے لباس، وضع قطع اور گفتگو سے خواہ مخواہ اس کے کردار وسیرت کو مشکوک سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ عورتوں کو اپنے عفاف، پاکیزگی، اطوار وکردار کے تحفظ کا جس قدر خیال ہوتا ہے مردوں کو نہیں ہوتا۔

آیت اگرچہ امہات المومنین سے متعلق ہے تاہم یہ حکم عام ہے۔ تمام مسلمان عورتوں کو چاہیے کہ جب بھی مردوں سے بات چیت کریں اپنے لب ولہجہ کو معمول کے مطابق باوقار رکھیں اور اس میں تصنع اور ناز وکرشمہ کا اظہار نہ کریں۔ عفاف وپاکیزگی جس قدر عورتوں کے لیے ضروری ہے اتنی ہی مردوں کے لیے بھی ضروری ہے۔ ان کو بھی چاہیے کہ زیادہ بن ٹھن کر نہ رہیں اور نہ شریف عورتوں سے بات چیت کا انداز ایسا اختیار کریں، جس سے فساد فکر ونظر کے اندیشے ابھریں۔

قرآن حکیم میں ہے:

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ ۝ (الشعرا : ۴)

[ہم اگر چاہیں تو اُن پر آسمان سے کوئی ایسا نشان اُتار دیں کہ ان کے سامنے ان کی گردنیں بالکل جھک جائیں]۔

مشیتِ ایزدی یہ ہے کہ انسانی فکر و ذہن خود بخود نکھرے اور اپنی جدوجہد اور کوشش سے ہدایت وارشاد کے پیمانوں کو پہچانے۔ یہ دنیا ایک طرح کی درس گاہ ہے۔ یہاں رہ کر ہمیں عقل ودین کے حقائق کو سمجھنا اور انسانی بصیرت کو روشن وتابندہ بناتا ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس میں کیا اشکال ہے کہ پے بہ پے ایسے معجزات و خوارق کا اظہار کرے کہ انسان چاروناچار ایمان لانے پر مجبور ہو جائے، اللہ تعالیٰ لاچاری کے ایمان کو پسند نہیں کرتا، اس لیے کہ اس سے بصیرت ودانش کے قافلے رک جاتے ہیں اور ذہن ٹھس ہو کر رہ جاتا ہے۔

خ ط ا

خَطَأٌ : غلطی، لغزش، بھول چوک، گناہ، جرم۔

ابنِ فارس کے نزدیک اس کے معنی حدِ صواب سے تجاوز کرنا ہے۔

خَطِئَ : غلطی کی، چاہے قصداً، چاہے سہواً، اس کا گناہِ عمد اور گناہِ خطا دونوں پر اطلاق ہوتا ہے۔

اَخْطأَ الطریق : غلط راستے پر ہو لیا۔

اَخطأَ الغرض : تیر نشانے پر نہ لگا۔

اَلْخطیئۃ : گناہ، چھوٹا یا بڑا۔

کہا جاتا ہے :

لَن یخطئك ماکتب لك : جو تیرے صحیفۂ مقدر میں لکھا ہے اس میں چوک نہیں ہوگی۔

اَخْطَأَ الارض المطر : بارش نہ ہوئی۔ زمین پر بارش نہ ہوئی۔

خَطَأَ اللہ نوءك : خدا کرے تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے پاؤ۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُم بِهِ ۙ (الاحزاب : ۵)

[تمھارے اوپر اس پر کوئی گناہ نہیں جو تم سے بھول چوک ہو جائے]۔

آیت کا سیاق تو یہ ہے کہ کسی بھی شخص کو اس کے غلط باپ کی طرف منسوب نہ کرو، ہاں اگر اس میں بھول چوک ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ اس لیے کہ گناہ کا تعلق تو عمد و ارادہ سے ہے، سہو و نسیان سے نہیں۔ موجودہ قانون اور قرآن کے تصورِ گناہ میں یہ اصولی فرق ہے کہ موجودہ قانون میں قانون کے بارے میں سہو و جہل کی کوئی گنجائش نہیں۔ جرم بہر حال جرم ہے لیکن عند اللہ ایسا نہیں۔ اسلام سہو و جہل کے عذر کو صحیح مانتا ہے :

وَاسْتَغْفِرِي لِذَنبِكِ ۖ إِنَّكِ كُنتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ ۝ (یوسف : ۲۹)

[اور تو اپنے قصور پر اے عورت معافی مانگ بے شک تو ہی سراسر خطاوار ہے]۔

عزیزِ مصر کی بیوی کی مکاری جب آشکار ہو گئی اور گھر کی شہادت سے حضرت

یوسف کی پاک دامنی کا ثبوت مل گیا تو اس نے اپنی بیوی کو مجبور کیا کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور اس پر معذرت کا اظہار کرے۔ اتنے بڑے گناہ اور غداری پر یہ ہلکی سی سزا اس لیے تجویز کی گئی کہ قصور صرف عزیزِ مصر کی بیوی ہی کا نہ تھا، اس وقت کے اونچے معاشرے کی عورتوں کا عموماً انداز ہی یہ تھا کہ عیش و طرب کی زندگی بسر کریں اور عشق و معاشقہ اور فسق و فجور کے مشغلے کو فروغ دیں۔ قرآن نے سورۂ یوسف میں اسی معاشرے کی عکاسی کی ہے۔

خ ط ب

خَطْبٌ : حالت، معاملہ، دریافت طلب بات، اہم بات۔

خُطبۃ : : وعظ، تقریر، خطاب۔ خطبۃ الکتاب : کتاب کا پیش لفظ۔

خِطْبَۃٌ : منگنی۔

خَطیب : منگنی کرنے والا، مقرر، واعظ خوش بیان مرد۔

خَطَبَ : منگنی کی۔

خَطِبَ : تیرہ مائل، سرخ یا زرد کا ہونا۔

خَاطَبَ : ایک دوسرے کا باہم بات چیت کرنا۔ بات چیت سے ایک دوسرے کو متوجہ کرنا۔

فصل الخِطَاب : فیصلہ کن اور دوٹوک بات۔ ایسی بات جو فصاحت اور صراحت کے پہلو لیے ہوئے ہو۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ (البقرہ : ۲۳۵)

[اور تم پر کوئی گناہ اس میں نہیں کہ تم زیرِ عدت عورتوں کے پیغامِ نکاح کے باب میں کوئی بات اشارۃً کہو]۔

یہاں خطبہ سے مراد منگنی کے بارے میں اشارہ کنایہ سے کچھ ظاہر کرنا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ عورت جب عدت کے دن گزار رہی ہو تو اس دوران کھل کر اس سے شادی کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ ہاں اس بات کی البتہ اجازت ہے کہ ایسے انداز سے کوئی بات کہہ دی جائے جس سے عورت کو اس شخص کی نیت اور رغبت کا احساس ہو جائے۔

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ (الفرقان : ۶۳)

[اور جب ان سے جہالت والے لوگ بات کرتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں خیر]۔

خدائے رحمت و بخشش کو ماننے والوں کے اس آیت میں دو وصف بیان فرمائے ہیں، ایک یہ ہے کہ ان میں کبر و رعونت کی خُو نہیں ہوتی۔ جب وہ زمین پر چلتے ہیں تو اس طرح آہستہ کہ دیکھنے والوں کو ہرگز یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کوئی غیر معمولی مخلوق ہے، جو عوام سے بالکل الگ تھلگ رہنے کی عادی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ جہلا سے الجھتے نہیں، ان کو اسلام کی حقانیت سے آگاہ ضرور کرتے ہیں لیکن بات کو خواہ مخواہ اس درجہ بڑھاتے نہیں کہ بحث و تحقیق کے بجائے خصومت و عناد کی فضا پیدا ہو جائے، اس لیے جب ان سے نادان اور آدابِ گفتگو نہ جاننے والے لوگ بات کو طول دینا چاہتے ہیں تو "یہ خیر" کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ۝ (طٰہٰ : ۹۵)

[موسیٰ نے کہا، اے سامری تیرا کیا معاملہ ہے]۔

حضرت موسیٰ جب طور پر گئے تو اس دوران سامری نے لوگوں کی پرانی بت پرستانہ خو اور آرزو کی تکمیل کی خاطر سونے چاندی کے زیورات کو ڈھال کر ایک بچھڑا بنا ڈالا، جس کے حلق سے ایک طرح کی آواز نکلتی تھی۔ بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے اس کی پوجا شروع کر دی۔ حضرت موسیٰ جب طور سے واپس تشریف لائے تو انھیں یہ صورتِ حال دیکھ کر بہت دکھ پہنچا۔ پہلے تو انھوں نے حضرت

ہارون سے پوچھ گچھ کی کہ تم نے نگرانی کے فرائض کیوں اچھی طرح انجام نہیں دیے، کیوں انھیں شرک سے باز رکھنے کی سعی نہیں کی۔ ان کے جواب سے انھیں جب اطمینان ہوا کہ تفرقہ کے ڈر سے انھوں نے ایسا نہیں کیا، تو سامری سے جو اس شر کا اصل بانی مبانی تھا، براہِ راست دریافت فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا، تمھیں یہ کیا سوجھی کہ لوگوں کو توحید کی سیدھی اور صاف راہ سے ہٹا کر پھر شرک کے ٹیڑھے اور گمراہ کن راستے پر ڈال دیا۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَاٰتَیْنٰہُ الْحِکْمَۃَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ٥ (ص: ٢٠)

[اور ہم نے انھیں حکمت اور فیصلہ کن تقریر عطا کی]۔

حضرت داؤد کے بارے میں ہے کہ جہاں ہم نے ان کو فلسطین کی بہت بڑی سلطنت عطا کی، وہاں ان کو حکمت و دانش کی فراوانیوں سے بھی نوازا، وہاں ایسا اندازِ گفتگو بھی بخشا جو چچا تلا، دو ٹوک اور فصاحت و اثر اندازی کی خوبیوں سے مالا مال تھا۔ بحیثیت حاکم اور پیغمبر کے ان کی یہ خصوصیت تھی کہ نہ صرف یہ زیرِ بحث معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے، بلکہ اس کو ایسے دل پذیر اسلوب سے بیان کرتے جس سے فریقین کی تسکین ہو جاتی۔

خ ط ط

خَطَّ : لکھا، تحریر کیا۔

خَطَّ علی الشئ : کسی چیز پر نشان لگایا۔

خطّ القبر : قبر کھودی۔

خطّ الطعام : کم کھایا۔

خطّ فی نومہ : سوتے میں خراٹے لیے۔

اَلْخَطُّ : تحریر، لمبا راستہ۔

اَلْخِطُّ وَالْخِطَّةُ : راستہ ، محلہ۔

اَلْخُطَّةُ : کام

قرآن حکیم میں ہے :

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (العنکبوت : ۴۸)

[اور آپ تو اس قرآن سے قبل نہ کوئی کتاب پڑھے ہوئے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے]۔

قرآن پاک کیا ہے؟ حکمت، دانش، فصاحت و بلاغت اور اخلاقی و روحانی بلندیوں کی واضح اور روشن مثال۔ تمام الہامی کتابوں کا عطر اور نچوڑ، علم و عرفان کی وہ آخری چوٹی، جسے صرف آنحضرت نے سر کیا۔ اس کے بارے میں یہ شبہ کہ ممکن ہے آنحضرت نے کتبِ سابقہ کے مطالعہ کے بعد اس کو کلامِ الٰہی کے طور پر پیش کیا ہو، یوں باطل ہو جاتا ہے کہ آپ تو نزولِ قرآن سے پہلے نوشت و خواند پر سرے سے قدرت ہی نہیں رکھتے تھے۔ نبوت کے معارف و انوار کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و فیضان خاص کا کرشمہ ہے، یعنی اس کا رحم و کرم، اس کا مخلوق سے تعلق و رشتہ اس بات کا متقاضی ہے کہ مخلوق کی راہ نمائی فرمائے۔ اس کی مشکلوں کو حل کرنے میں اس کی مدد کرے اور علم و عرفان کے ریلوں کو آگے بڑھائے۔ انبیا کشف حقائق کا یہ انداز عام انسانی تجربے سے حاصل نہیں کر پاتے بلکہ یہ فیضان کے ذریعے ان کے دل کی گہرائیوں میں نازل کیے جاتے ہیں۔

اور اصل بات یہ ہے کہ آج بھی جب کہ علوم و معارف کے دریا بہہ رہے ہیں، کوئی شخص اتنی انقلاب آفریں، مؤثر اور تمام اصلاحی و روحانی اقدار پر مشتمل ایسی کتاب لکھ کر تو دکھائے، جس کے نقطے نقطے اور سطر سطر میں جلال، حسن اور تاثیر کی یہ اعجاز آفرینیاں ہوں۔

خ ط ف

خَطِفَ : سرعت سے چھین لینا، اچک لینا۔

اَخْطَفَهُ المرض : بیماری کا کم ہوجانا۔

اَلخُطْفُ : لاغری۔

کہا جاتا ہے :

مامن مرض الا له خَطفَةٌ : کوئی بیماری ایسی نہیں جس میں تخفیف نہ ہو۔

سِهامٌ خواطف : ایسے تیر جو نشانے پر نہ لگیں۔

البرق یخطف البصر : بجلی سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔

اختطف لی فلان من حدیثه شیئا ثم سکت : اس نے مجھ سے کچھ کہا اور پھر کسی مصلحت سے خاموش ہوگیا یعنی بات یا معاملے کا کچھ حصہ بیان نہ کیا۔

قرآن حکیم میں ہے :

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ٥ (الصّٰفّٰت: ۱۰)

[مگر ہاں جو شیطان کچھ لے ہی بھاگا تو ایک دہکتا ہوا شعلہ اس کے پیچھے لگ لیتا ہے]۔

اسلام سے پہلے اور اسلام کے دور میں عربوں میں کاہنوں کا بڑا زور تھا۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ عالمِ بالا کی خبریں جانتے اور سنتے ہیں اور اس کی بنا پر کسی کے بارے میں صحیح صحیح پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ جاہل عرب اکثر ان کے ہاں جاتے تھے اور اپنی قسمت کا حال دریافت کرتے تھے۔ قرآن نے اپنے خاص انداز میں اس توہم کی تردید کی ہے کہ عالمِ بالا تک ان کی رسائی ہی کیونکر ممکن ہے جب کہ آسمان سے نیچے فضا میں اکثر شہاب ثاقب گرتے رہتے ہیں۔ آج پھر علم نجوم کی روشنی میں کچھ لوگ پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ستارے قطعاً ہماری قسمت پر اثر انداز نہیں ہوتے، ان کی اپنی چال ہے۔ یہ غیر علمی باتیں اب توہمات میں شمار ہوتی ہیں

کہ ستاروں کے بارے میں کوئی پُراسرار علم ایسا بھی ہے جس کو صرف یہی لوگ جانتے ہیں جو ان کے احوال سے واقف ہیں۔ ستارے قانونِ قدرت کے مطابق چلتے اور فضا میں تیرتے اور تابانیاں بکھیرتے ہیں۔ آنحضرتؐ کی تشریف آوری کے بعد علم و معرفت کے وہ تمام مفروضے اور غیر یقینی دریچے بند ہو چکے ہیں، جن سے پہلے لوگ استفادہ کیا کرتے تھے۔ اب روشنی کے دور میں صرف قرآن و حدیث اور موجودہ ذرائع علم سے استفاضہ ممکن ہے۔ قرآن حکیم کی یہ خوبی ہے کہ اس نے جہاں علم و معرفت کے نئے آفاق کی نشان دہی کی ہے وہاں جہل و توہم کی ان تمام صورتوں کی قلعی بھی کھول دی ہے، جن کی علم اور سائنس سے تائید نہیں ہو سکتی۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاۗءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ (الحج : ۳۱)

[جیسے وہ گر پڑا آسمان سے، پھر پرندوں نے اسے نوچ ڈالا]۔

اس سے قبل بت پرستی کی تردید مذکور ہے، اس آیت میں بت پرست انسان کا کیا حشر ہوتا ہے، اس کو نہایت عمدہ تمثیل کی صورت میں بیان فرمایا گیا ہے، جس کا لب لباب یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کو اختیار کرنا، گویا علم و ادراک، معرفت و حکمت اور شرفِ انسانی کے آسمان پر آشیانہ بنانا ہے۔ لیکن جو شرک کے اوہام میں گرفتار ہوا، اس نے نہ صرف علم و معرفت کی بہت بڑی سچائی کو جھٹلایا بلکہ شرف انسانی کی بلندیوں سے یوں گر پڑا جیسے کوئی آسمان سے گرے اور شکاری پرندے اُسے فوراً اُچک لیں اور نوچ ڈالیں۔

غرض یہ کہ مُشرک کا حشر فکر و نظر کی تباہی اور بربادی ہے، اس راہ کو چھوڑ کر جو بھی دوسری راہ پر چلا وہ طرح طرح کے توہمات و بدعات کا شکار ہوا اور جہل و نادانی کے مختلف نظریات کو ماننے پر مجبور رہا۔ یہی نہیں علم و معرفت کے تمام راستے بھی اس پر مسدود ہو گئے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ط (القصص: ۵۷)

[اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کے ساتھ ہو کر چلنے لگیں تو اپنی سرزمین سے باہر نکال دیے جائیں]۔

مشرکینِ مکہ کا ایک عذر اسلام قبول نہ کرنے کا یہ بھی تھا کہ اگر ہم نے اسلام کو مان لیا تو ہمیں سرزمینِ مکہ سے نکال باہر کیا جائے گا یا اچک لیا جائے گا اور اس طرح رزق و آسودگی کے بارے میں مختلف تکالیف کا خواہ مخواہ ہمیں سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے اگلی آیات میں ان کے اس عذرِ باطل کا جواب یہ مرحمت فرمایا کہ کم بختو تمھیں اللہ کی رزاقیت پر کیوں یقین نہیں آتا۔ کیا اس نے تمھارے لیے یہاں حرمِ کعبہ کا اہتمام نہیں کیا، اسے کاروبار اور تجارت کا مرکز نہیں ٹھہرایا؟ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر نعمت یہاں میسر ہے۔ میوے پھل، ترکاریاں سب چیزیں تمھیں حاصل ہیں۔ تم اگر اسلام قبول کر لو گے تو یقین رکھو کہ کسی طرح کے گھاٹے میں نہیں رہو گے، جہاں بھی جاؤ گے، اللہ کی مدد و نصرت تمھارے شاملِ حال رہے گی۔

خ ط و

اَلْخُطْوَۃ : چلتے وقت دو قدموں کے درمیان کا فاصلہ، مسافت، نقشِ قدم۔

تَخَطّٰی : پھاندنا، تجاوز کرنا۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ط اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ہ (البقرہ: ۱۶۸)

[اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو، وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے]۔

اس آیت سے پہلے ارشادِ باری ہے کہ حلال و طیب چیزیں کھاؤ اور اس معاملے میں شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔ حلال و طیب میں جہاں وہ جانور شامل ہیں جن کے کھانے کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے وہاں اس سے مراد وہ رزق بھی ہے جو جائز اور پاکیزہ طریقوں سے حاصل کیا گیا ہو، جس میں سود، رشوت

اور استحصال کا کوئی شائبہ نہ پایا جائے۔

شیطان کے نقوشِ قدم کی پیروی نہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جب بھی ہم رزقِ حلال کے حصول کے لیے کوئی تگ و دو کرتے ہیں تو نفس اور نفس کی خواہشیں آڑے آتی ہیں اور ایسی ایسی تدبیریں سجھاتی ہیں جن کو اختیار کرنے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب سود سود نہیں رہا، رشوت رشوت نہیں رہی اور اسی طرح تمام استحصالی حربے جواز کی شکل میں ڈھل گئے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔

آیت کا تعلق اگرچہ ایک خاص سیاق سے ہے تاہم اس میں انسانی کردار کو سنوارنے اور جلا دینے کے لیے جس اصول کی تلقین کی گئی ہے، وہ بہت اونچا اور متصوفانہ نوعیت کا حامل ہے۔ یعنی جب بھی آپ کسی غرض کے حصول کے لیے قدم اٹھائیں، دل کو خوب ٹٹول لیں، اس میں کہیں خود غرضی تو شامل نہیں، اس میں کسی کو ضرر و نقصان پہنچانے کا جذبہ تو پایا نہیں جاتا اور یہ کہ اس سے قلب و ضمیر کی پاکیزگی کو گزند تو نہیں پہنچے گا۔ نیز یہ کہ کیا میرا یہ عمل صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہے، بنی نوعِ انسان کی خدمت و فلاح کے لیے ہے یا اس میں میری اپنی کسی غرض کی تکمیل کا جذبہ زیادہ نمایاں اور کارفرما ہے۔ احتسابِ نفس کی اس صورت میں اخلاق و کردار کا رخ زیادہ صحیح، زیادہ صحت مند اور مفید ہوگا۔

خ ف ت

الخافوت: خاموشی، آہستہ بولنا، کوئی بات چپکے سے کہنا۔

خَفَتَ الرَّجلُ: خاموش ہوگیا، مرگیا۔

خَفَتَ بقراٰتہ: آہستہ آواز میں پڑھا۔

تَخَافَتَ: باہم آہستہ آہستہ گفتگو کی۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ

سَبِيلًا ٥ (بنی اسرائیل : ۱۱۰)

[اور آپ نماز میں نہ تو بہت پکار کر پڑھیے اور نہ بالکل چپکے ہی چپکے، ان کے درمیان ایک طریقہ اختیار کیجیے]۔

نماز اللہ تعالیٰ سے ایک نوع کا روحانی واسطہ ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ نماز پڑھنے والے صلوٰۃ جہری میں امام کی آواز کو سن سکیں، سمجھ سکیں اور اس کے معانی کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں اتار سکیں۔ خشوع و خضوع اور اس کی اثر آفرینی بھی شرط ہے۔ نماز زیادہ پکار کر باآواز بلند پڑھی جائے یا ایسی آواز میں کہ صف میں کھڑے نمازی ہی سن سکیں۔ یہ سوال اس بنا پر ابھرا کہ آغازِ اسلام میں صحابہ باآوازِ بلند قرآن اس لیے پڑھتے تھے تاکہ مشرکینِ مکہ بھی اس سے استفادہ کرسکیں، لیکن اس سے بجائے فائدے کے الٹا یہ نقصان ہوا کہ یہ لوگ اس سے چڑ گئے۔ اس آیت میں میانہ روی کی تلقین کی گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو قرأت زیادہ بلند آواز سے ہو کہ دوسروں کے لیے اذیت کا باعث ہو اور نہ اس درجہ خاموشی سے کہ نمازی قرأت کو سن ہی نہ سکیں، بلکہ آواز کو ان دونوں لہجوں کے بین بین متوازن رکھنا چاہیے۔

قرآن حکیم میں ہے:

يَتَخَافَتُونَ بَيْنَهُمْ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا عَشْرًا ٥ (طٰہٰ : ۱۰۳)

[آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے ہوں گے کہ تم لوگ تو بس دس ہی روز رہے ہو گے]۔

مشرکین و منکرین جب پہلی دفعہ حشر میں بیدار ہوں گے تو انھیں حیرت ہوگی کہ یہ کیوں کر ہوگیا۔ اس طویل عرصۂ مکافات میں جس کی ان کو توقع نہ تھی، دنیا کی مختصر زندگی یاد آئے گی۔ چنانچہ ایک دوسرے سے از راہ تحیر سرگوشی کے انداز میں کہیں گے کہ ہم دنیا میں رہے بھی تو بس دس ہی دن۔ یعنی ہمیں اس عرصے میں اگر حشر پر یقین ہوتا تو آج اس درجے پریشان ہونے کا موقع نہ ملتا۔ زندگی جتنی بھی ملی تھی اللہ کا انعام تھا، اور ہمیں اس کو تشکر، حمد و ثنا اور انسانی فلاح و خیر کے لیے استعمال کرنا چاہیے تھا۔

خ ف ض

خَفَضَ : رفع کی ضد، پست کرنا، جھکانا۔

خَفَضَ الصَّوْتَ : آہستہ کہا۔

خَفَضَ بالمکان : مکان میں اقامت گزیں ہوا۔

کہا جاتا ہے :

خَفِّضْ عَلَيْكَ : اپنے لیے آسانی پیدا کر، اپنے کو مشکل میں نہ ڈال۔

خَفُضَ عَيْشُهٗ : اس کی زندگی خوش گوار یا آسودہ ہو گئی۔

خَفَضَ لَهٗ جَنَاحَهٗ : تواضع اور محبت کے ساتھ پیش آیا۔

لِفلان جناحٌ مَخْفُوضٌ : اس کے لیے اس کے دل میں ایک نرم گوشہ پایا جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (حجر: ۸۸)

[اور ایمان والوں کے لیے اپنے بازو جھکائے رکھیے]۔

آنحضرت سے تخاطب ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ آپ کو پیغمبر تسلیم کر چکے، عقل و فکر اور اخلاق و عادات کو سنوارنے کا اقرار کر چکے۔ اس بنا پر اُن سے آپ کا برتاؤ، محبت و شفقت اور ہمدردی پر مبنی ہونا چاہیے۔ بجائے خود یہ تلقین بھی ہے جس کو بصورت انشا پیش کیا گیا ہے اور خبر بھی۔ یعنی آنحضرتؐ کی قیادت و رہنمائی ایک خود غرض، خود سر اور متکبر و مغرور انسان کی نہیں ہے بلکہ ایسے شخص کی ہے جس کے بازو از راہِ محبت و تودّد کھلے ہوئے ہیں۔ جس کا قلب رحمت و دوستی کے جذبات سے معمور ہے اور جس کا دل لطف و مہربانی کی فراوانیوں سے آراستہ ہے۔ خطاب اگرچہ آنحضرتؐ سے ہے لیکن تمام مسلمان بھی اس بات کے مکلّف ہیں کہ ان کے دلوں میں اپنے بھائیوں کے لیے مہر و وفا کے جذبوں کی کثرت ہو۔

قرآن حکیم میں ہے :

لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝ (الواقعہ : ۲-۳)

[جس کے واقعہ ہونے میں کوئی خلاف نہیں، تو وہ پست کر دے گی اور بلند کر دے گی]۔

قیامت کے برپا ہونے میں کوئی فکری و عقلی اشکال نہیں۔ جو بنا ہے اسے بگڑنا ہے۔ یہ حیاتیات کے علاوہ اخلاقی و روحانی مسئلہ بھی ہے، یعنی تکمیل شخصیت، تزکیۂ کردار اور زندگی کے نئے آفاق کو ابھارنے کے لیے دنیوی زندگی کے علاوہ ایک اور عالم پیدا کیا جائے، جس میں، جو ذہنی، دینی اور فکری نقطۂ نظر سے پستیوں کے حامل ہیں، ان کی گردنیں دنیا میں اگرچہ بلند رہیں، یہاں آکر جھکیں، اور انھیں اپنی پستیوں کی سزا ملے۔ اور وہ جو تلاش حق اور اظہارِ حق کی خاطر دنیا میں پستیوں کا شکار رہے، یہاں آکر ان کا مقام بلند ہو، ان کی گردنیں از راہِ افتخار بلند رہیں۔

خ ف ف

خَفَّ : ہلکا ہونا، کم عقل ہونا۔ خَفَّ المطر : بارش کم برسی۔

خَفَّتْ حالہ : اس کی حالت پتلی ہوگئی۔

خفیف الروح : لطیف مزاج۔ خفیف القلب : ذہین انسان۔

فِیْہِ خِفَّۃٌ : اس میں کم عقلی ہے۔

خَفَّ لفلان : اس نے اس کی اطاعت کی۔

خَفَّ فلان علی الملک : بادشاہ اس سے مانوس ہوگیا۔

اَلْخُفُّ : چرمی موزہ۔

اِسْتَخَفَّہٗ : اس کو کم درجے کا سمجھا۔

خَفَّفَ : تخفیف کی، تخفیف برتی۔

قرآن حکیم میں ہے :

يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ۝

(النساء : ۲۸)

[اللہ کو منظور ہے کہ تمھارے ساتھ تخفیف برتے اور انسان تو کمزور ہی پیدا کیا گیا ہے]۔

اللہ سے زیادہ اس حقیقت کو کون جانتا ہے کہ انسان ذہنی اور جسمانی اعتبار سے کمزور ہے، اس کی خواہشیں، تمنائیں اور ماحول اس کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسی کمزوری و ضعف کے پیشِ نظر احکام و مسائل میں آسانیاں رکھی ہیں اور ایسی کوئی بات ارشاد نہیں فرمائی جس پر عمل کرنا دشوار ہو۔ آسانی، تخفیف اور کم سے کم تکلیف دین کی اساس ہے۔ دشواریاں خود انسان کی پیدا کردہ ہیں۔ اس نے اس آسان دین کو نئی نئی بدعات سے اس درجہ ثقیل کر دیا ہے کہ اس کا تحمل، مشکل ہی نہیں ہماری اجتماعی زندگی کے لیے سخت مضر بھی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَ اَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُهٗ ۙ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ ؕ﴿۹﴾ (القارعۃ: ۸-۹)

[اور جس کسی کا پلّہ ہلکا نکلے گا اس کا ٹھکانا ہاویہ ہے]۔

جب انسان دوبارہ زندگی کا آغاز کرے گا تو زندگی کے ارتقا اور خوش گواریوں کا تعلق اس کے حسنِ اعمال سے ہوگا، اگر نیکیوں کا پلڑا بھاری رہا تو کامیابی و کامرانی یقینی ہے، اور اگر یہ پلّہ ہلکا نکلا اور برائیاں مقدار و کیفیت کے اعتبار سے بڑھ گئیں تو پھر اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہے۔ عمل اور نیکیوں کو کیونکر تولہ جائے گا، اس کا پورا پورا علم ہمیں اس دنیا میں رہ کر نہیں ہو سکتا۔ ہاں اتنا ضرور صحیح ہے کہ ہر نیکی اور بُرائی کا وزن متعین ہے، نیکی کے نتائج اور فوائد واضح ہیں اور بُرائی کے نتائج بھی ظاہر و بیّن۔ نیکی کرنے سے روح میں اہتزاز و مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے اور برائی غم و اندوہ کا باعث بنتی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن سے اس بات کی توقع نہیں رکھتا کہ سرے سے کوئی گناہ اس سے سرزد ہی نہیں ہوگا۔ البتہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری رہے۔

خ ف ی

خَفِیَ: پنہاں رکھنا، چھپانا۔

خَفَی : ظاہر کرنا۔

یہ لفظ اضداد میں سے ہے، چھپانا اور ظاہر کرنا دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اَخْفٰی : پوشیدہ رکھنا۔

اِخْتَفٰی : ظاہر کرنا۔ اِخْتَفَی البحر: کنواں کھودا۔

تَخَفّٰی : چھپنا۔

خَفَاءٌ : نہاں رکھنا۔

بَرِحَ الخفاء : بات پردۂ خفا سے باہر نکل آئی۔ ظاہر ہوگئی۔

الخافیۃ : خفیہ شے، خفیہ حقیقت۔

قرآنِ حکیم میں ہے :

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ؕ

(آل عمران : ۵)

[بے شک اللہ ایسا ہے کہ اس سے کوئی چیز چھپی نہیں، نہ زمین میں نہ آسمان میں]۔

ذرّے سے لے کر پہاڑ تک اور قطرے سے دریا تک دنیا کی ہر شے اللہ تعالیٰ کے علم کی ہمہ گیری پر دلالت کناں ہے۔ وہ قلب وذہن کی ہر ہر جُنبش سے آگاہ ہے۔ اس سے کوئی حقیقت ڈھکی چھپی نہیں۔ علمِ الٰہی کو کامل مانے بغیر اس کائنات کی کوئی تعبیر ممکن نہیں۔ انسان کو جس نے شعور وادراک کی پنہانیوں سے نوازا ہے، وہ خود علم و آگاہی کا کتنا بڑا منبع ہے۔ اس کو کون جان سکتا ہے کہ اس کا علم کس درجہ عمیق، پھیلا ہوا اور جزئیات پر حاوی ہے۔ اس کا اندازہ خود کائنات کی ہیئتِ تخلیقی سے ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں ہے :

وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَیْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ؕ (الممتحنۃ : ۱)

[اور مجھے خوب علم ہے جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو تم ظاہر کر کے کرتے ہو]۔

آیت کا سیاق یہ ہے کہ جب کفر و ایمان کی جنگ چھڑ جائے تو پھر تمھیں ان

لوگوں سے قطعی خفیہ تعلقات استوار نہیں کرنا چاہیے جو سرے سے دین ہی کے دشمن ہیں اور نہیں چاہتے کہ مسلمان امن اور چین کی زندگی بسر کریں۔ کیونکہ چوری چھپے کے یہ تعلقات تو اللہ سے مخفی نہیں رہ سکتے۔ اس لیے بہر حال ظاہر ہو کر رہیں گے اور مسلمانوں کو بالآخر یہ معلوم ہو جائے گا کہ کن لوگوں کے ہمارے دشمنوں سے تعلقات ہیں۔

یہاں " وما اعلنتم " بہ ظاہر زائد معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جو اللہ خفیہ باتوں کو جانتا ہے وہ علانیہ کو تو بہر حال جانتا ہے، لیکن ایسا نہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ علانیہ تم اسلام سے جس عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہو، اس کے تقاضوں کی خلاف ورزی سے نہ کرو، اس لیے کہ تمہارا اقرارِ اسلام اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

أَكَادُ أُخْفِيهَا (طٰہٰ : ۱۵)

[میں اسے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں]۔

اس سے قبل اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ دنیائے محدود و ناتمام ختم ہونے کو ہے، اس کے بعد ایسی کامل اور غیر محدود زندگی کا آغاز ہوگا، جس میں کوئی کمی، کوتاہی اور نقص نہیں پایا جائے گا۔ اس کا تعلق سراسر، فکر و نظر اور عمل و کردار کی صحت سے ہے۔ جن لوگوں نے یہاں ایمان کی حقیقتوں پر غور کیا، بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کوشش کی، ان کا انجام بہت بہتر ہوگا اور جنھوں نے صرف اپنے لیے سوچا، اپنی جسمانی خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل میں ساری عمر گزار دی، ان کا مقام جہنم ہے۔ یہ وقت کب آنے والا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کی مصلحتِ ربوبیت نے پوشیدہ رکھا ہے تاکہ لوگوں کی عام زندگی میں خلل نہ پیدا ہو، اور زندگی کو ناپائیدار سمجھ کر اور یہ جان کر کہ قیامت کسی بھی وقت بپا ہو سکتی ہے، نیک عمل کریں اور زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہ کریں۔

یہاں اخفا کے معنی اظہار کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی آج یہ حشر کا انکار کر رہے

ہیں اور اس فریب میں مبتلا ہیں کہ یہ جہاں یونہی برقرار رہے گا، لیکن ایک وقت آئے گا جب علوم و معارف کی وسعت اس حقیقت کو پالینے میں کوئی دشواری نہیں محسوس کرے گی یہ جہان عارضی ہے اور دائمی زندگی کا تعلق آئندہ زندگی کی ترقیات سے ہے۔
یوں بھی اخفا کا لفظ چونکہ باب افعال سے ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس کے معنی عدم مصدر یعنی عدم خفا یا اظہار کے ہوں۔

خ ل د

خَلَدَ : ہمیشہ رہا۔ مدت تک رہا۔

خَلَدَ الیہ : اس کی جانب مائل ہوا۔

خَلَدَ بالمکان : مکان میں کافی عرصے تک مقیم رہا۔

خَلَدَ فی السجن : مدت تک محبوس رہا۔

کہا جاتا ہے :

فلان مُخلِدٌ : جس پر دیر تک بڑھاپا نہ آئے یا جس کے دانت دیر تک قائم رہیں۔

خَوالِدُ : چولہے کی وہ اینٹیں یا پتھر جو خیمہ چھوڑ جانے کے بعد بھی باقی رہتے ہیں، پہاڑ۔

اَلخَلَدُ : دل، جو زندگی بھر دھڑکتا رہتا ہے۔

اَلخُلُودُ : بقا، طویل و دوام۔ عرصے تک ایک ہی حالت پر قائم رہنا۔ قرآنِ حکیم میں یہ لفظ بطور مصدر کے صرف ایک ہی مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا (النسا: ۹۳)

[اور جو کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا]۔

جن گناہوں کی سزا جہنم میں ہمیشہ پڑا رہنا ہے، ان میں ایک مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرنا بھی ہے۔ خلود کے صحیح تصور کے تعین کے لیے ہمیں پہلے ہی قدم پر دو اصولی

باتوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ جہاں تک جنت کا تعلق ہے، اس میں ہمیشہ رہنا تو اللہ تعالیٰ کے فیوضِ عفو و رحمت کا تقاضا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بارے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی پائی نہیں جاتی۔ رحمت و عفو کا دائرہ جتنا بھی وسیع ہو بہتر ہے۔

جہنم میں خلود پر　　یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ ایک محدود، ناقص اور طرح طرح کی مجبوریوں سے گھری ہوئی زندگی میں کوئی بھی گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ، اس لائق ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی عقوبت و سزا کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہونے پائے۔ یوں بھی اللہ تعالیٰ کے عفوِ عمیم اور محبتِ بے پایاں سے یہ بعید ہے کہ وہ اپنے گناہ گار بندوں کو دائمی سزا کا مستحق قرار دے، کیونکہ بندے اگر گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں تو یہ عین ممکن ہے۔ یہ ان کی تعلیم، ماحول، مزاج اور خواہشات و آرزوؤں کا اثر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی بخشش و عفو کا دائرہ وسیع تر آخر اتنا تنگ کیوں ہو کہ اس کی آتشِ غضب اس درجہ بھڑکے کہ اس سے کم سزا پر اس کی ذاتِ گرامی راضی ہی نہ ہو۔ اس کی فطرت تو سراسر، عفو و بخشش کی آئینہ دار ہے۔

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ (الانعام: ۱۲)

[اس نے اپنے اوپر رحمت لازم کرلی ہے]۔

یہ اعتراض اکثر ان لوگوں کے دلوں میں کھٹکتا ہے جو انسانی فطرت کی کمزوریوں کو جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں خیر کلی کا تصور رکھتے ہیں۔ اس شبہے کے جواب میں چند نکات کا ذہن میں رہنا ضروری ہے۔

(۱) اس اصول میں تو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ جس طرح کائنات میں علت و معلول کا ایک نظام جاری و ساری ہے اسی طرح عقائد، اخلاق اور خیر و شر میں جزا و سزا کا تصور ضروری اور معقول ہے، یعنی عمل اور مکافاتِ عمل باہم لازم و ملزوم ہیں۔

(۲) نیک لوگ آئندہ زندگی میں مادی و روحانی مسرتوں سے دوچار ہوں گے اور بُرے لوگ تکالیف و آلام کا سامنا کریں گے۔

(۳) جس طرح جنت میں لوگ سکون و جمود یا صرف عیش کوشیوں ہی میں مصروف

نہیں رہیں گے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ روحانی و مادی مسرتیں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ گوناگوں کی روشنی میں برابر آگے بڑھتی رہیں گی اور انسان بے خوف و خطران تمام کمالات اور منازلِ رضا کو حاصل کرتا چلا جائے گا جو اس کی فطرت کا حصہ ہیں، گو تاریخ اور فطرت کے تضادات کے باعث اس دنیا میں ان کا اظہار نہیں ہو پایا، ٹھیک اسی طرح اہلِ جہنم ایک طویل عرصے تک اپنے کفر و انکار اور گناہوں کا خمیازہ بھگتیں گے۔

لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۚ (النبا : ۲۳)

[جس میں وہ قرنوں پڑے رہیں گے]۔

اور قرنوں کا یہ فاصلہ خود ان کی اصلاح و تزکیہ اور علاج کی خاطر ہوگا جس میں تکالیف و آلام کی منزلوں سے بہرحال گزرنا ہوگا۔ چنانچہ علامہ ابن القیم نے اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور جہنم کو ایک طرح کا شفاخانہ قرار دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جہنم عارضی، فانی اور ختم ہونے والا ہے، لیکن رضوانِ الٰہی اور اللہ کی بخشش کبھی اختتام پذیر ہونے والی نہیں، یعنی جسمانی عیش کوشیوں کے پہلو بہ پہلو انسان کا روحانی اور فکری سفر و ارتقا ابد تک جاری رہے گا۔ یہ ہے جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا ایک مفہوم۔

(۴) لطف یہ ہے کہ ایک آیت میں جو جہنم کے بارے میں ہے، استثنا کا واضح اشارہ ملتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاۤءَ رَبُّكَ ۭ

(ہود : ۱۰۷)

[اس میں پڑے رہیں گے ہمیشہ کو جب تک کہ آسمان و زمین قائم ہیں۔ ہاں بجز اس کے کہ پروردگار ہی چاہے]۔

جس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ علاج اور عقوبت کی مقررہ منزلوں سے گزرنے کے بعد مشیّتِ الٰہی گناہ گاروں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے سکتی ہے اور یہ اس کے شایانِ شان بھی ہے۔ انسان لاکھ برا سہی، گناہ گار سہی، بہرحال اللہ کا بندہ اور

اس کا شاہ کار اور اس کے وجود پر برہانِ قاطع ہے۔ اللہ اللہ اس کی شانِ کبریائی کے کیا کہنے، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے گناہ گار بندوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اور اس کے بے پایاں شیوۂ غفران وعفو کو کبھی جُنبش نہیں ہوگی۔

(۵) "الا ما شاء ربك" کے الفاظ جیسے جہنم کے بارے میں آئے ہیں، اسی طرح جنت کے بارے میں بھی آئے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہاں مقصود تاکید ہے، اور یہاں مراد استثنا۔ کیونکہ جانب عفو وعقوبت میں فرق ہے۔ عقوبت کو ہمیشہ عارضی ہونا چاہیے اور عفو کو ابداً دائمی اور وسیع تر۔ یہی قانون واخلاق اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں وہ بلند تر تصور ہے جو سمجھ میں آتا ہے۔

(۶) بہرحال یہ تعبیر کا ایک انداز ہے، جس کی لُغت، قرآن اور بعض آثار سے بھی تائید ہوتی ہے۔ جیساکہ علامہ ابن قیم کا دعویٰ ہے، اس کو قرآنی الفاظ کا انکار نہیں سمجھنا چاہیے۔ جنّت و دوزخ سے متعلق اصل حقیقت اور روح جو سمجھنے کی چیز ہے اور جس کے بارے میں قطعی دو راہیں نہیں ہو سکتیں، وہ صرف یہ ہے کہ خیر، نیکی اور صلاح وتقویٰ کا آخرت میں بہترین صلہ ملے گا اور برُائی، شر اور گمراہی کی جزا اور اس کی اذیتوں سے کوئی شخص بچ نہیں سکے گا۔

(۷) اللہ تعالیٰ کے اس موعودہ عذاب میں بھی جس سے مجرم دوچار ہوں گے، رحم وکرم کا یہ پہلو پایا جاتا ہے کہ ہر انسان اس سے پہلے کہ محاسبہ وعقوبت کی اذیتیں اس کو گھیر لیں، اللہ سے ڈرے اور فرائض واخلاق کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی حتی المقدور کوشش کرے۔

خ ل ص

خَلَصَ : خالص اور ہر طرح کی آمیزش سے پاک ہونا۔

خَلَصَ اللّٰہ دِینَہٗ : اللہ کے دین کے بارے میں مخلص ہوا۔

خَلَصَ مِن الورطة : مصیبت ومشکل سے نجات پائی۔

خَلَصَ مِنَ القوم : قوم سے الگ ہوگیا - قوم کو چھوڑ دیا۔

خَلَصَ الیہ : اس کے ہاں پہنچ گیا۔

خَلَصَ الماءمن الکدر : پانی صاف ہوگیا۔

اَخْلَصَ : خلاصہ لینا، چن لینا، عیوب سے پاک کرنا۔

اِسْتَخْلَصَہٗ : منتخب کیا، چن لیا۔

خَالِصَۃ : خالص کا مؤنث۔

ھوخَالِصَتِیّ : وہ میرا اپنا آدمی ہے -

قرآن حکیم میں ہے:

وَقَالُوْا مَا فِی بُطُوْنِ ھٰذِہِ الْاَنْعَامِ خَالِصَۃٌ لِّذُکُوْرِنَا

(الانعام : ۱۳۹)

[اور کہتے ہیں ان چوپاؤں کے شکم میں جو کچھ ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لیے ہے]۔
عربوں میں اسلام سے پہلے کچھ رسوم تھیں، جو توہمات پر مبنی تھیں، ایک رسم یہ بھی تھی کہ وہ کچھ جانوروں کے دودھ اور گوشت کو مردوں کے استعمال کے لیے تو مخصوص قرار دیتے تھے اور عورتوں کو استعمال کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ حلال و حرام کی یہ تقسیم محض وہم پرستی تھی، ورنہ جو شے حلال ہے، اس میں اس طرح کی تقسیم کے کیا معنی۔
خالصۃ کا لفظ یہاں مبالغہ کے لیے ہے، تانیث کے لیے نہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَلَمَّا اسْتَیْئَسُوْا مِنْہُ خَلَصُوْا نَجِیًّا ط (یوسف : ۸۰)

[اور پھر جب وہ ان کی طرف سے مایوس ہوگئے تو علیحدہ باہم مشورہ کرنے لگے]۔
برادرانِ یوسف سے متعلق ہے کہ جب وہ اپنے بھائی بن یامین کو مصری قانون کے تحت رہا نہ کرا سکے تو چپکے سے کھسک گئے اور علیحدہ ہو کر سوچنے لگے کہ اب کیا تدبیر اختیار کی جائے جس سے ہم اپنے باپ کے سامنے سرخرو ہو سکیں۔ یہاں اخلاص کے معنی الگ یا علیحدہ ہونے کے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے :

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ (زمر : ۳)

[یاد رکھو عبادت خالص اللہ ہی کے لیے ہے] ۔

یہاں دین کے معنی عبادت کے بھی ہو سکتے ہیں اور مسلکِ ایمان اور اسلامی نظریۂ حیات کے بھی ۔ اگر یہاں دین سے مراد عبادت ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ خالص اللہ ہی کے لیے ہے ، اس کے سوا کوئی شخص ، دیوی یا دیوتا یا کوئی بھی مظہر تقدس اس لائق نہیں کہ عظیم انسان اس کے آگے جھکے ، سجدہ کرے یا اس سے استمداد چاہے اور اس طرح شرفِ انسانیت کو ذلیل کرے ، کیونکہ خود انسان کا یہ مقام ہے کہ کل کائنات اس کے ارادۂ تسخیر کے آگے سرِ تسلیم خم کرے ۔ اور اگر اس سے مقصود نظریہ حیات ، ایمان اور دین اسلام کے ہیں تو اس میں کیا شبہ ہے کہ یہ ہر نوع کے شرک ، توہم اور بے عقلی سے پاک ہے ۔ یہی وہ مذہب ہے جس سے عقل و خرد کو جلا ملتی ہے ، تہذیب و تمدن کے قافلے آگے بڑھتے ہیں ، کردار و عمل میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے اور قلب و روح کو ایسی روشنی ، ایسا اطمینان اور ایسی تسکین سے آشنائی ہوتی ہے جو اُسے اور کہیں میسر نہیں ۔

قرآن حکیم میں ہے :

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿ یوسف : ۲۴ ﴾

[بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے] ۔

انسان ایسی رغبتوں ، ایسے فطری تقاضوں اور ایسی خواہشات اور آرزوؤں سے تعبیر ہے کہ کسی بھی امتحان اور آزمائش میں اس کو ان سے قطع نظر کرنا آسان امر نہیں ہوتا ۔ حضرت یوسف بھی پیغمبر ہونے کے باوجود بہرحال انسان اور بشر ہی تھے ۔ ان کے لیے زلیخا کے پھیلائے ہوئے خوب صورت اور پُرکشش جال سے اس طرح فاتحانہ اور نہایت کامیابی سے نکل آنا صرف اس لیے ممکن ہوا کہ ان کو اپنی عبودیت اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر مخلصانہ ایمان تھا ۔

تعلیم و تربیت، قانون، قاعدے اور ان پر مبنی ادارے بلا شبہ گناہ کو روکتے ہیں، بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن زندگی میں بعض نازک مقام ایسے بھی آتے ہیں جہاں گرفت کا ڈر اور مواخذے کا خوف نہ ہونے کی وجہ سے خواہشیں اور رغبتیں انسان پر بُری طرح قابو پا لیتی ہیں۔ ان حالات میں پاکیزگیٔ اخلاق کا مظاہرہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل ایمان باللہ کی روشنی سے معمور ہوں۔ حضرت یوسف اللہ تعالیٰ کے ایسے ہی مخلص بندوں میں سے تھے، جنھوں نے حسن و عشق کے جارحانہ حملوں کے باوجود اپنے بے نظیر عفاف اور بلند تر جذبۂ عبودیت کا ثبوت دیا۔

خ ل ط

خَلَطَ : ملانا، آمیزش کرنا۔ دو چیزوں کو چاہے وہ جامد ہوں چاہے مائع باہم ملانا، خلط ملط کرنا۔

خلط الماء بالشراب : شراب میں پانی ملا دیا۔

خَالَطتُ فلانا : میں نے اس سے دوستی کی، اس سے رسم و راہ پیدا کی، کاروبار میں شریک ٹھہرایا۔

هُوَ خَلِيطُهُ فی التِجارۃِ : وہ کاروبار میں اس کا شریک ہے۔

خولِطَ فی عقلہ : اس کی عقل میں فتور آگیا، خلل آگیا۔

اِخْتَلَطَ الرجل : وہ پاگل ہو گیا۔

اِخْتَلَطَ الظلام : اندھیرا چھا گیا۔

رَجُلٌ خَلِطٌ : جو لوگوں سے زیادہ میل جول رکھتا ہو، گھل مل کر رہتا ہو۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ (التوبہ : ۱۰۲)

[اور کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا، انھوں نے ملے جلے

عمل کیے تھے، کچھ بھلے اور کچھ بُرے]۔

آیت کا سیاق و تعلق غزوۂ تبوک میں نہ شریک ہونے والے منافقین سے ہے، ان میں کچھ ایسے مومن بھی تھے جو ازراہِ تساہل اس میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ یہ وہ حضرات تھے جو قلب و روح کے اعتبار سے اسلام کی حقانیت پر ایمان رکھتے تھے اور نیک عمل کرتے تھے۔ ان سے غلطی یہ ہوئی کہ ان کی نیکیوں میں غزوۂ تبوک کے دوران تساہل اور کاہلی کی وجہ سے کچھ برائیاں بھی در آئیں، یعنی یہ لوگ غزوۂ تبوک میں جہاد ایسے عظیم فریضے کی برکات سے محروم رہے، تاہم انھوں نے اپنے اس گناہ کا اعتراف کیا اور اس پر اظہارِ ندامت بھی کیا۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ عفو و غفران ملاحظہ ہو کہ اس نے ان کی توبہ کو پذیرائی بخشی اور ان کے اس گناہ کو معاف کر دیا۔ غرض یہ ہے کہ ہر شخص سے نیکیوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی برائیاں بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔ اس صورتِ حال سے پریشان اور مایوس ہونے کے بجائے اخلاص سے توبہ کرنا چاہیے اور یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا دائرہ کہیں وسیع ہے۔

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ط (الاعراف: ۱۵۶)

[اور میری رحمت ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے]۔

یہودیت، عیسائیت اور بعض آریائی مذاہب نے گناہ کو بڑی اہمیت دی اور اس کو ناقابلِ عفو عمل قرار دیا۔ اسلام کی یہ خوبی ہے کہ اس نے رحمت و عفو کے پہلوؤں پر زور دیا۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ط (البقرہ، ۲۲۰)

[اور اگر تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو تمھارے بھائی ہی ہیں]۔

اسلام ایسا دین ہے جو کمزور کی نہ صرف مدد و نصرت کا حامی ہے بلکہ یہ چاہتا ہے کہ گھر اور معاشرے میں ان کے درجہ و مرتبہ میں بھی اضافہ ہو۔ عربوں میں یتیموں کے ساتھ خود غرضانہ اور ظالمانہ سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ آیت شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ تم اگر

یتیموں سے تعلیم و تربیت کا معاملہ روا رکھو، یا ان کے مال میں ان کی بھلائی و بہبود کی خاطر کوئی تصرف کرنا چاہو تو جذبہ یہ کار فرما ہونا چاہیے کہ یہ غیر نہیں تمھارے بھائی ہیں۔ یعنی بھائیوں میں محبت و الفت اور خیر سگالی کا جو فطری رشتہ ہے، ان کے بارے میں اس کو پوری طرح ملحوظ و مرعی رکھو۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (ص : ۲۴)

[اور اکثر شرکار ایک دوسرے پر زیادتی کیا کرتے ہیں۔ مگر ہاں وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے]۔

اس آیت سے پہلے تو حضرت داؤد کے فکر و تدبر کا قصہ ہے اور اس میں چونکہ فریقین کے ایک جھگڑے سے متعلق تفصیلات مذکور ہیں، اس لیے ضمناً اور بطور استطراد کے قرآن حکیم نے اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ جہاں تک کسی معاملے میں شرکت و تعاون کا تعلق ہے، اس میں اکثر اس بنا پر جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ فریقین کے دلوں میں ایمان کی روشنی نہیں ہوتی اور نیکی سے محبت کا ولولہ پایا نہیں جاتا، ورنہ اگر انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے اور نیکی اس کا شعار ہو تو سرے سے کوئی اختلاف پیدا ہی نہیں ہوتا، اور اگر بدقسمتی سے اختلاف پیدا ہو بھی جائے تو ایمانِ صادق اور نیکی سے سچی محبت اس کو دور کر دینے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا (الکہف : ۴۵)

[اور آپ لوگوں سے دنیاوی زندگی کی حالت بیان کیجیے کہ وہ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے نباتات خوب گنجان ہو گئی ہے، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے]

قرآن حکیم نہ صرف اس دنیا کی حقیقت کو معروضی قرار دیتا ہے، بلکہ اس کو سنوارنے،

اور حسن و کمال کے سانچوں میں ڈھالنے کی تلقین بھی کرتا ہے، لیکن اس کے پہلو بہ پہلو اس دنیا کی بے ثباتی پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ زندگی اور اس کی خوش عیشیاں نسبتاً حقیقی نہیں بلکہ آئندہ زندگی کی تمہید ہے۔ یا بقول افلاطون کے یہ اگلی زندگی کی تیاری کے لیے محض ایک مدرسہ ہے جہاں انسان کو بہت کچھ سیکھنا اور اپنے قلب و باطن کو بڑی حد تک آخرت کے انوار و تجلیات کا سزاوار ثابت کرنا ہے۔ اصلی اور دائمی زندگی کا آغاز فکر و عمل کی استواریوں کے محاسبے کے بعد ہوگا۔

وَإِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۝ (العنکبوت: ۶۴)

[اور عالم آخرت ہی اصل زندگی ہے]۔

یہاں لفظ اختلاط کو گھل مل جانے اور زمین میں، نباتات میں سرایت کرنے اور اس کو شگفتہ و شاداب بنا دینے کے معنوں میں قرآن نے استعمال کیا ہے۔

خ ل ع

خَلَعَ : اتارا۔

خَلَعَ الثَّوبَ : کپڑے اتار دیے۔

خَلَعَ النَّعْلَ : جوتا اُتارا۔

راغب نے کہا ہے کہ بعض صوفیا نے اس کے معنی جوتا اتار کر مطمئن ہو کر بیٹھنے کے کیے ہیں۔

خَلَعَ ابنه : بیٹے کو عاق کر دیا، اس کے اعمال سے خود کو بری الذمہ قرار دیا۔

خَلَعَ امرأته : اپنی عورت سے مال لے کر طلاق دینا۔

اَلْخِلْعَةَ : وہ لباس فاخرہ جو اعزاز کے طور پر عطا ہو۔

خَلَعَ الوالی عاملهٗ : حاکم نے اپنے عامل کو اس کے منصب سے الگ کر دیا۔

خَالَعَهٗ : جوا کھیلا، یا جوئے کے ذریعے اس کا سب کچھ چھین لیا۔

فلان مَخْلُوعٌ : وہ پاگل ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ (طٰہٰ : ۱۲)

[میں تمھارا پروردگار ہوں، تم اپنی جوتیاں اتار ڈالو، بے شک تم ایک پاکیزہ میدان میں ہو]۔

ایشیائی اخلاق میں عموماً اور اسرائیلی روایات میں خصوصاً جوتا اتار کر بیٹھنا حُسنِ ادب کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ حضرت موسیٰ جب وادیِ طویٰ میں پہنچے جہاں اللہ تعالیٰ نے انھیں شرفِ تخاطب سے نوازا اور اپنی ربوبیت و توحید کا اعلان کیا تو حسبِ معمول حضرت موسیٰ جوتیاں پہنے ہوئے یہاں تک چل کر آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اب تم ایسے مقدس مقام تک آ پہنچے ہو جہاں وحی و تنزیل کے انوار سے تمھیں بہرہ مند کیا جائے گا۔ اس لیے یہاں جوتیاں بلا تکلف اتار دو کہ اس مقام کی حرمت و تقدس کا یہی تقاضا ہے۔

کیا فقہی نقطۂ نظر سے ہر مقدس مقام پر جوتا اُتار دینا چاہیے ؟ نہیں ۔ مسجد نبوی سے بڑھ کر تقدس و احترام کی جگہ اور کون ہو سکتی ہے۔ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ صحابہ جوتوں سمیت اس میں نماز ادا کرتے تھے۔ اس کا تعلق دراصل حکم سے نہیں حسنِ ادب سے ہے، عرف روایات سے ہے، مقام کی صفائی ستھرائی اور موسم کے تقاضوں سے ہے۔ مثلاً مغرب کے سخت سرد مقامات میں جوتوں کے بغیر کسی عبادت گاہ یا کسی صاف ستھری نشست گاہ میں داخل ہونا کیونکر ممکن یا مناسب ہے۔ کسی جگہ کے بارے میں حسنِ ادب اور احترام کا تعلق دل سے ہے اور اس کے اظہار کی متعدد شکلیں اور اسلوب ہیں۔ ان میں کسی بھی ایسے اسلوب کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں جو شائستہ، جائز اور خود انسانی شرف و عظمت کے منافی نہ ہو۔

خ ل ف

خَلَفَ : جانشین ہونا، قائم مقام ہونا، پہلوں کے بعد آنا، پیچھے رہ جانا اور پہلے آنے والے کے افکار و اقدار کی تبلیغ و اشاعت کا ذمہ دار ہونا۔

خَلَفٌ ۔ خَلْفٌ : ہر وہ شخص جو دوسرے کے بعد آئے، اوّل میں مدح کا پہلو ہے اور دوسرے میں ذم کا۔ بعض لغت نگاروں نے دونوں کو مترادف قرار دیا ہے۔

خَلَفَہٗ فی اھلہ فاحسن الخلافۃ : اس نے اس کو اپنے خاندان کا نگران بنایا اور اس نے نگرانی کے فریضے کو اچھی طرح انجام دیا۔

خَلَفَہٗ بالسیف : اس نے اس پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔

ھو خلف صدق من ابیہ : وہ اپنے باپ کا صحیح جانشین ہے۔

ناقۃ مُخْلِفَۃٌ : وہ اونٹنی جو حاملہ دکھائی دے مگر کسی بچے کو جنم نہ دے۔

خلف اللبن : دودھ میں بو پیدا ہو گئی۔ دودھ میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔

خَلَفَ عن خلق ابیہ : باپ کی عادت و اطوار اختیار نہ کرنا۔

اَخْلَفَ : خراب ہو جانا، پانی کھینچنا، وعدہ خلاف پانا۔

اِسْتَخْلَفَ : اپنا جانشین مقرر کرنا، حکومت و اقتدار عطا کرنا۔

اَلْخُلْفُ : وعدہ پورا نہ کرنا۔ فنِ منطق میں ایسی دلیل جو خلاف مفروض ہو۔

اَلْخِلْفَۃُ : ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا۔

اَلْخَلِیْفَۃُ : قائم مقام، جانشین، اپنے سے پہلے کے افکار و اقدار کا حامل، یا اللہ تعالیٰ کے اثبات کا بہترین آئینہ دار۔

قرآنِ حکیم میں ہے :

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْہِمْ وَمَا خَلْفَہُمْ ج (البقرہ : ۲۵۵)

[وہ جانتا ہے جو کچھ مخلوقات کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے]۔

سامنے اور پیچھے کی ہر شے کو جاننے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہمہ گیر اور ہر حقیقت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ دنیا میں جو ہو رہا ہے، وہ بھی اور آئندہ جو کچھ معرضِ ظہور میں آئے گا وہ بھی پہلے سے اس کے علم و آگہی کے دائرے میں موجود ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ چونکہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے علم میں وہ پہلے سے ہے، اس لیے انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں یا انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اس کا

صرف یہ مطلب ہے کہ جو بھی نیکی یا بدی تم کرتے ہو اور اپنے اختیار و ارادہ سے کرتے ہو، وہ اس سرچشمۂ علم و آگہی سے مخفی نہیں - یہ نہیں کہ کسی نیکی یا بدی پر اس کا ہمہ گیر علم ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اس کے علم کے مطابق کسی خیر و شر کے عمل کو اختیار کریں - یہاں آگے پیچھے کا ذکر بطور کنایہ کے ہے - مقصود علم و ادراک کی تمام جہتیں اور تمام پہلو ہیں جو اس کے علم میں ہیں -

قرآن حکیم میں ہے :

خَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ (الاعراف : ۱۶۹)

[پھر ان کے بعد ان کے جانشین ہوئے ایسے نالائق لوگ] -

یہاں لفظ خَلۡفٌ ذم کا پہلو لیے ہوئے ہے - یہودیوں کے بارے میں ہے کہ اگرچہ ہم نے انھیں کتاب دی اور ان کے لیے ہر طرح ہدایت و رہنمائی کا سامان فراہم کیا تاہم حضرت موسیٰ کے بعد ان میں ایسے نا اہل لوگ پیدا ہو گئے جنھوں نے دین کو پیشہ ٹھہرا لیا، اسے حسبِ منشا بدلا اور اس میں فرائض سے بچنے کے ایسے ایسے فقہی حیل تلاش کیے کہ جن پر عمل پیرا ہونے سے دین کی روح ہی مسخ ہو جاتی ہے -

قرآن حکیم میں ہے :

فَالۡيَوۡمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنۡ خَلۡفَكَ ءَايَةً ط (یونس : ۹۲)

[سو آج ہم تیرے جسم کو نجات دے دیں گے تاکہ تو ایک نشان عبرت پیچھے آنے والوں کے لیے رہے] -

بنی اسرائیل کو مصر میں جس فرعون نے طرح طرح کی اذیتیں دیں اور ظلم ڈھائے اور ان کے عقیدۂ توحید کا جارحانہ انکار کیا اس کا نام رعمسیس تھا - اللہ تعالیٰ نے جب یہ اپنی ظالمانہ حرکتوں کی وجہ سے غرق ہوا تو اس کی لاش کو مصریوں ہی کی کوششوں سے فنا اور فساد سے بچا لیا تاکہ بعد کے آنے والوں کے لیے اس کا وجود عبرت کا سامان فراہم کرے اور بعد میں آنے والے دیکھیں کہ جب کوئی جابر و قاہر شخص حق و صداقت کا مخالف ہو اور ایک قوم اور اس کی تہذیبی و دینی اقدار کی تباہی کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھے تو اس کا انجام ہلاکت پر منتج ہوتا ہے ـــــ اس کی لاش قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ

ہے، جسے آج بھی ہر کوئی دیکھ سکتا ہے۔

اس آیت میں اعجاز کا پہلو یہ ہے کہ رعمسیس کی ممّی شدہ لاش آج آثارِ قدیمہ کے ماہرین کی سعی و کاوش سے دریافت ہوئی ہے لیکن قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس حقیقت کا انکشاف فرمادیا کہ مصری اس کی لاش کو ممّی کے ذریعے باقی رکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً (الفرقان: ۶۲)

[اور وہ وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنادیا]

اسلام سے پہلے عرب اصنام پرستی کے علاوہ چاند کی پرستش کے بھی قائل تھے، سورج کو بھی چاند کی معشوقہ قرار دیتے تھے اور اس کو مقدس خیال کرتے تھے اور بزعمِ خود سمجھتے تھے کہ رات اور دن کا اختلاف انہی دیوتاؤں کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

قرآن حکیم کی اس آیت میں مشرکینِ مکہ کو اس سائنسی حقیقت سے آگاہ فرمایا ہے کہ دن اور رات کا تسلسل کے ساتھ آگے پیچھے آنا اور ایک کا دوسرے سے مختلف ہونا اس حکیمانہ قانونِ فطرت کی وجہ سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے وضع کیا ہے۔ یہ آسمان یہ کواکب و نجوم کی درخشانیاں اور ان کے اندر وہ محکم نظام، وہ جاری و ساری قانون جس کی وجہ سے یہ اپنے اپنے مقام و دائرے میں رواں دواں، تاریکیوں اور روشنیوں کا باعث ہوتے ہیں، وہ حقائق ہیں جن کو بڑے بڑے فلکیات کے ماہرین سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ دراصل یہ وہ مسائل ہیں جن سے ایک علیم و حکیم اور قادرِ مطلق خدا کا تصور ابھر کر سامنے آتا ہے۔

اس میں حکمت کا یہ پہلو بھی نظر و فکر کا محور قرار پاتا ہے کہ اس دنیا کی کروٹوں سے جس میں کبھی تاریکی کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی روشنی کی حکمرانی، گھبرانا نہیں چاہیے، یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ہماری ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ ظلمت و تاریکی میں رات کو سو کر دن بھر کی تھکن کو دور کریں اور دن کی روشنی میں ایسے کام سرانجام

دیں جن سے اللہ کی مخلوق کو روشنی، راہ نمائی اور راحت حاصل ہو۔ لیل و نہار کے اس اختلاف سے امید و رجا کا یہ انداز بھی رجائیت پسندی کا حامل ہے کہ ظلمت و تاریکی ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں، بلکہ اس کے باطن سے صبح صادق بھی طلوع ہوتی ہے اور اپنے ساتھ درخشانیاں بھی لاتی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ ؕ (فاطر: ۳۹)

[اور وہی ایسا ہے جس نے تمھیں زمین پر آباد کیا]۔

یہاں صحیح ترجمہ ہونا چاہیے تھا کہ اللہ ہی کی ذاتِ گرامی نے تمھیں زمین پر تمکن، اختیار اور اقتدار عطا کیا، لہٰذا تمھارا فرض یہ تھا کہ خلافتِ ارضی کے تقاضوں کو سمجھتے اور اپنی زندگی کو بحیثیتِ مجموعی اطاعتِ الٰہی کے سانچوں میں ڈھالتے، اور اب جب تم نے ایسا نہیں کیا تو اس کا وبال تم ہی پر پڑے گا۔

تعبیر و ترجمہ کی اس توجیہ کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اس آیت کو قرآنِ حکیم نے جن الفاظ پر ختم کیا ہے وہ یوں ہیں:

فَمَنْ کَفَرَ فَعَلَیْهِ کُفْرُهٗ ؕ

[سو جو کوئی کفر کرے گا اس کا کفر اسی پر پڑے گا]۔

خلافت کے معنی دراصل تمکن، اقتدار اور اختیار کے ایسے پیمانوں کے استعمال کرنے کے ہیں جو ان اقدار کی اشاعت و فروغ کے ضامن ہوں، جو عدل و انصاف پر مبنی ہوں۔ اس کے دائرے میں ملوکیت، نبوت اور اقتدار کی ایسی کوئی بھی شکل ہو سکتی ہے جو نیکی، فلاح و بہبود اور اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ہو چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص: ۲۶)

[اے داؤد ہم نے آپ کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔ سو لوگوں کے درمیان انصاف

سے فیصلہ کرتے رہیے]۔

حضرت داؤدؑ بادشاہ ہونے کے علاوہ اللہ کے پیغمبر بھی تھے، لیکن انھیں خلیفہ کہہ کر بتانا یہ مقصود ہے کہ نبوت ہو چاہے ملوکیت - یہ دراصل نیابت ہے چند اصولوں کی، چند عقائد و افکار کی جو عدل و انصاف اور حق پر استوار ہوں۔

قرآن حکیم میں ہے :

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ؕ (البقرہ : ۳۰)

[میں زمین پر اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں]۔

اس آیۂ کریمہ میں انسان کی عظمت و شرف کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ دنیا میں اللہ کا نائب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی آفرینش کا مقصد احکام الٰہی کی تبلیغ و فروغ اور اشاعت و عمل ہے جو ساری دنیا کے لیے خیر و برکت کا باعث ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس عالمِ زمان و مکان میں تنہا انسان ہی وہ وجود ہے جو تمام قدروں کو پہچانتا اور ان قدروں کو آگے بڑھانے کے لیے کوشاں ہے ۔ انسان کے لیے خلافتِ الٰہیہ کا یہ منصب اس کے طرۂ افتخار کو اتنا بلند کر دیتا ہے کہ وہ لامحدود وسعتوں اور کہکشاؤں پر مشتمل عالمِ رنگ و بو میں کائنات کا دولہا، کائنات کا ثمرِ شیریں اور دبستانِ کون و مکاں کا گل سرسبد قرار پاتا ہے۔ انسان کے اس شرف اور مقام بلند کو بائیبل کے نظریۂ گناہ، کوپرنیکس اور ڈارون کے حیاتیاتی اور ارتقائی انکشافات نے سخت مجروح کیا اور بزعمِ خود ان تینوں نے مل کر انسان سے اس کے اس روایتی شرف و عظمت کے اس تاجِ زرّیں کو چھین لیا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے فرقِ اقدس پر سجایا تھا۔ اس کی تفصیل ہم ان تین نکات سے یوں بیان کر سکتے ہیں کہ :

(۱) بائیبل نے انسان کو گنہگار ٹھہرایا اور اس کے گناہ کو اس طرح موروثی ٹھہرایا کہ جو نسل در نسل اپنی دخل اندازیوں کو جاری رکھے گا۔ قرآن حکیم اس کے برعکس اسے گناہ کے بجائے صرف خطائے اجتہادی قرار دیتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ آدم نے خیر و شر کی دو متبادل صورتوں میں خیر کے پہلو کو سمجھنے میں لغزشِ فکری کا اظہار کیا۔

لیکن یہ لوگ اس معاملے کے اس اہم پہلو کو فراموش کر دیتے ہیں کہ زمین سے آسمانوں تک پھیلی ہوئی اس کائنات میں انسان ہی وہ تنہا حقیقت ہے جس نے سوچا اور غور کیا، ایک راہ پر گام فرسا ہونے کے لیے انتخاب و اجتہاد کے عمل کا آغاز کیا۔ کیا یہ بہت بڑی نیکی نہیں۔ غور و فکر اور سعی و اجتہاد بجائے خود وہ بنیادی اقدار ہیں جن سے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے بلند و بالا ایوان تعمیر ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کیا حضرتِ آدم کی یہ پہلی لغزش، پہلی نیکی نہیں، گناہ کے موروثی ہونے پر کسی علمی اور سائنسی تجزیے کی ضرورت نہیں، صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ جس انسان نے گناہ کیا تھا وہی انسان ایک پیغمبر، معلّم اور مصلح کی حیثیت سے اقدار و اخلاق کی زلف و کاکل کو سنوارنے میں ہزاروں برس سے مصروف ہے۔

(۲) کوپرنیکس نے بلا شبہ افلاک سے متعلق بطلیموسی نظام کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور اس سلسلے میں علم و تحقیق کی نئی راہوں کی نشان دہی کی۔ اسی ضمن میں اس نے یہ حقیقت بھی واشگاف طور پر واضح کی کہ ہزاروں کہکشاؤں میں پھیلی ہوئی اس کائنات اور لامحدود وسعتوں پر مبنی اس عالم کے مقابلے میں کرۂ زمین کی حیثیت صرف اتنی ہے جیسے ایک ذرّہ، ایک نقطہ یا بلند و بالا پہاڑ کا ایک ٹکڑا۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ اتنے حقیر کرۂ ارض پر بسنے والا انسان اور اس کی اخلاقی و روحانی قدریں، عقائد اور تصوّرات، ان کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ اتنے عظیم اور ناپیدہ کنار پھیلے ہوئے قدرت کے نظام کو آخر کیا پروا ہے کہ انسان کیا کر رہا ہے، کیا سوچ رہا ہے اور کن مذاہب و ادیان کی پیروی کر رہا ہے۔ لہٰذا قدرت کے اس وسیع تر نظام میں انسان کو سرے سے کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں۔ ایک لق و دق صحرا میں رینگتے ہوئے ایک ننھے سے کیڑے کے بارے میں صحرا کو سوچنے کی کیا حاجت ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور اس کی کون منزل ہے؟۔

کرۂ زمین بہت چھوٹا ہے، یہ ایک سائنسی حقیقت ہے جسے ہر پڑھا لکھا انسان مانتا ہے، لیکن حقیقت اور شئ ہے اور اس سے نتیجہ اخذ کرنا شئ دیگر۔ سوال یہ

ہے کہ آپ عالم اور کائنات کی ضخامت سے انسان کی فکری قدو قامت کا مقابلہ کیوں کرتے ہیں ۔ کیا ایک قیمتی اور درخشاں موتی کی اہمیت اس لیے کم ہو جاتی ہے کہ وہ ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند ہے ۔ کیا متعدد ایسے جانور پائے نہیں جاتے جو قدو قامت کے اعتبار سے گو کم ہیں، مگر جبلّی علم کی صلاحیتیں ان میں بڑے بڑے جانوروں سے زیادہ ہیں ۔ کیا ایک بہت بڑے اور اونچے پہاڑ سے نکلا ہوا زمرّد کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پورے پہاڑ سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتا ۔

انسان کی قدر و قیمت کا اندازہ زمین کی ضخامت سے لگانا قطعاً غیر منطقی حرکت ہے ۔ اس کے شرف و مجد اور عظمت کا راز اس کی دانش، اس کے علم اور تحقیق و تحفص کی مساعی میں مضمر ہے ۔ یہ وہ حقائق ہیں جو بے شمار کہکشاؤں پر بھاری ہیں ۔ آفتاب، نجوم و کواکب اور جبل و صحرا نے کائنات اور انسان کی عظمت و حقیقت کو سمجھنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی ۔ لیکن انسان اور صرف انسان وہ حقیقت ہے جس نے نہ صرف ان کا فہم و ادراک حاصل کیا بلکہ پورے نظامِ قدرت کے رازوں کو سمجھنے کی کوشش بھی جاری رکھے ہوئے ہے ۔ کیا چاند کبھی زمین پر اُترا ہے ۔ یہ انسان کی عظمت ہے کہ اس نے اپنی فکری پرواز کے ذریعے اسی پر اپنی عظمت اور بڑائی کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں ۔

فرض کیجیے کسی اور کرے پر انسان سے برتر کوئی مخلوق پائی جاتی ہے ۔ اس سے بھی انسان کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ کیونکہ انسان کے معنی ایک خاص ڈھانچے، ایک متعین شکل و صورت کے نہیں، عقل و دانش کے اس پیکر کے ہیں جو تہذیب و تمدن کے مختلف ڈھانچوں کی تخلیق پر قدرت رکھتا ہے ۔ انسان کی عظمت اسی لیے تو ہے کہ پوری کائنات اس نعمت سے مالا مال نہیں ۔

(۳) انسان کی عظمت و شرف کو تیسرا دھچکا ڈارون کے نظریۂ ارتقا سے لگا ۔ نظریۂ ارتقا کا مطلب یہ ہے کہ انسان رب جلیل کی مخصوص تخلیق نہیں بلکہ یہ کبھی انسان سے ملتے جلتے حیوان کے ارتقائی عمل کا قدرتی نتیجہ ہے ۔ یعنی انسان کو براہِ راست خدا نے

پیدا نہیں کیا بلکہ یہ اس حیاتیاتی ارتقائی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کے پیچھے ہزاروں اور لاکھوں برس کی ان کروٹوں اور تبدیلیوں کو دخل ہے جن میں غلطیاں بھی ہوئیں، اتفاقات نے بھی حصہ لیا، نظامِ تعلیل کی کارفرمائیاں بھی ظہور میں آئیں اور بقائے اصلح کے اصول نے بھی انسانی جسم کے خدوخال کو بدلا اور اس کی عقل و دانش کی صلاحیتوں کو چمکایا اور سنوارا۔ دوسرے لفظوں میں قدرت کی لاکھوں اور کروڑوں برس کی چال اور روش کے بعد یہ انسان سطحِ ارض پر ہویدا ہوا جس کے کاسۂ سر پر ہم عزت و شرف کے تاج سجا رہے ہیں اور جس کو ہم خدا کا خلیفہ قرار دے رہے ہیں۔

ہم سرِ دست نظریۂ ارتقا کے اس مادی اور میکانکی تصور کو نہیں مانتے، جن کی برگساں نے یہ کہہ کر دھجیاں بکھیر دیں کہ یہ عالم مادے کے اتساع اور ارتقا کا نتیجہ نہیں بلکہ جوششِ حیات کا کرشمہ ہے، جس نے کائنات کے بوقلموں ڈھانچوں کو اپنے فطری اقتضا کے مطابق جنم دیا۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ مانتے ہیں کہ زمان و مکان کے تمام ظہورات میں بہرحال ارتقا ہوا۔

ہمارا اعتراض یہ ہے کہ اس سے انسان کی عظمت میں کیا فرق پڑا۔ سوال یہ نہیں کہ انسان نے انسان کی شکل میں رونما ہونے میں کتنا لمبا اور طویل سفر طے کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ انسان اپنی عقل، دانش، حکمت و بصیرت اور قدرتِ تخلیق و ارتقا کے اعتبار سے، کیا پوری کائنات سے افضل نہیں اور رنگ و بو کے اس پورے عالم پر آج بھی بھاری نہیں۔ محض نظریۂ ارتقا کے بل پر انسان کے مقام کو گھٹانے سے بعض مادیت پسند حضرات نے اسی کم نگہی کا ثبوت دیا ہے جو کوپرنیکس کی اس دریافت پر کہ زمین کا حجم بہت کم ہے۔ ان مادیت پرست حضرات کی کم نگہی یہ ہے کہ انھوں نے ارتقا کی ان ابتدائی کڑیوں کو تو اہمیت دی جو آگے چل کر انسان کے وجود پر منتج ہوئیں، لیکن ارتقا کے اس عظیم الشان نتیجے پر غور نہیں کیا جو ارتقا کا اصل انجام اور مقصود تھا۔ یعنی انسان کی تخلیق۔ کیا یہ حضرات اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ شکمِ مادر میں نو ماہ کے عرصے میں انسان کیا کیا بھونڈی شکلیں اختیار کرتا ہے۔ لیکن تخلیق کا

یہ عمل آخر کار جیتے جاگتے، ہنستے کھیلتے اور خوب صورت بچے کو جنم دیتا ہے۔ پھر اس سے اس مولود بچے کی اہمیت کیوں گھٹ جائے گی۔ کیا صرف اس لیے کہ شکم مادر میں اس کی حیثیت جرثومۂ حیات اور اس کی مختلف النوع بھونڈی شکلوں سے زیادہ نہ تھی۔ انجام کو دیکھیے۔ ارتقا کے تسلسلِ پیہم کی ابتدائی کڑیوں کو نہ دیکھیے۔

اصل اعتراض ان حضرات کا یہ ہے کہ انسان صرف کن فکان کا کرشمہ نہیں بلکہ فطرت کے طویل ارتقائی عمل کا ثمرہ ہے۔ چلیے یوں ہی سہی لیکن اس حقیقت کو مان لینے میں کیا حرج ہے کہ یہ کلمہ کن فکان، بجائے خود اپنے آغوش میں ارتقائی مضمرات کو لیے ہوئے ہے۔ ہمارے نزدیک، فلسفہ، سائنس اور مذہب و دین ایک ہی سچائی کے حامل ہیں، فرق صرف زبان، پیرایۂ بیان اور تعبیر و تفسیر کا ہے، کیوں کہ کوئی بھی روشنی، روشنی کے خلاف نہیں ہوتی۔

خ ل ق

خَلَقَ : صحیح صحیح اندازہ کرنا، پیدا کرنا، ابداع یعنی کتمِ عدم سے کسی چیز کو وجود میں لانا۔

خَلَقَ الخیاط الثوب : درزی نے کپڑا سینے سے پہلے اس کا صحیح اندازہ مقرر کر لیا۔

خَلَقَ الکذب : جھوٹ موٹ کوئی بات گھڑنا، جھوٹ بولنا۔

خَلَقَ وَ خَلِقَ الثوب : کپڑے کا بوسیدہ ہو جانا۔

خَلَقَ الشیئ : کسی چیز کو ملائم کرنا، چکنا کرنا۔

خَلَقَ اللہ الخلق : اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس اندازہ سے پیدا کیا جو اس کی حکمت و دانش کا اقتضا تھا۔

اَخْلَقَ الشباب : جوانی رخصت ہوئی۔

تَخَلَّقَ : تصنع سے حُسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرنا۔

اَلْخُلُق : طبعی عادت، اچھی اور مناسب عادت، سوچ سمجھ کر اختیار کردہ معمول۔

اَلْخَلِیقَۃ : مخلوق، کائنات۔

اَلْخَلِیْقُ : سزاوار، لائق۔

قرآن حکیم میں ہے :

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (ابراہیم : ۳۲)

[اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا]۔

اس سے پہلے کی آیات مشرکینِ مکہ کے بارے میں ہیں، جو مختلف اصنام کی عبادت کرتے تھے اور اس طرح نہ صرف خدائے حکیم و برتر کی توہین کے مرتکب ہوتے تھے، بلکہ شرفِ انسانیت کی تذلیل کا باعث بھی ہوتے تھے۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ خدا یا پرستش و عبادت کے لائق تو وہ ذاتِ گرامی ہے، جس نے اس کون و مکان کی آفرینش کی ہے۔ نہ وہ اصنام، نجوم و کواکب اور مجسّمے جن کا کائنات کی تخلیق میں کوئی حصہ نہیں۔

یہاں خلق کا لفظ پیدا کیا، ایک معروف لفظ ہے جو قرآن حکیم میں بیسیوں دفعہ آیا ہے۔ پیدا کیا کے دو معنی ہوتے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ پہلے سے کوئی چیز، اجزا یا عناصر موجود ہیں ان کو وجود کے نئے سانچوں میں ڈھالنا۔

(۲) دوسرے یہ کہ کسی چیز کو جو کتم عدم میں تھی یا سادہ لفظوں میں تھی ہی نہیں، اسے وجود بخشنا۔

اللہ تعالیٰ کو ہم دونوں معنوں میں خالق تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ازسرِنو، ابداع یا آفرینش کا فعل بھی انجام دیتا ہے اور اسی کے اختیار و قدرت سے جو چیزیں منصۂ شہود پر آتی ہیں ان کو بھی نئے نئے ڈھانچوں میں بدلتا رہتا ہے۔

خلق کا پہلا مفہوم تو سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ معنی کہ کوئی چیز عدم محض سے وجود میں آسکتی ہے، بظاہر موجودہ سائنسی ذہن کے خلاف ہے۔ شئ سے شئ تو بلاشبہ پیدا ہوئی ہے لیکن جو چیز سرے سے پائی ہی نہیں جاتی، وہ کیوں کر وجود کی سطح پر ابھر سکتی ہے۔ یہ سوال البتہ حل طلب ہے، نہایت اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے دو جواب دیے جاسکتے ہیں۔

(۱) عدم کی کوکھ سے کوئی شے جنم نہیں لیتی، یہ ہمارا تجربہ ہے۔ خدا تعالیٰ کے تجرباتِ بے پایاں کا انسان کی محدود عقل نے احاطہ نہیں کیا، اس لیے ہم یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ اس بات پر اللہ تعالیٰ بھی قادر نہیں۔

(۲) موجودہ سائنس نے اس یونانی ڈاگما کی تردید کردی ہے۔ چنانچہ موجودہ سائنس کے وہ تمام سائنسی آلات جن سے کسی چیز کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے، اگر ان کو استعمال میں لائے تو کیا "مولی کیول" کے بطن میں جو پوری کائنات کا وجود پنہاں ہے اور جس کے ظہور اتساع سے یہ گلستانِ وجود، کھلا اور پروان چڑھا ہے اس کو مولی کیول میں اس کے ظہور کی کسی بھی شکل کو معلوم کیا جاسکتا ہے، دیکھا جاسکتا ہے، یا فرض کیا جاسکتا ہے؟۔

انسانی مشاہدے کے اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ کیا شاخ گل جو گلاب کی پتیوں اور اس کی شمیم آرائیوں کو نشو و نما عطا کرتی اور چنبیلی سے اُسے امتیاز بخشتی ہے، شاخِ گل پہلے سے ان مراحل کی حامل ہوتی ہے جو اس کو وجود میں لانے کا باعث ہوتے ہیں۔ موجودہ فزکس نے علت اور معلول کے مفہوم کو بالکل بدل دیا ہے۔ اب ایک بیج میں پورے شجر کو موجود نہیں مانا جاتا، بلکہ بیج سے درخت کی منزل تک پہنچنے تک بیج کی اپنی صلاحیتیں، ماحول کا اثر، زمین کی سازگاری اور دوسرے تخلیقی مراحل کو طے کرنا پڑتا ہے، جو پہلے سے بیج میں ہرگز موجود نہیں ہوتے۔

فلسفے کی زبان میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عدم ہی تو وہ حقیقت ہے جو وجود کی بوقلمونیوں کو وجود میں لانے کا سبب بنتی ہے۔ عدم کے معنی ایک خالی حقیقت کے نہیں ہیں جس میں وجود کا کوئی عنصر پایا نہیں جاتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ خلو اور عدم میں بڑا فرق ہے۔ عدم کو اگر آپ ہیگل اور مارکس کی زبان میں لیں اضداد میں سے ایک ضد قرار دیں تو یہ تخلیقی و اختراعی عملیہ کا ناگزیر جزو بن جاتا ہے۔ جب کسی چیز میں ہم ارتقا کے عمل دخل کو تسلیم کرتے ہیں تو اس کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ پہلے اس چیز میں کوئی کمی تھی جو اس کی ارتقائی شکل میں نمودار ہوئی۔ لہٰذا عدم کو اگر ایک

تخلیقی عنصر نہ مانا جائے تو پھر کسی بھی شے میں اضافہ و اصلاح یا ترقی ناممکن ہو جاتی ہے۔ آخر ایک مصوّر، ایک مجسمہ ساز اور ایک شاعر اپنے ایک ہی شاہ کار پر اکتفا کیوں نہیں کرتا اور کیوں یہ چاہتا ہے کہ دوسری تصویر، دوسرا مجسمہ اور دوسرا شعر اس سے زیادہ مکمل اور اس سے زیادہ جمال آرائیوں کا مظہر ہو۔ اس طرزِ فکر کو اگر آپ سمجھ لیں تو پھر یہ فکر بالکل مہمل نظر آئے گا کہ بطنِ عدم سے کوئی شے ظہور میں نہیں آتی۔

آئیے اس کو ایک دوسرے نقطۂ نظر سے جانچیں۔ عدم کے معنی عدمِ مطلق کے کب ہیں کہ کوئی شے وجود کی کسی سطح پر موجود ہی نہ ہو۔ کائنات میں رونما ہونے والی ہر شے قادرِ مطلق کے دائرۂ علم میں تو پہلے سے موجود ہے۔ پھر یہ معدوم کیسے ہوئی۔ فرض کیجیے ایک مادیت پسند خدا کو نہیں مانتا، جب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ہر وہ شے جو پہلے نہیں تھی اور اب ظہور و وجود کے رنگ میں رونما ہوتی ہے، کائنات کی کلّی اور جامع سکیم اور نقشے میں پہلے سے موجود تھی۔

ان نکات کی تشریح سے یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خالق، فاطر اور بدیع ماننے میں کوئی عقلی اور سائنسی استحالہ پایا نہیں جاتا۔ ہاں اس سے یہ شبہ ضرور قلب و ذہن میں خلش کا موجب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان معنوں میں خالق و فاطر ماننے سے یہ بھی تو ماننا پڑے گا کہ کائنات کا بہر حال ایک آغاز ہے اور اس آغاز کا مطلب یہ ہے کہ کسی زمانے میں اللہ تعالیٰ تخلیق و آفرینش کے فعل سے عاری تھا۔ یعنی وہ فعّال یا خلاق نہیں تھا اور اگر خلاق تھا تو مخلوق ازلی ہوئی۔

اس کا جواب ہم دو طریق سے دے سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو خالق و فاطر ماننے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اس تمام کائنات کا وجود آخر کس کے فیضان، تجلّی، اتساع یا تخلیق و اختراع کا نتیجہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس کا مبدارِ اوّل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور بس۔ جس کو ہم زمان و وقت کی اصطلاحوں میں اس بنا پر نہیں سمجھ سکتے کہ زمانہ خود مخلوق اور موضوعی ہے، کوئی معروضی حقیقت نہیں۔ یہ واقعات کے تسلسل کو سمجھنے کا محض ایک طریق اور پیمانہ ہے جو انسانی ذہن کی کرشمہ سازیوں کا

نتیجہ ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کو ایک ایسی ہستی مانتے ہیں جس کے ہاں ماضی اور مستقبل کا کوئی وجود نہیں، اس کے ہاں جو کچھ ہے حال ہے۔ لہذا اس کی ہر تخلیق حال میں ہوتی ہے ماضی میں نہیں۔ غالباً یہی وہ حقیقت ہے جس کو سب سے پہلے عرب فلسفی کندی نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو "لازمان" میں پیدا کیا ہے۔

جواب کا دوسرا انداز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفات تخلیق و آفرینش، حکمت و قدرت، رحمت و کرم وغیرہ جس کا ذکر قرآنِ حکیم اور دوسری تمام الہامی کتابوں میں ہوا ہے، وہ صفات ہیں جن سے ہم آگاہ ہیں، جن کا انعکاس کائنات کے ہر ہر ظہور سے عیاں ہے اور جن کے بل پر ہم محدود العقل انسان اللہ تعالیٰ کے وجود گرامی کے بعض ابعاد کو بطور قیاس و استدلال کے سمجھ سکتے ہیں، لیکن اس لامحدود ذات کی لامحدود صفات کا احاطہ کس نے کیا ہے، ازل سے اس کی کون کون صفات کس کس انداز سے اور کہاں کہاں جلوہ فرما ہیں، اس کو جاننا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس بنا پر اس کو کسی بھی مرحلے میں غیر فعال قرار دینا محدود اور سمٹے ہوئے ذہن انسانی کی واہمہ طرازی ہے حقیقت نہیں۔ رہا دوسرا سوال کہ اللہ تعالیٰ کی آفرینش سے قدم عالم لازم آتا ہے تو اس کا جواب علامہ ابنِ تیمیہ کے فلسفۂ تخلیق کے مطابق دو لفظوں میں اس کو یوں سمجھ لیجیے کہ عالم قدیم نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ازل سے خالق ہے اور وہ ہمیشہ سے مخلوق کو اپنی قدرت، حکمت اور فیض کی برکات سے پیدا کرتا رہا ہے اور اس کا یہ فعل ابد تک جاری رہے گا۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ۚ (العنکبوت: ۱۷)

[اور جھوٹ تراشتے ہو]۔

دعوتِ ابراہیم کا ذکر ہے کہ تم اللہ سے منہ موڑ کر بتوں سے عبودیت کا رشتہ جوڑتے ہو اور ان سے حصولِ رزق کی دعا کرتے ہو۔ ان بتوں کو جو خود اختیار نہیں، تمھیں رزق کیسے عطا کر سکتے ہیں۔ ان بتوں کو خدا ماننا جھوٹ تراشنا ہے۔

یہاں لفظ خلق کی نسبت چونکہ جھوٹ کی طرف ہے، اس لیے اس کے معنی گھڑنے،

تراشنے اور خواہ مخواہ ایک غلط بات کہنے کے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ (المومنون: ۱۴)

[کیسی شان والا ہے تمام صناعوں سے بڑھ کر]

اس آیت سے قبل اللہ تعالیٰ نے انسان کے مراحلِ تخلیق کا ذکر کیا ہے کہ پہلے تو یہ مٹی کے جوہر سے بنا، پھر اس نے نطفے کی شکل اختیار کی، پھر اس نطفے نے خون کے لوتھڑے کی صورت اختیار کی۔ پھر یہی لوتھڑا گوشت بنا، پھر ہڈیاں اور پھر ان سے بالکل مختلف مخلوق وجود میں آئی جو سوچتی سمجھتی ہے اور عقل و خرد کے نئے نئے خوارق کو جنم دیتی ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی صناع یا خالق تصور کیا جا سکتا ہے۔

ان تخلیقی مراحل پر غور کرو اور بتاؤ کہ کیا کیمیائی عمل یا ترکیب و ساخت کا کوئی فعل انسان کو سطحِ وجود پر لا سکتا ہے۔ زندگی کی نشاط آفرینیوں کو پیدا کر سکتا ہے اور خود زندگی کو خرد و دانش کے اس حیران کن اور حسین پیکر میں بجز خدائے قدیر و برتر پیدا کر سکتا ہے۔

اس آیت میں جہاں "احسن الخالقین" کی حکمت، تدبیر اور قدرت کی کرشمہ سازیوں کی تصریح ہے، وہاں انسان کا مقام بھی کہیں بلند تر نظر آتا ہے کہ یہ ہستی جو خدا کی صفات کی بہترین آئینہ دار ہے، کسی کیمیکل سعی و ساخت کی مرہونِ منت نہیں، بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا اعجاز ہے۔

"احسن الخالقین" کی ترکیب سے یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے۔ یہاں خالق سے مراد صناع یا علمِ کیمیا کا ماہر ہے جو کیمیاوی اجزا سے مختلف اشیا تیار کرتا رہتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (القلم: ۴)

[اور بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر ہیں]۔

یہاں خلق سے مراد وہ عادات و اطوارِ حسنہ ہیں جن کو آنحضرتؐ نے اپنے کردار و

سیرت میں سموکر دکھایا۔ عظیم سے یہ مقصود ہے کہ خرد و خیر کی تکمیل و جامعیت کا کوئی بھی نقشہ ترتیب دیجیے۔ ایک ایک نیکی اور خوبی کا تصور کیجیے اور پھر یہ دیکھیے کہ جامعیت اور توازن کے ساتھ بجز آنحضرتؐ کی ذاتِ اقدس کے تاریخ میں کوئی اور شخص ان کا حامل نظر آتا ہے۔ مزید برآں یہ خلقِ عظیم جو آپ کا خاصہ ہے، صرف آپ کی ذات ہی کی حد تک سمٹا ہوا نہیں، بلکہ اس کی تاثیرِ نفوذ کا یہ کرشمہ ہے کہ آپ نے ایسے مثالی معاشرے کی تشکیل کی جس میں کا ایک ایک فرد آفتاب و ماہتاب کی طرح تاریخ کے اوراق میں دمک رہا ہے اور رضار الٰہی کی شہادت و سند کا سزاوار ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ (البقرہ : ۲۰۰)

[اور ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں]۔

یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جن کی تگ و دو کا محور نہ صرف دنیا کی خوش عیشیاں رہیں بلکہ جو اُخروی زندگی کا ہمیشہ انکار کرتے رہے۔ ظاہر ہے جب انھوں نے توشۂ آخرت کے لیے نہ تو نیکیوں کی طرف دھیان دیا اور نہ اسے مانا ہی، ان کا اس زندگی میں جو ہمیشہ کے لیے ہے اور سراسر کامرانیوں پر مبنی ہے، کیا حصہ ہو سکتا ہے؟

یہاں خلاق کا لفظ "حصہ" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، کیونکہ حصہ آخر معاوضے ہی کی شکل تو ہے جس کو انسان خود اپنی محنت و کاوش سے پیدا کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ (الروم : ۳۰)

[اور اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں]۔

یہاں خلق کے معنی ان اقدارِ دینی و اخلاقی کے پیدا کرنے کے ہیں، جن کی پذیرائی کی صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے روزِ اوّل سے انسان کے قلب و ذہن میں سمو دیں۔ یہی وہ دینی تقاضا اور اقدارِ خیر ہیں جو انسانی فطرت سے تعبیر ہیں اور جن کی تلاش و جستجو انسان کی زندگی کا لازمی حصہ ہے اور اس کو کوئی شخص بدل دینے پر قادر نہیں۔ دوسرے

لفظوں میں اس حقیقت کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اسلام، توحید اور اقدارِ خیر و خوبی، کوئی باہر کی چیز نہیں جس کو ماننے پر انسان کو خواہ مخواہ مجبور کر دیا گیا ہے، بلکہ یہ انسان کی فطرتِ اقدار پسندی کا اندرونی اور فطری تقاضا ہے۔

یہاں خلق اللہ سے مراد نیچر اور فطرت کا وہ فیضان ہے جو طلبِ حق اور قبولِ حق کے جذبے پر مبنی ہے اور اس کو تشکیک و ارتیاب کا کوئی فلسفہ بدل نہیں سکتا۔

خ ل ل

خِلال : دوستی۔

خَلِیلٌ : دوست۔

کہا جاتا ہے :

ھو خَلِیلِی و خِلّی : وہ میرا دوست اور حبیب ہے۔

فینا خُلَّۃٌ قدیمۃ : ہم میں اور ان میں پرانی دوستی ہے۔

خَلَّ الیہ : وہ محتاج ہو گیا۔

خَلَّ الشیئ : اس نے اس میں سوراخ کر دیا۔

تَخَلَّلَ القوم : قوم میں گھل مل گیا۔

اختل عقلہٗ : اس کی عقل میں خلل آ گیا۔

اَلْخَلَلَ : شگاف، فساد، دراڑ، بستی۔

خِلال : بیچ میں۔

خِلال الدیار : گھروں کے اندر، گھروں کے ارد گرد۔

اَلْخَلّ : سرکہ، ریگستان میں گزرنے کا راستہ۔

خَلَلْتُ الْخُمر : میں نے شراب کو سرکے میں تبدیل کر دیا۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا ۝ (النسا : ۱۲۵)

[اور اللہ نے تو ابراہیم کو دوست بنالیا] ۔

اس میں ایک طرف تو یہ ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیم کی عبودیت، ایثار اور شدائد کے مقابلے کی وجہ سے اور ان کے صبر و استقامت کے سبب اللہ نے انھیں اپنی دوستی سے نوازا ہے۔ دوسری طرف اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں میں خدا کے تصوّر کے بارے میں یہ حقیقت بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اللہ اپنے ان بندوں کا جو صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اسی کے ہو رہتے ہیں، اس درجہ خیال رکھتا ہے کہ انھیں خلت اور دوستی سے سرفراز کیا جاتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ صرف احکم الحاکمین ہی نہیں، اپنے بندوں کا دوست بھی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ط (بنی اسرائیل : ۵)

[پس وہ گھروں میں گھس پڑیں گے] ۔

بنی اسرائیل کی سرکشی، نافرمانی اور ظلم و فساد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سزا دی کہ بخت نصر کی فوجوں نے ان کے گھروں میں گھس کر نہ صرف انھیں تباہ و برباد کر دیا، ان کے تمام مقدس مقامات کو بھی مسمار کر دیا، اور ستر برس تک یہ اس کی غلامی اور قید کی زنجیروں میں جکڑے رہے۔ اور یہ بنی اسرائیل ہی پر موقوف نہیں، جو قوم بھی حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کرے گی، اس کو دوسروں کی غلامی قبول کرنا پڑے گی اور ذلت و تحقیر کی ہر اس شکل کو برداشت کرنا پڑے گا جو ان کے کبر و نخوت کو خاک میں ملا کے رکھ دے گی۔

خ ل و

خَلَا : خالی ہونا، گزر جانا، تنہائی میں ملنا، کسی شے پر اقتصار کرنا، کسی کام کے لیے فارغ ہونا۔

خَلَا به : اس سے تنہائی میں ملاقات کی۔

خلا المکان : مکان خالی ہوگیا۔

خلا علی اللبن واللحم : گوشت اور دودھ کے بغیر روٹی یا کھجور کا تنہا استعمال کیا۔

خلا بالُہ : اس کا دل مطمئن ہوگیا۔

اَلْخَلاءُ : خالی جگہ۔

اَلْخِلْوَۃُ : تنہائی کی جگہ۔

اَلْخَالِی : کنوارہ۔ مذکر مؤنث دونوں کے لیے آتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ٥ (فاطر : ۲۴)

[اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں ڈرانے والا نہ گزرا ہو]۔

مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیضِ ربوبیت کا یہ کرشمہ ہے کہ اس نے ہر دور اور ہر قوم میں ہدایت و رہنمائی کے لیے کوئی نہ کوئی پیغمبر یا ایسا شخص ضرور دنیا میں بھیجا ہے جس نے معاشرے میں نیکی، سچائی اور اللہ تعالیٰ کی توحید کو پھیلانے کی سعی بلیغ کی ہے اور اپنے اپنے دور میں قوموں کو برائی اور شر کے انجامِ بد سے آگاہ کیا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ (البقرہ : ۱۴)

[اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں]۔

منافقین کے بارے میں ہے کہ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو اپنے ایمان کا یقین دلاتے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے گمراہ کرنے والے دوستوں سے ملاقات ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم محض از راہِ مذاق اسلام کی حقانیت کا اقرار کرتے ہیں ورنہ ہماری ہمدردیاں تمام تر تمھارے ساتھ ہیں۔ یہ لوگ د۔اصل جرأت و جسارت کے جذبے سے محروم ہوتے ہیں ورنہ ایک جری اور جسور شخص کے لیے دو ہی مقام ہیں، یا تو وہ صدق دل سے حق کا ساتھ دے یا پھر اس کی مخالفت کرے۔ یہ بین بین رہنے والے کمزور کردار کے مالک ہوتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے :

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ج (الفتح : ۲۳)

[اللہ نے یہی دستور بنا رکھا ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے] ۔

کفارِ مکہ سے متعلق ہے کہ سنت اللہ اور قانونِ الٰہی یہی ہے کہ جب کبھی کفار حق کی مخالفت کریں گے منہ کی کھائیں گے ۔ حق کی فطرت میں فتح و نصرت داخل ہے اور باطل کا مقدر شکست ۔ تمام قوموں میں اللہ تعالیٰ کا یہی دستور کارفرما رہا ہے ۔

" خلت " کا لفظ یہ بتانے کے لیے ہے کہ ماضی کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد عدل ہے ، بشرطیکہ حق صرف نظریہ نہ ہو ، عقیدہ ہو اور اس کے فروغ کے لیے صحیح طریقوں سے کام کیا جائے ۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط (آل عمران ، ۱۴۴)

[اور محمدؐ ایک رسول ہی ہیں ، ان کے قبل بھی رسول گزر چکے ہیں] ۔

غرض یہ ہے کہ آنحضرت باوجودیکہ حمد و ستائش کی بہت سی خوبیوں سے بہرہ ور ہیں ، اور انہی خوبیوں کی بنا پر آپ کا نام نامی محمد ہے صلی اللہ علیہ وسلم ، لیکن اس کے باوجود آپ اسی انداز کے پیغمبر ہیں جیسے کہ پہلے ہو گزرے ہیں ، ان میں کوئی بھی پیغمبر موت کے ہمہ گیر قانون سے مستثنیٰ نہیں ۔ آپ بھی موت کا شکار ہو سکتے ہیں ، لیکن اصل اور سرمدی زندگی آپ کی تعلیمات کو حاصل ہے جو ہر دور میں نہ صرف قائم و استوار رہیں گی بلکہ انسانی کردار کو چمکانے اور سنوارنے میں ہمیشہ کارفرما رہیں گی ۔ اس لیے آنحضرت اگر اس عالمِ ادنیٰ سے فراق اختیار کرتے ہیں اور رفیقِ اعلیٰ کی نوازشوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں تو اس سے آپؐ کی نبوت اور آپ کے پھیلائے ہوئے پیغام کو کوئی گزند نہیں پہنچتا ۔

تاریخ اس صداقت کی شاہد ہے کہ آپ کے بعد اسلام کی دعوت دنیا کے کونے کونے تک پہنچی اور تمام اقوامِ عالم نے اس کے اثرات کو محسوس کیا ۔

قرآن حکیم میں ہے :

اُقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِیْكُمْ (یوسف: ۹)

[یوسف کو قتل کرڈالو یا انھیں کسی زمین میں ڈال آؤ تو تمھارے باپ کا رخ صالح ہوجائے گا]۔

آیت کا تعلق حضرت یوسف اور ان کے بھائیوں سے ہے ۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ حضرت یعقوب کی نظرِ التفات زیادہ تر یوسف کی جانب ہے اور وہ باپ کی نظروں میں ان کے مقابلے میں زیادہ محبوب اور معزز ہے تو ان میں باہمی مشورہ ہوا کہ ہم کیونکر باپ کی توجہ و شفقت کے رخ کو خالصۃً اپنی طرف موڑ سکتے ہیں، تو یہ طے پایا کہ یا تو یوسف کو قتل کر دو یا کسی اور ملک میں ڈال آؤ ۔ اس طرح حضرت یعقوب کی محبت و شفقت کا رخ آہستہ آہستہ یوسف کی محبت سے خالی ہوجائے گا اور ہٹ جائے گا ۔ یوں وہ مجبوراً ہمیں ہی عزیز اور جانشین سمجھنے لگیں گے ۔ لیکن ان کا یہ فیصلہ غلط ثابت ہوا ۔ اس لیے کہ حضرت یعقوب کی نظرِ مردم شناس نے جان لیا تھا کہ تنہا یوسف ہی ان کے پیغام نبوت کا حامل ہوسکتا ہے ۔ حضرت یعقوب کا یہ یقین اس خواب کی بنا پر محکم ہوا جو حضرت یوسف نے دیکھا تھا ۔

حضرت یوسف کے اس قصے سے یہ اصول نکھر کر سامنے آجاتا ہے کہ فضیلت، عصمت اور کردار کا اونچاپن، وراثت سے حاصل نہیں ہوتا ۔ اس کا سراسر تعلق اللہ کی عنایت و بخشش اور ذاتی فضائل و مناقب سے ہے ۔

خ م د

خَمَدَ : آگ کا بجھ جانا ، دلائل و تاثیر کا ختم ہوجانا ۔ نہج البلاغہ میں قرآن کے بارے میں ہے : وفرقانا لا یَخْمَدُ بُرْهَانُهٗ کہ وہ قرآن جو حق و باطل میں امتیاز کرتا ہے ، اس کی بیان کردہ دلیل و تاثیر کبھی ختم نہ ہوگی یعنی اس کے دلائل کی تپش اور تیزی جوں کی توں قائم رہے گی ۔

خَمَدَ المریض : مریض بے ہوش ہوگیا، اس میں عقل و خرد کی تپش ختم ہوگئی ، زندگی

کی حرارت جاتی رہی۔

قرآن حکیم میں ہے :

فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ٥ (الانبیا: ۱۵)

[ان کی یہی پکار جاری رہی کہ ہم نے انھیں کٹی ہوئی کھیتی، بجھی ہوئی آگ بنا دیا]۔

مشرکینِ مکہ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ جو قومیں انبیا کی دعوت پر کان نہیں دھرتیں اور ان کے ظلم و فساد کا عام دستور قائم رہتا ہے، انھیں ہمارا قانون مکافات عمل، بجھی ہوئی آگ یا کٹی ہوئی کھیتی کی طرح برباد کر دیتا ہے۔ اس وقت یہ پچھتاتے ہیں کہ اے کاش ہم ظالم نہ ہوتے۔

غرض یہ ہے کہ قوموں کی بقا کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ کب تک اصولوں کا ساتھ دیتی ہیں، اخلاقی قدروں کی حمایت کرتی ہیں اور انبیا کی تعلیمات کو عمل و کردار کے سانچوں میں ڈھالتی ہیں۔ جب انھوں نے ان حقائق کی مخالفت کی اور ظلم و فساد کے پھیلانے میں ممد و معاون رہے، انھیں زندگی، ارتقا اور نشو و نما کی صلاحیتوں سے محروم کر دیا گیا۔ زندہ رہنے والی چیز قومیں نہیں، اصولی اقدار اور سچائی کی طلب و پذیرائی ہے۔

خ م ر

خَمَرَهٗ : چھپانا، ڈھکنا۔ شراب پلانا، خمیر ڈالنا۔

راغب کے نزدیک خمر کے بنیادی معنی ڈھانپنے کے ہیں، اسی بنا پر خِمار اوڑھنی کو کہتے ہیں کیونکہ اس سے عورتیں اپنا سر ڈھانپ لیتی ہیں۔

خَمَرَ العجین : خمیر ڈالا۔

خَامَرَ الماءَ اللَّبَنَ : دودھ میں پانی کی آمیزش کی۔

خَمَرَ الشهادة : گواہی کو چھپانا۔ پوشیدہ رکھنا۔

تَخَمَّرَتِ المرءة : عورت نے سر پر اوڑھنی ڈال لی۔

اَلْخَمْرُ : شراب، ہر وہ مشروب یا شے جس سے عقل و دانش کے تقاضوں کو انسان

کھو بیٹھے اور بے ہوش ہو جائے۔ انگور۔

قرآن حکیم میں ہے:

يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز (البقرہ: ۲۱۹)

[لوگ آپ سے شراب اور خمار کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں]۔

اسلام سے پہلے شراب حرام نہ تھی اور عربوں میں تو شراب کثرت سے پی جاتی تھی۔ پُرلطف بات یہ ہے کہ مختلف اوقات میں شراب کے مختلف نام تھے۔ عربوں کا اونچا طبقہ خصوصیت سے شراب کا عادی تھا۔ اسلام وہ پہلا دین ہے جس نے اس کو گناہ، اثم اور حرام قرار دے کر پورے عالمِ انسانی پر احسان کیا۔ اس کی حرمت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس سے انسان اپنے اس شرفِ عقلی کو کھو بیٹھتا ہے جو اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے علاوہ اس سے نہ صرف عبادات میں خلل پڑتا ہے بلکہ روزمرہ کے معمولات کو بھی اس کی وجہ سے ذمہ داری سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ قلب، جگر اور گردے اس سے بری طرح متاثر ہوتے ہیں بلڈ پریشر بھی بڑھ جاتا ہے اور آخر آخر میں انسان میں وہ قوتِ مدافعت اور قوتِ ارادی ختم ہو جاتی ہے جو بیماریوں کا مقابلہ کر سکے۔ قرآنِ حکیم نے اس کے فوائد کا بھی ذکر کیا ہے جو عارضی نشاط آفرینی پر مبنی ہیں اور جن کا انجام افسردگی، بیماری اور قلاشی ہے۔

اس آیت سے اسلامی فقہ کا یہ عظیم اصول مستنبط ہوتا ہے کہ مسائل کے حل و کشود میں یہ خیال ملحوظ رہنا چاہیے کہ کسی مسئلۂ زیرِ بحث میں مضرتیں زیادہ ہیں یا فوائد۔ یعنی وہ طریق جو زیادہ انفع ہو، زیادہ مفید ہو اور معاشرے کے مصالح کا زیادہ ضامن ہو اس کو اختیار کیا جائے اور کم انفع یا مضر کو چھوڑ دینا چاہیے۔

بعض فقہا نے جو شراب کے بعض ان اجزا کو زیادہ اہمیت دی ہے، جن سے اس زمانہ میں شراب تیار ہوتی تھی، شائستۂ التفات نہیں۔ اصل شے وہ ہر مشروب

یا شے ہے جو انسانی عقل و خرد کو مختل کر دے اور جانتے بوجھتے ہوئے انسان کو عقل و خرد کی بلندیوں سے گرا کر حماقت اور بے وقوفی کے گڑھوں میں گرا دے۔

شراب نوشی ایک فرد کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ ایسی بیماری ہے جسے ہم بہت بڑی اجتماعی برائی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ (یوسف: ۳۶)

[میں اپنے کو خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں انگور کا شیرہ نچوڑ رہا ہوں]۔

حضرت یوسف کو جب شاہِ مصر نے جیل میں ڈال دیا تو انھوں نے یہاں رہ کر بھی منصبِ نبوت کے تقاضوں کو پورا کیا۔ قیدیوں کو اللہ کی توحید کی دعوت دی اور خود نیکی اور سچائی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ ان کو ان کی بزرگی کا قائل ہونا پڑا۔ ان کے ساتھ دو اور قیدی بھی تھے جنھوں نے دو مختلف قسم کے خواب دیکھے اور چاہا کہ ان سے خواب کی تعبیر دریافت کریں۔ ان میں ایک نے یہ دیکھا کہ وہ شاہ کو انگور کا شیرہ پلا رہا ہے یا انگور کی شراب سے اس کے کام و دہن کی تواضع کر رہا ہے۔ یہاں خمر کے معنی انگور کے بھی ہو سکتے ہیں، لیکن آگے چل کر حضرت یوسف نے اس خواب کی تعبیر میں چونکہ یہ بیان کیا کہ تم شاہ کے مقرب اور ساقی بنو گے تو اس سے بات واضح ہو گئی کہ یہاں خمر کے معنی شراب ہی کے ہیں، شیرۂ انگور کے نہیں، کیونکہ شاہی درباروں میں شراب و مے ہی کا دور چلتا ہے، شربت کا نہیں۔

کیا خواب کی کوئی تعبیر ممکن ہے جس کا تعلق کسی کے مستقبل سے ہو۔ نفسیات کے ماہرین کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خواب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان کے تحت الشعور میں بعض دبی اور کچلی ہوئی خواہشات کسی نہ کسی طریق سے اظہار چاہتی ہیں اور جب ذہن تدبیرِ بدن کے فرائض سے سبک دوش ہو جاتا ہے تو ان خواہشات اور آرزوؤں کو اظہار کا کھلے بندوں موقع مل جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض خارجی و داخلی محرکات کے پیشِ نظر ذہن کی کرشمہ سازیوں سے یہ خواہشات

اور آرزوئیں باقاعدہ ایک تصویر یا پکچر کے قالب میں ڈھل جاتی ہیں جنھیں ہم خواب کہتے ہیں۔ ان کا کوئی تعلق مستقبل یا کشفِ غیوب سے نہیں ہوتا۔ دو لفظوں میں اس کا جواب یہ ہے کہ ابھی تو انسان کے علم و آگہی نے ان محرکات کا احاطہ بھی نہیں کر پایا، جن کا تعلق روزمرہ کی ہماری شعوری زندگی سے ہے چہ جائیکہ ہم تحت الشعور کے اسرار و رموز پر حتمیت اور یقین کے ساتھ کوئی بات کہہ پائیں۔ آخر یہ کیوں ممکن نہیں کہ تحت الشعور میں کچھ ایسے آفاقی محرکات بھی کارفرما ہوں جن کے ڈانڈے کشفِ غیوب کے ماخذ سے جا ملتے ہوں۔

علاوہ ازیں خواب اور اس کی تعبیر کا صحیح ہونا ایسی حقیقت ہے جس کو لاکھوں اور کروڑوں انسانوں نے اپنی زندگی میں آزمایا ہے۔ علمی سطح پر متنازعہ فیہ یہ بات نہیں کہ خواب میں بعض حقائق تعبیر طلب ہیں یا نہیں۔ مسئلہ دراصل یہ ہے کہ ہم نفسیاتِ انسانی کو جاننے کے لیے مزید جدوجہد کریں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ خواب کے عالم میں انسانی ذہن کیونکر پرواز کر کے کشفِ غیوب کی سرحدوں کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ ص (النور: ۳۱)

[اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہیں]۔

اسلام میں عورت کے لباس کے بارے میں خصوصیت سے دو باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ باوقار ہو اور دوسرے یہ کہ وہ ساتر ہو جس سے سینہ ڈھنپا رہے اور کوئی مقام ایسا نمایاں نہ ہونے پائے جو مردوں کے لیے پُرکشش ہو۔

اسلام میں پردے کی اہمیت کے معنی دراصل یہ ہیں کہ وہ عورتوں کو پاکیزہ اور عفیف دیکھنا چاہتا ہے۔ پاک باز اور عفیف، ماں یا بیوی عائلی نظام کے بہتر ہونے کی ضامن ہے۔

جنس تنہا عورت کا مسئلہ نہیں مردوں کا بھی ہے۔ معاشرے میں جہاں عورتوں پر کچھ پابندیاں عائد کی گئی ہیں وہاں مردوں کے لیے بھی یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ غضِ بصر سے کام لیں۔

صنعتی انقلاب، تعلیم کا عموم، معیارِ زندگی کی گرانی اور قومی و ملکی فرائض کی بوقلمونی اور گراں باری ایسے اسباب ہیں جس کے نتیجے میں اب یہ مسئلہ تنہا مرد کا مسئلہ نہیں رہا کہ وہ تنہا ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو۔ اب جب تک عورتیں زندگی کی تگ و دو میں شریک نہیں ہوتیں معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ مزید برآں عورتوں میں خود شناسی اور خود نگہی کی صلاحیتیں نکھر رہی ہیں اور وہ کھلے بندوں اپنے بنیادی حقوق کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ اس جدید تناظر میں ہمیں تمام حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔

ہماری رائے میں یہ مسئلہ تین چار طریق سے حل ہو سکتا ہے۔

(۱) اجتماعی زندگی میں مردوں اور عورتوں کے دوائرِ کار کا تعین کر دیا جائے۔

(۲) عورتیں اپنے کو عورتیں کم سمجھیں اور انسان زیادہ۔ اسی طرح مرد بھی اپنے کو مرد سے زیادہ انسان سمجھیں اور جذبۂ جنسی کو کم اہمیت دیں۔

(۳) قوم کو اجتماعی زندگی میں ایسا نصب العین اور جامع پروگرام دیا جائے، جس کی تکمیل میں دونوں فریق شب و روز مصروف رہیں۔

(۴) مردوں اور عورتوں میں جنس کے تقاضوں کے مقابلے میں تعلیم، ترقی، اصلاح اور تہذیبی و تمدنی ضروریات کی اہمیت کی طرف زیادہ توجہ دلائی جائے۔

ان تدابیر پر عمل کرنے سے اس دور کے اجتماعی تقاضوں کی بھی تکمیل ہو سکے گی اور عفاف و پاکیزگی کا وہ ماحول بھی برقرار رہے گا جو اسلام کا بنیادی مقصد ہے۔

خ م س

خَمَسَ : اعداد سے متعلق ہے، پانچواں ہونا۔

خَمَّسَ : شعر کو پانچ مصرعوں میں بیان کرنا۔

اَلْخُمُسُ : پانچواں حصہ۔ غنائم میں ایک خمس بیت المال میں داخل کیا جاتا ہے، تاکہ اسے مسلمانوں کی عام ضروریات کے لیے صرف کیا جائے۔ علمائے اہلِ بیت کے نزدیک ہر زائد آمدنی میں پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیے۔

خمسون : پچاس۔

اَلخُمَاسی : پانچ حرفوں پر مشتمل لفظ۔

اَلخَمِیْسُ : جمعرات، لشکر۔

قرآن حکیم میں ہے :

یُمۡدِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ بِخَمۡسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيۡنَ ○ (آل عمران : ۱۲۵)

[تو تمہارا پروردگار تمہاری مدد پانچ ہزار نشان کیے ہوئے فرشتوں سے کرے گا]۔

جنگِ بدر مسلمانوں اور کفار کے درمیان پہلی اور فیصلہ کن جنگ تھی، جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی عطا کی، حالانکہ ان کی تعداد حیران کن حد تک کم تھی۔ جنگ جیتنے کے لیے صرف تعداد اور ٹیکنیک ہی کافی نہیں، اس کے لیے عزیمت، ایمان اور صبر و شکر بھی ضروری ہے۔ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ اگر تم پر کوئی فوراً حملہ کر دے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو، اس کے فرشتے تمہاری مدد کریں گے۔ فتح و نصرت کا تعلق جہاں فوجوں کی مادی قوت و استعداد سے ہے وہاں امدادِ غیبی بھی ایک بہت بڑا عامل ہے۔

یوں بھی کفر و اسلام کی جنگ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں، اللہ تعالیٰ کو بھی اس سے گہری دلچسپی ہے۔ اس لیے وہ نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کو شکست ہو جو اللہ کے دین کے مبلّغ ہیں اور اس طرح ایمان کے مقابلے میں کفر کی جیت ہو۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَيَقُوۡلُوۡنَ خَمۡسَةٌ سَادِسُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ رَجۡمًاۢ بِالۡغَيۡبِ ج (الکہف : ۲۲)

[اور بعض کہیں گے وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا اٹکل کے تکے]۔

اصحابِ کہف کی تعداد کیا تھی، اس میں محض اٹکل اور قیاس کی بنا پر لوگ مختلف آرا کا اظہار کریں گے۔ کوئی کہے گا کہ وہ تین تھے، چوتھا ان کا کتا تھا اور کوئی کہے گا، پانچ تھے، چھٹا ان کا کتا تھا۔ تعداد کا تعین تاریخی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں۔

اس آیت میں حقائق کو جاننے کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے اثبات کے لیے دلائل و

براہین کا ہونا ضروری ہے۔ بغیر کسی دلیل کے کوئی دعویٰ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ (المعارج: ۴)

[فرشتے اور روحیں اس کے پاس چڑھ کر جائیں گی ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے]۔

اس سے پہلے آسمانوں کا ذکر ہے، اس میں پھیلی ہوئی کہکشائیں اور نجوم و کواکب کا سلسلہ بہت وسیع ہے جن میں فرشتے اُترتے اور چڑھتے رہتے ہیں۔ وہ اگرچہ ایک دن میں یہ فاصلہ طے کر لیتے ہیں لیکن ان کا یہ ایک دن نظامِ شمسی کے حساب سے پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔

آیت مذکورہ سے دو باتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں، ایک یہ کہ اس وسیع و عریض کائنات کی تدبیر و اہتمام میں صرف مادی قوتیں ہی کار فرما نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات ملکی بھی بر سر کار ہیں۔

دوسرے یہ کہ زمان یا وقت کا پیمانہ کائنات کے مختلف حصوں میں مختلف ہے۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ (الانفال: ۴۱)

[اور جانتے رہو کہ جو کچھ تمھیں بطور غنیمت حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لیے ہے]۔

یعنی غنائم میں پانچواں حصہ خدا اور رسول کا ہے۔ فقہائے احناف آنحضرتؐ کے انتقال کے بعد اس حصّے کو ساقط قرار دیتے ہیں۔

شوافع کا کہنا ہے کہ یہ حصہ خلفا کو ملے گا جو اسے ملّی ضروریات کے لیے استعمال کریں گے۔

علمائے اہل بیت غنائم میں ان تمام اموال کو شامل کرتے ہیں جو وافر ہوں۔ نہج البلاغہ میں ایک مقام پر حضرت علی نے غنائم کو دولتِ وافرہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

خ م ص

خَمَصَ : بھوکا ہونا۔

خَمِصَ البطن : پیٹ کا خالی ہونا۔

خمیص البطن من اموال الناس : دوسروں کا مال ہضم نہ کرنے کی وجہ سے عفیف اور پاک باز ہونا۔

تَخَامص اللیل : رات کی تاریکی کا گم ہونا۔

تخامصت عنہ : میں مکروہات کے قریب بھی نہیں پھٹکا۔

کتب اہلِ بیت میں ایک حدیث آنحضرتؐ کے بارے میں یوں مرقوم ہے:

خَرَجَ من الدنیا خمیصًا : آنحضرت دنیا سے اس عالم میں رخصت ہوئے کہ ان کا پیٹ خالی تھا۔

مَخْمَصَۃٌ : بھوک جو لاغری پیدا کرے۔

قرآن حکیم میں ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (التوبہ : ۱۲۰)

[یہ رفاقت اس لیے تھی کہ ان مجاہدین کو اللہ کی راہ میں جو پیاس لگی، جو ماندگی پہنچی]۔

آیت کا سیاق امورِ جہاد کی تفصیلات ہیں۔ غرض یہ ہے کہ یہ ہرگز جائز نہیں کہ لوگ جہاد میں آنحضرت کا ساتھ نہ دیں اور آپ تنہا یا چند ساتھیوں کے ساتھ جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، کیونکہ جہاد ایک عبادت ہے۔ کسی قوم کے احساس تحفظ اور غیرت کی علامت ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ کس حد تک لوگوں کو اپنے عقیدہ اور اقدار سے محبت اور لگاؤ ہے۔ نیز اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے سلسلے میں یہ لوگ جان تک دے دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ یہ سب لوگ اگر جہاد کے دوران بھوک اور پیاس کی شدتوں کو برداشت کرتے ہیں تو یہ ان کے لیے

باعث اجر و ثواب ہے۔ جہاد اس وقت فرض قرار پاتا ہے جب اسلامی مملکت اس کی ضرورت محسوس کرے اور حکم دے۔ جہاد کا حکم صادر کرتے وقت مملکت کو اس امر کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے کہ قوم فوجی تیاریوں اور ٹکنیک کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ دشمن سے پنجہ آزمائی کر سکے۔

خ م ط

خَمَطَ : ایک درخت کا نام جس کے کانٹے نہیں ہوتے یا پھل نہیں دیتا۔ پیلو کا درخت، کھٹی شراب، ہر کھٹی یا کڑوی چیز۔

خَمَطَ اللبن : دودھ میں بو پیدا ہو گئی۔

خَمَطَ اللحم : گوشت بھونا۔

تَخَمَّطَ : اظہارِ کبر کیا۔ غضب ناک ہو گیا۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ۝ (سبا : ۱۶)

[اور ہم نے ان کے لذیذ باغوں کے عوض دو باغ اور دیے جو بدمزہ پھل اور جھاڑ اور قدرے قلیل بیری والے تھے]۔

یہ قومِ سبا سے متعلق ہے کہ جن کے علاقے میں دور دور تک دو رویہ باغات اور کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ اپنے دور میں یہ قوم تمدن کے عروج پر تھی۔ اسی قوم کے قابل انجنیئروں نے مآرب کا تاریخی بند تعمیر کیا تھا۔ یہ لوگ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی گوناگوں نعمتوں سے بہرہ مند رہے جب تک یہ نیک اور صالح رہے اور احکامِ الٰہی کی فرماں برداری کرتے رہے۔ لیکن جونہی انھوں نے نیکی سے منہ موڑا اور عیش و عشرت میں پڑ گئے تو مآرب کا بند اچانک ٹوٹ گیا جس سے ان کے خوش نما باغ ویران ہو گئے، کھیت اجڑ گئے اور یہ لذیذ اور عمدہ پھلوں سے محروم ہو گئے جن پر ان کی عیش کوشیوں کا انحصار

تھا۔ یہ عذابِ الٰہی تھا جو ان پر نازل ہوا تاکہ ان لوگوں کو غیرت حاصل ہو کہ اللہ تعالیٰ سے بغاوت کا انجام کیا ہوتا ہے۔

عذاب کی یہ ایک شکل تھی جس سے پہلی قومیں دوچار ہوئیں۔ اب بھی دین، اقدارِ حیات، اور نیکیوں کی محرومی سے اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوتا ہے، لیکن اس کی شکل ذرا مختلف ہے۔ آج بھی ساری متمدن دنیا میں جوہری طاقت سے خوف و ہراس کی کیفیت طاری ہے۔ اعصابی تناؤ اور اعصابی بیماریاں عام ہیں۔ مہر و وفا اور باہمی محبت کا فقدان ہے۔ عائلی اور مجلسی زندگی میں افراتفری ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک سے برسرِپیکار ہے اور قلب و روح کی نشاط آفرینیوں سے انسان محروم ہے۔ کیا یہ عذابِ الٰہی کی نئی شکل نہیں۔

خ ن ز ی ر

خنزیر : خوک، سؤر۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے مسخ شدہ قومیں اور وہ مشہور جانور جسے ہم سؤر کہتے ہیں۔ خنزیرا لبحر ایک مچھلی کا نام ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ (البقرہ : ۱۷۲)

[اس نے تم پر مردار اور خون اور سؤر کا گوشت حرام کیا ہے]۔

کھانوں کی حلت و حرمت کا معیار صرف ذوق، پسندیدگی اور اس کا صحت افزا اجزا پر مشتمل ہونا نہیں۔ اس کا تعلق قوموں کی روایات، ذوقِ انبیا کا تسلسل اور ایسے روحانی و اخلاقی اسباب سے بھی ہو سکتا ہے، جن کا انسان فی الحال تجزیہ نہیں کر پایا۔ ہمارے لیے سؤر کا گوشت اس بنا پر حرام ہے کہ قرآن نے اسے حرام قرار دیا ہے، اور بس۔ اور قرآن وہ عظیم صحیفہ ہے جو وحی و تنزیل کا آخری شاہکار ہے اور اس میں وہ تمام حقائق و معارف آ گئے ہیں جن کا تعلق جملہ انبیا و رسل کے نہ صرف پیغام سے

ہے بلکہ ان کے ذوق اور پسند سے بھی ہے۔

بعض فقہا نے سؤر کے گوشت اور شحم یا چربی میں فرق کیا ہے۔ اس کے بالوں کے استعمال کے بارے میں بھی فقہا کا اختلاف ہے۔ بعض ان کے استعمال کو جائز ٹھہراتے ہیں بعض ناجائز۔ لفظی بحثوں سے قطع نظر جب کوئی شے عنداللہ حرام و مکروہ ہو تو اس کے کسی حصے کو جائز ٹھہرانا، اس کی کراہت کو کم کرنے کے مترادف ہے۔ سؤر کا کھانا بہرحال مطلقاً حرام ہے، الّا یہ کہ اضطرار اس کا مقتضی ہو۔ یہ اضطرار انفرادی بھی ہو سکتا ہے اور بعض حالات میں اجتماعی بھی۔

خ ن س

خَنَسَ : پیچھے ہٹنا، سمٹنا، غائب ہونا۔

خَنِسَ : ناک چپٹا ہونا۔

اخْنَسَ : روکا، پیچھے ہٹا دیا۔

الخنساء : نیل گائے۔

اَلْخَنَّاس : شیطان، محرکاتِ شر جو نظر سے مخفی رہتے ہیں۔

اَلْخُنَّسُ : ستارے، جو اپنی مقررہ چال میں پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں ہے :

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۙ (التکویر : ۱۵)

[میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے ستاروں کی]۔

یہاں قرآن میں قسم کے معنی شہادت اور گواہی کے ہیں۔ یہاں نظامِ فلکی کے چند ان سیاروں کو پیش کیا ہے جو چلتے چلتے پیچھے بھی ہٹتے ہیں جیسے زحل، مشتری، عطارد، مریخ وغیرہ۔ مقصود آنحضرت کی رسالت کا اثبات ہے کہ جب اللہ نے نظامِ فلکی کی چال کے کچھ اسلوب مقرر کر رکھے ہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ زمین پر رشد و ہدایت کی درخشانیوں کا اہتمام نہ کیا جاتا۔ اس پورے عالم میں جو ہمارے گرد و پیش پھیلا ہوا

ہے، ایک نوع کی رہنمائی اور ہدایت کی کارفرمائی کا پتا چلتا ہے اور جب یہ کائناتِ مادی رشد و ہدایت کے ٹکے بندھے قاعدوں پر استوار ہے تو انسان کی احتیاج، ہدایت و رہنمائی بدرجہ اولیٰ شائستۂ التفات ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی اخلاقی و روحانی تشنگی کو دور کرنے کی غرض سے وحی و تنزیل کی رحیقِ خالص کو مہیا کیا جو آنحضرت کی معرفت نوعِ انسانی تک پہنچی۔

قرآن حکیم میں ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۙ (الناس: ۱-۴)

[آپ کہیے کہ میں انسانوں کے پروردگار کی، انسانوں کے بادشاہ کی، انسانوں کے معبود کی پناہ لیتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والے وسوسے ڈالنے والے شیطان سے]۔

غرض یہ ہے کہ ہمیں وسوسہ انداز شیطان سے اسی وقت پناہ مل سکتی ہے اور اس کے پھیلائے ہوئے جال سے اسی صورت میں مخلصی حاصل ہو سکتی ہے، جب ہم پروردگار عالم کی نوازشوں کا خیال رکھیں اور اپنے معبود و مالک خدا سے دلی لگاؤ اور تعلق کو استوار رکھیں۔ جب ہر اقدام سے پہلے ہم یہ سوچ لیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا تقاضہ کیا ہے۔ جہاں ہم اللہ تعالیٰ کو بھولے اور ان امور کو فراموش کیا، شیطان نے ہماری خواہشات کے روپ میں چھپ کر حملہ کر دیا اور جب ہم نے پروردگارِ عالم کی تعلیمات کو ملحوظ رکھا، شیطان بھاگ کھڑا ہوا۔

خ ن ق

خَنَقَ : گلا گھونٹنا۔

خُنَّاق : گلے کی وہ بیماری جو گلے کو گھونٹ دینے کا سبب بنے۔

اِخْتَنَقَ : گلا گھٹنا۔

خِناق : وہ رسی جس سے گلا گھونٹا جائے۔ گردن۔

کہا جاتا ہے:

اخذ بخناقہ: اس نے اس کی گردن پکڑ لی۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَحُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ (المائدہ: ۲)

[تم پر حرام کیے گئے ہیں مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے اور جو گلا گھونٹنے سے مر جائے]۔

ان آیات میں محرمات کی تفصیل بیان کر دی ہے، جن میں وہ جانور بھی داخل ہیں جو ذبح کے بغیر گلا گھونٹ دینے کی وجہ سے مر جائیں۔ ہر تہذیب میں کھانے پینے کی چیزوں کے بارے میں کچھ رواج و رسوم ہوتے ہیں، جو طبی اور روحانی و اخلاقی مصلحتوں کے تابع ہوتے ہیں۔ اسلام بھی چونکہ ایک عالم گیر اور آفاقی تہذیب ہے اس لیے اس کے لیے بھی ضروری تھا کہ حرام و حلال چیزوں کی وضاحت کی جائے۔ قرآن میں حلال و حرام میں وضاحت کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ قریش نے حلال و حرام کے بارے میں خود کچھ اصول گھڑ رکھے تھے جو محض توہمات پر مبنی تھے۔

طیّبات یا عمدہ کھانوں کو اسلام نے پسند کیا ہے۔ کھانے پینے پر حلال و حرام کی پابندی کے معنی یہ بھی ہیں کہ مسلمان اپنے چھوٹے چھوٹے اقدامات پر بھی اللہ تعالیٰ کے احکام سے تغافل نہ برتے اور ہر وقت اس کے احکام کو عمل و کردار میں سمونے کی کوشش کرے۔

خ و ر

خُوار: دراصل گائے کی آواز کو کہتے ہیں۔ استعارہ کے طور پر اونٹ، بکری، ہرن اور تیر کی آواز پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

خَار: سُست و کمزور ہونا، ٹوٹ جانا۔

خارت قوۃ المرض : بیماری کا زور ٹوٹ گیا۔

اَخَارَ : آمادہ کرنا۔

استخارہ : مہربانی کی توقع رکھنا۔

اَلْخُورِی : کاہن۔

رَجُلٌ خَوَارٌ : بزدل انسان۔

اَرضٌ خَوَارَۃٌ : نرم زمین۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰی مِنْۢ بَعْدِہٖ مِنْ حُلِیِّہِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّہٗ خُوَارٌ ط (الاعراف : ۱۴۸)

[قوم نے موسیٰ کے جانے کے بعد ایک بچھڑا اپنے زیوروں سے بنایا یعنی ایک قالب جس کے اندر ایک آواز تھی]۔

حضرت موسیٰ جب چالیس روز کے لیے توریت کے حصول کی غرض سے طور پر روانہ ہوئے تو بنی اسرائیل میں چونکہ توحید کا عقیدہ ابھی اچھی طرح رچا بسا نہ تھا، اس لیے انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک مورتی بنالی جائے جس کی ہم پرستش کریں، سامری نے جو مشہور کاہن تھا اسرائیلیوں سے چاندی سونے کے زیور لیے اور انھیں ایک ایسے قالب میں ڈھال دیا جس کی شکل بچھڑے کی سی تھی۔ اس میں خوبی صرف یہ تھی کہ اس میں سے ایک آواز نکلتی تھی۔ اتنی سی شعبدہ طرازی سے یہ لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے گئوسالہ پرستی شروع کر دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ گائے کی تقدیس کا تصوّر ہندوستان کی وساطت سے مصر میں پہنچ چکا تھا اور مصری بھی ہندوؤں کی طرح گائے کو مقدس جانور سمجھتے تھے۔

توحید اگرچہ بہت سادہ اور سمجھ میں آنے والا تصوّر ہے، مگر انسان کی یہ ہمہ گیر کمزوری ہے کہ یہ توحید کی نسبت شرک کی جانب زیادہ مائل نظر آتا ہے۔ اس لیے جہاں کوئی اعجوبہ طرازی دیکھتا ہے یا کسی شخص یا مقام کی تقدیس کی داستانیں سنتا ہے،

فوراً اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور شرک پرستی شروع کر دیتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ سے بہتر کون ذات ہے جو ہماری ضروریات سے آگاہ اور باخبر ہے۔

خ و ض

خَوضٌ : پانی میں گھسنا۔ عام لغت نگاروں نے خوض کے معنی پانی میں گھسنے کے کیے ہیں، مگر راغب اور زمخشری کے نزدیک لایعنی باتوں میں دخل اندازی کرنا بھی اس میں شامل ہے۔

خاض الماء: پانی میں گھس گیا۔

اَخاضوا الماء : جانوروں کو پانی میں داخل کیا۔

خاض فی الکلام : بات چیت میں حصہ لینا۔

خاض القوم فی الحدیث : لوگ باہم باتوں میں مشغول ہو گئے۔

خوض کے معنی قرآن حکیم میں ہر جگہ لایعنی باتوں میں مشغول ہونے کے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَخُضۡتُمۡ كَالَّذِىۡ خَاضُوۡا‌ؕ (التوبہ : ۶۹)

[اور تم لوگ بھی گھسے جیسے پہلے لوگ گھسے تھے]۔

منافقین سے کہا جا رہا ہے کہ جس طرح پہلی قومیں کثرتِ اولاد، مال و دولت کی فراوانی اور حیاتِ عارضی کی خوش کامیوں میں مصروف رہیں، تمہارا اندازِ فکر و عمل بھی ایسا ہی ہے۔ تم بھی ان لایعنی باتوں میں مصروف ہو، حالانکہ تمہارے سوچنے کی باتیں تو یہ ہیں کہ اللہ کو مانو، اس کے رسول کی اطاعت کرنا سیکھو اور یہ جاننے کی کوشش کرو کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔ کیا خیر ہے اور کیا شر ہے، کن اعمال سے ہم دین و دنیا کی فلاح پانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور کون امور ایسے ہیں جن کے ارتکاب سے ہمیں دو عالم میں خسران، گھاٹا اور نقصان اٹھانا پڑے گا۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ﴿ (المدثر: ۴۵)

[اور مشغلے میں پڑے رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغلے میں پڑے رہتے تھے]۔

اہلِ جہنم سے پوچھا جائے گا کہ تمھیں عذاب سے کیوں دوچار ہونا پڑا۔ اس کا وہ جواب دیں گے کہ ایک تو ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور اس بات کے قائل نہیں تھے کہ جس ذات نے ہمیں خلعتِ وجود سے نوازا، اس سے بندگی اور عبودیت کے رشتوں کو استوار کرنا ضروری ہے۔ دوسرے مال دار اور امیر ہونے کے باوجود ہم یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ہماری دولت و ثروت میں غربا اور مساکین کا بھی حصہ ہے جو انھیں ملنا چاہیے تیسرے دین پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کے بجائے ہم اسے لایعنی، غیر اہم اور ناقابلِ التفات مشغلہ سمجھتے تھے اور یہ نہیں سوچتے تھے کہ وہ دین جو اللہ نے انبیا کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے، ہماری فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ یہ تو وہ دور تھا جب علم کی روشنی عام نہیں تھی۔ آج بھی خود مسلمانوں میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو دین کو بحث و تمحیص اور طعن و تشنیع کا ایک مشغلہ سمجھتے ہیں اور ان کا مذہب سے لگاؤ صرف گفتگو اور بحث و مناظرے کی حد تک محدود ہے، اور جو مذہب و دین کی اہمیت کے قائل بھی ہیں، وہ بھی اس کو عمل و کردار میں سمونے کی کوشش نہیں کرتے۔ کچھ ایسے حضرات بھی ہیں جو ظواہر کی حد تک مذہب پر عمل پیرا ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ مذہب و دین کا تعلق پاک بازی، نیکی، انسان دوستی اور فکر و نظر کی بلندیوں سے ہے۔

خ و ف

خَوْفٌ : اہلِ لغت نے عام طور پر اس کے معنی ڈر، اندیشہ، احتیاط اور گھبراہٹ کے کیے ہیں۔ علامہ راغب نے اس کے معنی کسی متوقع خطرے یا اندیشے کے کیے ہیں۔ مکافاتِ عمل کے قانون سے ڈرنا بھی اس میں شامل ہے۔ قرآن میں اس کا اطلاق ایسے اندیشہ و فکر سے بھی ہے، جس کا تعلق رضائے الٰہی کی مخالفت سے ہے۔

خَافَہٗ : اس سے ڈرا، یا ڈر گیا۔

تَخَوَّفَ الحق : کسی کا حق مارنا۔

تَخَوَّفَ الشیٔ : کم کرنا، کسی شے کو تھوڑا تھوڑا کم کر دینا۔

خَوَّفَہٗ : اس کو ڈرانا۔

الخواف : شور، ہنگامہ۔

الخیفَۃ : ڈرنے کی کیفیت یا حال۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ
فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۭ (والنزعٰت: ۴۰)

[اور جو کوئی ڈرا ہوگا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے اور نفس کو خواہش سے روکا ہوگا تو ایسے شخص کا ٹھکانا جنت ہے]

یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو نفس میں ابھرنے والی خواہشات کو قابو میں رکھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ یہ خواہشیں اور آرزوئیں کہیں ان کو راہِ راست سے بہکا نہ دیں اور ان کی وجہ سے ان کو اللہ کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

خواہشات اور آرزوئیں بجائے خود بُری نہیں۔ ان کا عمل تخلیقی اور عملی ہے، یہ نہ ہوں تو نہ صرف انسان کا اپنا تشخص ہی ختم ہو جائے بلکہ سرے سے عمل و حرکت کا وظیفہ ہی ختم ہو جائے اور انسان اس کارزارِ حیات میں کچھ بھی نہ کر پائے۔ اسلام خواہشات کو ختم کر دینے کے حق میں نہیں۔ اسلام صرف یہ چاہتا ہے کہ انسان ان پر کڑی نگاہ رکھے تاکہ معصیت اور گناہ کے ارتکاب سے بچ جائے۔ یہاں خوف اندیشۂ انجام کے معنوں استعمال ہوا ہے۔

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (النحل: ۵۰)

[وہ ڈرتے رہتے ہیں اپنے رب سے جو ان پر بالادست ہے اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا رہتا ہے]۔

اس آیت کا تعلق ملائکہ سے ہے جو اپنے پروردگار کے احکام کی تعمیل میں کوئی

دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ تورات میں بعض فرشتوں کو گنہگار ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ اس کی کھلی ہوئی تردید ہے، کیونکہ فرشتے ہی تو وہ ذریعہ ہیں جن کی وجہ سے نظامِ کائنات کا ربط وضبط قائم ہے۔ یہ اللہ کی نافرمانی بھلا کیوں کریں گے۔

قرآن حکیم میں ہے:

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۝ (آل عمران : ۱۷۵)

[یہ تو شیطان ہیں جو تمھیں اپنے دوستوں کے ذریعے سے ڈراتا ہے]۔

اسلام امن اور خوش کامیوں پر روشنی ڈالتا ہے اور مایوس انسانوں کے دلوں میں امید ورجا کے دیے جلاتا ہے۔ ہدایت وراہنمائی کے تحائف پیش کرتا ہے۔ مسلمان خطروں سے نہیں ڈرتا، یہ شیطان کا کام ہے کہ گمراہی اور ضلالت کے ذریعے مسلمانوں کے دلوں میں خوف اور ڈر پیدا کرے اور مایوسیوں کو پھیلائے۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝ (الذاریت : ۲۸)

[پھر آپ ان سے دل میں خائف ہوئے، انھوں نے کہا آپ ڈریے نہیں۔ اور ان کو ایک بڑے عالم لڑکے کی بشارت دی]۔

حضرت ابراہیم کے بارے میں ہے کہ آپ کے پاس انسانی قالب میں فرشتے آئے۔ علیک سلیک کے بعد آپ نے ان کے سامنے بھنے ہوئے بچھڑے کا گوشت پیش کیا، لیکن انھوں نے کھانے میں تامل کیا۔ اس سے ان کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ یہ کہیں چور اور قزاق تو نہیں جو ہمیں شرفِ مہمان نوازی سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس پر فرشتوں نے کہا، ہم آپ کو اس بڑھاپے میں فرزند ارجمند کی خوش خبری سنانے آئے ہیں۔ یہ فرزند فرزانہ اور بردبار ہوگا۔ ان کا اشارہ حضرت اسحاق کی جانب تھا۔

خوف واندیشہ کی یہ کیفیت بالکل قدرتی ہے جو ایسے مواقع پر پیدا ہو جاتی ہے اور یہ قطعی قابلِ اعتراض نہیں اور نہ اس کا تعلق جبن اور بزدلی سے ہے۔

خ و ل

خَوّل لہ مالاً : اس کو مال عطا کیا۔

لِفَلَانٍ خَیلٌ : فلاں خدم وحشم کا مالک ہے۔

خائلٌ : مال کا نگران۔

یَتَخَوّلُ : کبھی کبھی نگرانی کرنا، حالات کی سازگاری کا خیال رکھنا۔

حدیث میں ہے :

کان رسول اللہ یتخول اصحابہ بالموعظۃ : آنحضرت وعظ ونصائح میں صحابہ کے معاملے میں وقت وحالات کی سازگاری کا خیال رکھتے تھے۔

خَالَ : نگہبانی کرنا۔

اَخول : جس کا کوئی ماموں ہو۔

اَلخُولُ : جس کا کوئی ماموں ہو۔

اَلخَال : ماموں۔

اَلخَالہ : موسی۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ (الانعام : ۹۴)

[جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا تم نے اس کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا]۔

خطاب منکرین اور کافروں سے ہے کہ آج تم جہنم میں ذلت کا عذاب جھیل رہے ہو، وہ تمھارے دیوتا اور شفعاء کہاں ہیں جو تمھاری مدد کو آئیں۔ تم نے زندگی میں اس بات کا خیال نہ رکھا کہ ہم نے رشد وہدایت کے علاوہ تمھیں کیا کیا نعمتیں عطا کیں۔ تم نے شکر کے بجائے تکبر سے کام لیا اور اپنی حمایت میں ایک لاؤ لشکر تیار کیا جو حق وصداقت کی مخالفت کرے اور تعلیماتِ وحی کا مذاق اڑائے۔ اس گستاخی کا مزہ اب چکھو۔

یہاں تخویل کا لفظ دولت اور خدم و حشم عطا کرنے کے علاوہ روحانی و اخلاقی نعمتیں عطا کرنے کے معنی میں بھی ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے :

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ (النساء:۲۳)

[اور تمھارے اوپر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں]۔

عمرانیات کے جاننے والے جانتے ہیں کہ ابتدائی معاشروں میں نکاح کے لیے کوئی شرط نہ تھی۔ یہودیوں نے حلال و حرام رشتوں کی قدرے وضاحت کی، لیکن اناجیل اس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ قرآنِ حکیم نے جن عورتوں سے عقد جائز نہیں ٹھہرایا ان کی ایک مکمل فہرست بتادی ہے، ان میں خالائیں بھی داخل ہیں۔ یہ فہرست نہ صرف عائلی زندگی کی استواری کے لیے ضروری ہے بلکہ اس کی تہہ میں رشتوں کا وہ احترام بھی کارفرما ہے جن کا تعلق فطرت و ذوقِ انسانی کے عین مطابق ہے۔ قرآن حکیم چونکہ ایک مکمل ہدایت نامہ ہے، اس لیے جہاں اس نے عقائد و اقدارِ حیات کی بحث کی، وہاں عائلی زندگی کی تنظیم و تشکیل کے بارے میں بھی کسی مسئلے کو تشنۂ تکمیل نہیں رکھا۔

خ و ن

خَانَ : علامہ راغب نے خیانت کو امانت کی ضد قرار دیا ہے۔ اس کا اطلاق نفاق بے وفائی اور دین کے معاملے میں مخالفت کرنے کے بھی ہیں۔ بے وفائی کرنا، ذمہ داری کو نہ نبھانا اور عہد و پیمان کو توڑنے کے بھی آتے ہیں۔ کمزوری کے معنوں میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔

خَانَ فِی کَذَا : اس معاملے میں اس نے بد دیانتی سے کام لیا۔

خَانَهٗ سَیْفُهٗ : اس کی تلوار نے اس کا ساتھ نہ دیا، یعنی اُچٹ گئی۔

خَوَّنَ : کسی کی طرف خیانت کی نسبت کرنا۔
تَخَوَّنَ الدھر : زمانے نے اس کی خوش حالی کو تنگ دستی میں بدل دیا۔
اَلْخَائِنَۃ : یہاں "تا" یا تو مبالغہ کے لیے ہے۔ یعنی بہت بڑا خائن۔ یا "تا" مصدر کے معنوں میں ہے جیسے عافیۃ، طاغیۃ اور کاذبۃ وغیرہ۔
اِسْتَخَانَ : خیانت کرنا۔
اَلْخِوانُ : دسترخوان۔

قرآنِ حکیم میں ہے :

وَاِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَکَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰہَ مِنْ قَبْلُ (الانفال: ۷۱)

[اور اگر یہ آپ سے خیانت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو یہ اس سے قبل اللہ سے بھی خیانت کر چکے ہیں]۔

معرکۂ بدر کے اسیروں کے بارے میں ہے، یہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ ہمیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ صحابہ اور آنحضرت مسلمانوں کی مالی احتیاج کے مدنظر ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دینے پر آمادہ تھے۔ قرآن حکیم نے اس اجتہادی خطا پر متنبہ کیا کہ دشمنوں کا جب تک صفایا نہ کر دیا جائے، لڑائی جاری رکھی جائے۔ اگر ان کی نیتوں میں فتور ہے تو یہ ان کی پرانی بیماری ہے۔ آج یہ آپ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اور دینِ حق کی مخالفت پر مصر ہیں۔ آپ ذرا غم نہ کریں۔ انھوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کی ہمیشہ مخالفت کی ہے لیکن آخر کار یہ ناکام ہوئے اور حق ہی کا غلبہ ہوا ہے۔

یہاں لفظ خیانت، مخالفتِ حق و صداقت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ خطاءِ اجتہادی انبیا سے بھی سرزد ہو سکتی ہے۔ مجتہد کی خطا و لغزش کا تعلق مسئلے کی صحت و عدمِ صحت سے ہوتا ہے۔ انبیا کے اجتہاد میں صائب اور صائب تر حقیقت کے انتخاب و اختیار میں لغزش ہوتی ہے۔ جیسے اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے مسلمانوں کی مالی احتیاج اور اپنی طبعی رحم دلی

کی بنا پر فدیہ لینے پر اکتفا کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سے زیادہ صائب نقطۂ نظر اختیار کرنے کی تلقین کی، یعنی اسلام کے پورے پورے غلبہ و تسلّط کی۔ کیونکہ اگر اسلام کا بول بالا ہوتا ہے تو مسلمانوں میں مالی استحکام بھی پیدا ہوتا ہے، اور رحم دلی کا جذبہ بھی تمام مسلمانوں میں ایک کردار کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (الانفال: ۲۷)

[اللہ اور اس کے رسول کی خیانت مت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو]۔

یہاں تخاطب مسلمانوں سے ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو ذمہ داریاں آپ پر ڈالی ہیں ان سے برابر عہدہ برآ ہوتے رہو اور کسی معاملے میں اللہ اور رسول کے احکام، تعلیمات اور پیغام سے روگردانی نہ کرو۔ نہ فکر کے دائرے میں اور نہ عمل کے دائرے میں۔

قرآن حکیم میں ہے:

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ج (البقرہ: ۱۸۷)

[اللہ کو خبر ہو گئی کہ تم اپنے کو خیانت میں مبتلا کرتے رہتے تھے۔ پس اس نے تم پر رحمت سے توجہ فرمائی اور تم سے درگزر کر دی]۔

آیت کا براہِ راست تعلق رمضان سے ہے۔ بعض صحابہ رمضان میں اپنی بیویوں سے جنسی اختلاط سے کلیتہً کنارہ کش رہتے تھے، یہ تقاضائے جنس کے فطری حق سے محرومی یا اس فطری جذبے سے گویا خیانت کرنے کے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر کہ رمضان کی راتوں میں تمھارے لیے اپنی بیویوں سے جنسی اختلاط حلال و جائز ہے، انھیں اجازت دے دی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام ایسا دینِ فطرت ہے جو جذبۂ جنسی کا احترام کرتا ہے، اور خواہ مخواہ اس پر تجرد اور عورتوں سے کنارہ کشی کی قدغن عائد نہیں کرتا۔ عورتوں سے الگ تھلگ رہنا اور نکاح نہ کرنا، عفاف اور تقویٰ کی نشانی نہیں بلکہ ایک طرح کی محرومی ہے جو اور کئی محرومیوں کو جنم دیتی ہے، جیسے عدمِ محبت و تودد اور انسان

دشمنی وغیرہ ۔ عفاف وکردار کا یہ غیر اسلامی تصوّر ہمارے تصوف میں بدھ مت اور عیسائیت کے راستے سے آیا ہے، جہاں عورتوں کے وجود ہی کو سرے سے گناہ اور شر قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ازدواجی تعلق میں وہ بہت بڑی نیکی ہے جو نوع انسانی کو تسلسل اور استمرار بخشتی اور آگے بڑھاتی ہے۔ اسلام اور دوسرے تصوفی مذاہب میں بنیادی فرق یہی ہے کہ اسلام کسی جبلی تقاضے کی نفی نہیں کرتا، آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشات کو ناجائز نہیں ٹھہراتا بلکہ ان کی تسکین کی خاطر معقول راہیں اور سانچے مہیا کرتا ہے، کیونکہ ان کی نفی انسانی تشخص کی نفی ہے۔ اگر بقول بدھ کے "نروان" یا نجات یہی ہے کہ انسان ہر خواہش، ہر تمنا اور ہر آرزو سے دست کش ہو جائے تو پھر انسان کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں رہتی کہ وہ مٹی کا ایک ڈھیر یا چلتی پھرتی لاش ہے متحرک انسان نہیں۔

یہ لوگ جو انسان کو اس کے جبلی تقاضوں کی تکمیل اور ترفیع کے بجائے محض نفی کے قائل ہیں، خود فطرت کی حقیقت سے نابلد ہیں۔ جب اس عالمِ اکبر میں کوئی شے زائد، غیر ضروری اور بے فائدہ نہیں پائی جاتی تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ اِس عالمِ اصغر، میں جسے ہم انسان سے تعبیر کرتے ہیں، خواہشات، آرزوئیں اور جبلّی تقاضے بے کار شے ہوں۔

قرآن حکیم میں ہے:

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ۝ (المؤمن: ۱۹)

[اللہ جانتا ہے آنکھوں کی چوری کو اور جو کچھ سینوں میں چھپا ہوا ہے]۔

اس آیت کا سیاق، یومِ احتساب کی تفصیلات بیان کرنا اور اس حقیقت کا اظہار کرنا مقصود ہے کہ اس احتساب کے دن کوئی گناہ، کوئی عمل اور قلب میں آنے والا کوئی وسوسہ چھپا ڈھکا نہیں رہے گا۔ حتّٰی کہ آنکھیں جو چوری چھپے کسی کو نظرِ بد سے دیکھ لیتی ہیں، وہ بھی اللہ کے دائرۂ علم میں ہے۔ اس لیے اس آنے والی گھڑی سے ڈرو، جس دن کوئی دوست، شفیع اور معبودانِ باطل میں سے تمھیں عذاب سے چھٹکارا نہیں

دلا سکے گا۔ یہاں اللہ کے علم کی ہمہ گیری کا تذکرہ ہے۔ آنکھ کی چوری اتنی چھوٹی سی بات ہے کہ خود دیکھنے والے کو بھی اکثر محسوس نہیں ہوتی۔ غرض یہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی حرکت بھی ایسی نہیں جو اس کی ذات والاصفات سے اوجھل ہو۔ وہ ہر شے اور اس کے محرکات و بواعث کو جانتا ہے۔

خ و ی

خَوَیٰ : گھر کا گر پڑنا، خالی ہو جانا، بھوکا ہونا۔

خَوَیٰ بَطْنہ من الطعام : اس کا پیٹ بھوکا ہے۔ یہ غذائی اجزا سے خالی ہے۔

دارٌ خَاوِیَۃ : ویران گھر، جس کی چھت گر پڑے۔

اَلْخَوَاءُ : بھوک۔

خَوَّتِ النجوم : ستارے اپنی چال چلتے رہے مگر بارش نہ ہوئی۔

اَخْوَیٰ الزند : آگ نہ دینا۔ چقماق کی رگڑ سے آگ کے شعلوں کا نہ نکلنا۔

اِخْتَوَیٰ : بے عقل ہونا۔ عقل و خرد سے تہی ہونا۔

قرآن حکیم میں ہے :

اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ وَّھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا ج (بقرہ : ۲۵۹)

[یا پھر ایسے شخص پر نظر کی جو ایک بستی سے گزرا تھا اس حال میں کہ وہ بستی چھتوں کے بل پر گری ہوئی تھی]۔

آیت کا سیاق حضرت ابراہیم کے اس سوال سے متعلق ہے کہ اے خدا مجھے اس حقیقت کی معرفت مرحمت فرما کہ تو مردوں کو کیونکر زندگی عطا کر دینے پر قادر ہے۔ یہی استعجاب عزرا یا برمیا نبی کو یروشلم کی تباہی کو دیکھ کر ہوا، جس کو بخت نصر نے برباد کر دیا تھا کہ پروردگار اب اس بستی میں زندگی کی بہار کب آئے گی۔ یہ پھر کب زندگی کی نشاط آفرینیوں سے آشنا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک سو سال موت کی نیند سلائے رکھا اور پھر زندگی

عطا کرکے بتادیا کہ یوں۔ اس استشہاد میں ایک پہلو اعجاز یا خرقِ عادت کا پایا جاتا ہے۔

موجودہ سائنسی دور میں اس نوع کے خوارق پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ نظام عالم میں جاری و ساری قوانینِ فطرت کے یہ خلاف ہے کہ اس نوع کے خوارق ظہور پذیر ہوں۔ خوارق کے امکانات پر غور کرنے کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر غور کیجیے تو حقیقتِ حال خود بخود نکھر کر فکر و نظر کی سطح پر ابھر کر سامنے آجائے گی۔

(۱) ان خوارق کا ایک پہلو تاریخی ہے اور ایک سائنسی۔

(۲) ان خوارق کی شہادت انبیا نے دی ہے، جن سے زیادہ کوئی بھی صادق و مصدوق نہیں۔

(۳) جب مردہ قومیں، مظلوم عوام اور اجڑی ہوئی بستیاں، زندگی اور حریت و آزادی کی طرفہ طرازیوں کے حصول پر قادر ہیں تو مردہ شخص کیوں دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتا۔

(۴) اب سائنسی پہلو کو لیجیے۔ سائنس کیا ہے۔ کائنات میں علّت و معلول کی دریافت کا دوسرا نام فلسفے کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ ہیوم اور غزالی نے علّت و معلول کی مطلقیت کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ یہ محض افترانِ نتائج کا مسئلہ ہے کہ ہم سابق کو علّت اور لاحق کو معلول قرار دیتے ہیں، ورنہ علّت اپنے معلول کو قطعی اپنے بطن میں لیے ہوئے نہیں ہوتی۔ مسئلے کے اس تجزیہ سے سائنس کی حاکمیتِ مطلقہ کا قصر دھڑام سے زمین پر آرہتا ہے۔

(۵) سائنسی تجربات کی بنیاد استقرائی اہلیت پر مبنی ہے اور استقرار اور اغلبیت میں ہمیشہ استثنا کی گنجائش رہتی ہے۔

(۶) یہ عالمِ رنگ و بو اور اس کی پہنائیاں، سائنس کے تجربات کے دائرۂ علم و تجربہ سے خارج ہیں۔ کیونکہ یہ عالم کیوں کر وجود میں آیا، کس طرح پھیلا، بڑھا اور پروان چڑھا اس کی کوئی توجیہ سائنس کے تجربہ و مشاہدہ کی روشنی پیش نہیں کرسکتی، اس لیے کہ انسان کو عالمِ وجود میں آئے ہوئے چند کروڑ برس ہی تو ہوئے ہیں اور اس عالم کا تخلیقی اور ارتقائی مرحلہ کھربوں سالوں پر پھیلا ہوا ہے جس کا ادراک آج کا انسان ہرگز

نہیں کر سکتا۔

(۷) سائنس کے پاس اس ٹیڑھے اور تیکھے سوال کا بھی کوئی جواب موجود نہیں کہ بے شمار کہکشاؤں، بے حد وشمار نجوم و کواکب کی تعداد مخصوص فاصلوں اور متعین دائروں میں کیوں مرکوز ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے کسی بھی مظہر کا کیمیاوی تجزیہ کیجیے تو ان کے اجزائے ترکیبی میں کوئی ایسا عنصر پایا نہیں جاتا جو انھیں ایک نظام کی سلک میں پرو سکے یا ان میں جذب و کشش کی صلاحیتیں پیدا کر دینے کے کسی اصول کی نشان دہی کر سکے۔

اس سوال کا جواب صرف مذہب و فلسفہ دے سکتا ہے، سائنس نہیں۔

(۸) خوارق و معجزات پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ لاز آف نیچر یا طبیعیت فطرت کے قوانین کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔ آیے پہلے ہم یہ سمجھ لیں کہ قوانینِ فطرت کے معنی کیا ہیں۔ اس کے معنی فطرت کے ایک انداز کا استمرار ہے۔ لیکن یہ استمرار ایک اضافی اصطلاح ہے۔ اس استمرار میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یکسانی نہیں ہوتی۔ ایک استمرار لاکھوں برس تک جاری و ساری رہتا ہے اور پھر یہ استمرار فجائی طور پر ایک نئی کروٹ لیتا ہے، جس پر پھر ہزاروں اور لاکھوں برس گزر جاتے ہیں، اس کے بعد استمرار کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جس کا تسلسل بھی اپنے آغوش میں ہزاروں اور لاکھوں سال لیے ہوتا ہے۔ اس طرح گویا خود طبیعت یا فطرت کا انداز اپنے اندر گوناگوں تغیرات اور تقلبات لیے ہوتا ہے یعنی بعید ترین ماضی میں فطرت کا یہ انداز ٹوٹتا پھوٹتا رہتا ہے اور نئے نئے استمرار سطحِ وجود پر ابھرتے رہتے ہیں۔

پہلے مادہ لاکھوں برس تک ایک منتشر حالت میں سرگرداں رہا۔ پھر اس نے کچھ ٹھوس جماداتی شکلیں اختیار کیں۔ اس کے بعد نباتات کا دور آیا، پھر جوششِ حیات معرضِ وجود میں آئی اور لاتعداد حیوانات نے انگڑائی لی اور ان سب کے بعد انسانی فکر و اندیشہ نے اس پورے عالم کو سمجھا اور جانا بوجھا۔ اگر مسئلے کا یہ تجزیہ صحیح ہے تو پھر لاز آف نیچر کی ابدیت، لزوم اور قطعیت کا بھرم کھل جاتا ہے۔ یہ قوانین ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ یہی عالمِ ہست و بود کی ریت ہے۔

(۹) آپ موت کو حیات کے سانچے میں ڈھل جانے کے منظر کو حیاتیات کے نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ علم الحیات کے ماہرین نے متعدد ایسے صحرائی حشرات کی نشان دہی کی ہے جو دھوپ اور صحرا کی تپش و حرارت سے مرجاتے ہیں لیکن جوں ہی بارش ہوئی اور چند قطروں نے ان میں نمی پیدا کی، ان میں حرکت و زندگی پھر سے لوٹ آئی اور وہ رینگنے اور اٹھکیلیاں کرنے لگے۔

(۱۰) علم الجنین کا یہ خارقہ بھی ذہن میں رکھیے کہ جو انسان لاکھوں اور کروڑوں برس کے بعد فطرت کے شکم میں پلتا اور پرورش کے مراحل میں سرگرداں رہا، وہ ماں کے شکم میں نو ماہ کی مدت میں تولد کے تمام مرحلے طے کرلیتا ہے۔ اور آج ——— یہی انسان بطنِ مادر سے بے نیاز ہو کر ٹیوب میں تولد کے فاصلوں کو طے کرنے لگا ہے۔

(۱۱) تم سائنس کے خوارق پر آنکھیں بند کرکے ایمان لے آتے ہو، اور خوارقِ نبوت پر حیرانی اور استعجاب کا اظہار کرتے ہو۔ یعنی تم اس حقیقت کو بغیر کسی چون وچرا کے مان لیتے ہو کہ جو انسان لاکھوں اور کروڑوں برس سے پابگل تھا، جس کو زمین کی گرفت نے زمین کا زندان بنا رکھا تھا، آج اس کی اُڑان نے اس کو چاند کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے لیکن جب معراج کا ذکر کیا جاتا ہے تو ناک بھوں چڑھاتے ہو۔ آخر سائنس اور نبوت میں اس کے سوا کیا فرق ہے کہ جس حقیقت کو نبوت نے چودہ سو برس پہلے پہچان لیا تھا تم نے اُسے آج پہچانا ہے۔ بلاشبہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا یہ ارتقا سائنسی اصطلاحوں میں قابلِ فہم ہے، لیکن معجزات کا ادراک علم و عرفان کے اس دائرے سے خارج ہے۔

تم صحیح بات کہتے ہو۔ لیکن معجزات اور سائنس کے خوارق میں جو اصولی اور بنیادی فرق ہے اس کو تم سمجھ نہیں پائے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا یہ ارتقا بشر کے اس ذہن کی طرفہ طرازیوں کا نتیجہ ہے جو بشر کے ذہن کی زیریں سطح سے متعلق ہے۔ اس کی ایک اعلیٰ، عمیق اور لاتعداد آفاق و ابعاد کی حامل سطح وہ ہے جس کا تعلق قلبِ پیغمبر سے ہے، تعلق باللہ اور تعلق بالرسالۃ سے ہے۔ میں اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں

کہ جب انسان نے ان اسرار و رموزِ نبوت کو ایک فن، ایک کلام اور مربوط سائنس کی صورت میں تبدیل کر دیا تو یہی بشر اور یہی انسان بغیر کسی سائنسی میکانزم کے فضا میں پرواز کرنے لگے گا، دریاؤں، سمندروں اور صحراؤں کو عبور کرنے کے قابل ہو جائے گا اور فیوضِ نبوت کی روشنی میں یا اللہ اور اس کے رسول سے تقرب و اتصال کی بدولت بغیر کسی آلاتی نظام کے یہاں بیٹھا ہوا بشر امریکہ اور ماسکو میں دھڑکنے والے دل کی دھڑکنوں کی آواز سن سکے گا۔

خ ی ب

خَابَ : محروم ہوا، ناکام ہوا۔

خَابَ سَعْیُہٗ وَ اَمَلُہٗ : اس کی کوشش رائیگاں گئی اور اس کی امید بر نہ آئی۔

خیبۃٌ : محرومی، ناکامی۔

کہا جاتا ہے۔

الھیبۃ خیبۃ : ڈر جانا اور حالات کا مقابلہ نہ کرنا، نامرادی اور محرومی ہے۔

خَیَّابٌ : چقماق، پتھر جو آگ نہ دے جس سے شعلہ نہ نکلے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰی ۝ (طٰہٰ : ۶۱)

[اور جو کوئی جھوٹ باندھتا ہے ناکام ہی رہتا ہے]۔

آیت کا سیاق اس معرکہ آرائی سے متعلق ہے جو فرعون کے ساحروں اور حضرت موسیٰ و ہارون کے مابین وقوع پذیر ہوئی۔ حضرت موسیٰ نے ساحروں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ دیکھو سچائی اور صداقت کا مقابلہ جھوٹ اور افترا سے نہ کرو۔ یہ شعبدہ بازی اور اللہ پر یہ افترا کہ اس کا کوئی شریک اور ساجھی بھی ہو سکتا ہے نرا جھوٹ اور خلافِ واقعہ بات ہے۔ توحید و نبوت کی اساس، عقل فہم اور بصیرت کی ضیا افروزیوں پر مبنی ہے، تمہارے پاس اس کے خلاف اگر کوئی روشن دلیل ہو تو پیش کرو۔ سحر اور

جادو کے زور سے حق پر غلبہ پانا آسان نہیں۔ یاد رکھو کہ تم ان ہتھکنڈوں کو استعمال کرنے کے باوجود ناکام اور خائب و خاسر رہو گے، اس لیے کہ افترا اور جھوٹ کے مقدر میں ناکامی اور نامرادی لکھی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ (الشمس : ۱۰)

[اور جو کوئی جھوٹ باندھتا ہے ناکام رہتا ہے]۔

انسان کے قلب و ضمیر اور اس کے نفس کی گہرائیوں میں جس طرح عقل و دانش اور حسن و جمال کی جانچ پرکھ کے تقاضوں کو ودیعت کیا گیا ہے، اسی طرح اس کی فطرت میں خیر و شر میں امتیاز کرنے کی صلاحیتیں بھی ودیعت کی گئی ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں "فجور و تقویٰ" میں جو فرق و امتیاز کے حدود ہیں، ان کی پہچان بھی اس کی فطرتِ سلیمہ کے دائرے میں داخل ہے۔ گویا خیر و شر کا احساس بھی اللہ تعالیٰ کے ان انعاماتِ گوناگوں میں سے ہے، جن سے انسان کو بہرہ ور کیا گیا ہے۔ اس لیے جو شر سے بچتا اور تقویٰ و خیر کے تقاضوں کو پروان چڑھاتا ہے وہ دین و دنیا کی فلاح و بہبود کو حاصل کرنے میں کامیاب و سرخرو رہتا ہے اور جو تقویٰ و خیر کے لطیف تقاضوں کو ادنیٰ خواہشات کے بار تلے دبا دیتا ہے، اس کا مقدر محرومی ہے۔ نتائج و ثمرات سے قطع نظر اس سے بڑی محرومی و نامرادی اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان میں نیکی اور سچائی کے جذبوں کو پروان چڑھانے کا یارا نہ رہے اور وہ ادنیٰ خواہشاتِ نفس کی تکمیل میں سرگرداں ہے۔

خ ی ر

خَيْرٌ : نیکی، خوبی، فضیلت و کرم۔ مرغوب۔ دل پسند جس کے لیے دل میں رغبت و طلب پیدا ہو۔ مال و دولت، ہر وہ خوبی اور ہر وہ حسن و جمال کا پہلو جو جسم سے لے کر روح و قلب کی تابانیوں تک کا احاطہ کیے ہوئے ہو، شر کی ضد۔

خَارَهٗ : اس کو چن لیا، منتخب کیا۔

خَیَّرَ : فضیلت دی، ترجیح دی، اختیار دیا۔

اِخْتَارَ : چن لیا۔

اِسْتَخَارَ : طلب خیر کرنا۔ طلب خیر کی اللہ سے دعا کرنا۔

اَلْخِیَرَۃُ : منتخب، افضل، بہتر۔

اَلْخِیَارُ : پسندیدگی، ککڑی۔

ھو من اھل الخیر : وہ شائستہ لوگوں میں سے ایک ہے۔

رَجُلٌ خَیِّرٌ : عمدہ انسان، اچھا آدمی۔

اَنت عَلَی المُتَخَیَّرِ : تم جو چاہو کرو۔

قرآن حکیم میں ہے :

اِنْ تَرَکَ خَیْرَا (البقرہ : ۱۸۰)

[اور جب کوئی مال بھی چھوڑ رہا ہو]۔

یہاں لفظ خیر مال و دولت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، کیونکہ مال و دولت کی فراوانیوں سے ہی کوئی قوم اپنی ملّی و انفرادی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ؕ (البقرہ : ۲۶۹)

[اور جسے حکمت عطا ہوگئی اسے یقیناً خیر کثیر عطا ہوگئی]۔

حکمت کا لفظ اپنے آغوش میں ہر طرح کی دانائی، علم و اکتشاف اور دانش وری کو لیے ہوئے ہے، اور اس کے دائرے علومِ عقلیہ، بصیرت اور صحیح مقدمات سے صحیح تر نتائج کو اخذ کرنے کے ہر منہاج تک وسعت پذیر ہیں۔ اسی بنا پر جسے حکمت عطا ہوئی اسے گویا خیر کثیر یا وہ سب کچھ مل گیا جو انسانیت کے ارتقا کے لیے ضروری ہے۔

اسلام دنیا کا وہ پہلا اور آخری مذہب ہے جس نے دانش و عقل کو خیر کثیر کہا ہے اور اسی خیر کثیر پر اپنے تمام دعاوی کو استوار کیا ہے۔ اس آیت کے سیاق و سباق

میں شیطان کا ذکر ہے کہ وہ کیونکر عقل و دانش کے افلاس اور تہی دامانی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے، اور اللہ کی دعوت کس طرح انسانوں کو بخشش و فضل کی جانب توجہ دلاتی ہے۔ اس بنا پر رأس الحکمۃ یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل اور اقدام میں شیطان کی گھاتوں سے آگاہ رہے، اور اللہ کی بخشش و فضل کا جویاں رہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط (آل عمران : ۲۶)

[تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے]۔

مشرکینِ مکہ اور یہود و نصاریٰ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ملک و اقتدار اور نبوت و رسالت کی نعمتوں کو انہی میں منحصر رہنا چاہیے۔ ان کے نزدیک یہ بات بڑے اچنبھے کی تھی کہ ایک اُمیّ اور یتیم کو نبوت و رسالت اور اقتدار و حکومت سے نوازا گیا ہے اور ہمیں درخورِ اعتنا نہیں قرار دیا گیا، حالانکہ ہم نے تاریخ میں بڑے نامور لوگ پیدا کیے ہیں۔ اس آیت میں اس شبہے کا جواب دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ عشرت و تکریم کی تمام صورتیں براہِ راست اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہیں، اس میں تمھارے ارادوں، تمناؤں اور خواہشوں کو کوئی دخل نہیں۔ اس کی مشیتِ تکوینی جو سراسر حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، جسے چاہتی ہے ان نعمتوں سے بہرہ ور کرتی ہے اور جس سے چاہتی ہے ان انعامات کو چھین لیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ حکمت و رسالت کی امانت کس کے سپرد کرنا زیادہ بہتر اور انسب ہے، اور کس سے اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے اقتدار و سطوت چھین لینا زیادہ قرینِ مصلحت ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَإِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ ۝ (ص : ۴۷)

[اور بے شک یہ لوگ ہمارے ہاں منتخب اور سب سے اچھے لوگوں میں سے ہیں]۔

"اخیار" خیر کی جمع ہے، اس سے پہلے حضرت ایوب، حضرت ابراہیم اور

حضرت اسحٰق و یعقوب کا تذکرہ ہے۔ ارشاد باری ہے کہ یہ وہ ہمارے پسندیدہ، منتخب اور معنون لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے دور میں حق کی دعوت دی اور زندگی کی تشکیل اور سیرت و کردار کی تعمیر میں آخرت کے تصوّر کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انبیا کا مقام تمام انسانوں سے بالا و برتر ہے، اور کوئی بھی شخص چاہے ریاضت و مجاہدہ سے ولایت و تقربِ الٰہی کے اونچے سے اونچے زینے پر پہنچ جائے جب بھی انبیا کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ولایت و تقرب کے درجات کا تعین ہی اس بات سے ہوتا ہے کہ کس نے کس درجہ محبت و اطاعتِ نبوی کا ثبوت فراہم کیا۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ (الاحزاب: ۳۶)

[اور کسی مومن اور مومنہ کے لیے یہ درست نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا حکم دے دیں تو پھر ان کو اس امر میں اختیار باقی رہ جائے]۔

آیت کا مفہوم واضح ہے کہ جب خدا اور رسول کے ارشادات کسی بھی معاملے میں وضاحت کے ساتھ ثابت ہو جائیں تو پھر کسی شخص کو یہ اختیار حاصل نہیں رہتا کہ ان کی تعمیل میں کسی حیص بیص سے کام لے اور اپنے ذاتی مفادات و رجحانات کو ان کے مقابلے میں ترجیح دے، اس لیے کہ خدا اور اس کے رسول کی پیروی غیر مشروط طور پر ہر مسلمان پر فرض ہے۔

یہاں یہ نکتہ خاص طور پر شائستۂ التفات ہے کہ قضا و امر میں خدا اور رسول کے ارشادات میں تفریق کرنا قرآن کی نصِ صریح کے خلاف ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ

(البقرۃ: ۱۰۶)

[ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو کوئی اس سے بہتر ہی یا مثل اس کے لے آتے ہیں]۔

خیر کا مفہوم سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکوین و ارتقا کی کتابِ آئین میں بھی تبدیلیاں کی ہیں اور کتبِ سابقہ میں تبدیلی و تغیر کا عمل جاری و ساری رہا ہے۔ لیکن نہ تو اس سے فطرت کا رُخ خیر سے ہٹ کر شر کی طرف مڑا ہے اور نہ کتبِ سابقہ کی بعض آیات کی تنسیخ سے خیر کا مفہوم چشمِ آئین ساز سے اوجھل رہا ہے۔ جس طرح آئین فطرت، تغیرات، تقلبات اور فجائی عوامل کی وجہ سے اپنی سابقہ روش سے ہٹا ہے، اور ایک نئے راستہ پر گام فرسا رہا ہے، اسی طرح شرائع سابقہ میں بھی تقدم و ارتقا اور تکمیل و اتمام کے تقاضوں کے تحت ردّ و بدل ہوتا رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآنِ حکیم اس اتمام و تکمیل کی آخری شکل ہے، جس میں خیرِ مطلق نے ایک متعیّن، واضح اور ناقابلِ تغیر آخری راہ اختیار کی ہے۔ لیکن ارتقا کی ان تمام صورتوں میں جو کتابِ فطرت سے متعلق ہوں، چاہے احکام خداوندی سے ان کا رابطہ بہرحال خیر، نیکی، سچائی اور انسانی فلاح و بہبود ہی سے رہا ہے۔

بعض حضرات نے خود قرآن حکیم کی چند آیات کو جو منسوخ قرار دیا ہے تو اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ قرآن حکیم نے پہلے ایک واضح حکم نازل فرمایا، اور پھر اس کو منسوخ کر دیا، بلکہ اس کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ پہلے کچھ آیتیں عام تھیں، پھر ان کی تخصیص ہو گئی اور یہ تخصیص خیر ہی پر مبنی ہے۔

اس آیت سے اجتہاد کے ایک اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے جو یہ ہے کہ مجتہدین کو استحسان یا مصالحِ مرسلہ یا قیاس کی بنیاد پر اگر ایک مخصوص رائے کو اختیار کرنا پڑے تو علاوہ نحوی و ادبی اور روایتی تقاضوں کے انھیں اس چیز کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اجتہاد کے اس نتیجے میں فرد و جماعت کی بھلائی، خیر اور فلاح و کامرانی کی کوئی صورت بھی مضمر ہے یا نہیں۔ کیونکہ فقہا کا منصب دراصل صرف یہی نہیں کہ وہ دلالتِ لغوی و ادبی کا خیال رکھیں، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی اجتہادی صلاحیتوں سے تہذیب و تمدن

کے ایسے حسین سانچے مہیا کریں جو وقت کے تقاضوں کو پورا کریں، جن سے خیر اور خیر سگالی بنی نوع انسان کی کوئی صورت نکلے، جن سے انسان اور معاشرہ اور چمکے، اور آگے بڑھے اور بالآخر آفاقی شکل میں ابھر کر سامنے آئے۔

خ ی ط

خَاطَ : سیا۔

خاط الی مقصدہٖ : سیدھا اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔

خَاطَ الثَّوب : کپڑا سیا۔

خَيَّطَ الشيب فی لحيتهٖ : اس کی داڑھی کے بال پک گئے، سپیدی کے دھاگے اس کی سیاہ داڑھی میں نظر آنے لگے۔

اَلْخَيْطُ : دھاگہ

اَلْخَيْطُ مِن الجراد : ٹڈی دَل۔

الخیطُ الابیض : صبح کی سفیدی۔

اَلْخيطُ الاسود : رات کی سیاہی۔

اَلْخَيَّاط : درزی، کپڑے سینے والا۔

اَلْخِيَاطُ : سوئی۔

قرآن حکیم میں ہے :

حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ص (البقرۃ : ۱۸۷)

[جب تک کہ صبح کا سفید خط سیاہ خط سے نمایاں ہو جائے]۔

یہاں رمضان میں سحری کے اختتام کا ذکر ہے کہ جب تک پو نہ پھٹے اور سفیدۂ صبح واضح نہ ہو جائے کھانے پینے کی اجازت ہے۔ احادیث میں سحری میں تاخیر اور افطار میں تعجیل کی فضیلت آئی ہے۔ سفید تاگے کا سیاہ تاگے سے ممیز ہونا بطور استعارہ

کے ہے۔ مقصد سپیدۂ صبح کا ظہور ہے۔ عدی بن حاتم کہتے ہیں، مَیں نے سچ مچ دو تاگے لیے، ایک سیاہ اور ایک سفید، اور دیکھتا رہا کہ ان میں کب امتیاز رونما ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ نے سنا تو میری اس سادہ لوحی پر ہنسے۔ آپ نے فرمایا اس سے مراد نور کا تڑکا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ط (الاعراف: ۴۰)

[جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ سما جائے]۔

سیاق و سباق میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تکذیب کرتے اور اس پر اتراتے اور کبر و نخوت کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا جنت کی عیش کوشیوں میں کوئی حصہ نہیں۔ جس طرح اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہیں گزر سکتا، اسی طرح مکذبین اور منکرین کا جنت میں داخل ہونا ناممکن ہے۔ اس لیے کہ احکامِ الٰہی کی تکذیب کے معنی نہ صرف اپنی ذات کو جھٹلانے کے ہیں، جس کے خمیر میں نیکی اور ایمان کے تقاضے روزِ ازل سے سمو دیے گئے ہیں بلکہ ملّی و اجتماعی فوائد سے محرومی اختیار کرنے کے بھی ہیں۔

کبریائی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو زیب دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ ہرگز پسند نہیں کہ اس کا کوئی بندہ اپنی کھال میں نہ سمائے اور کبر و نخوت کا پیکر بن کر حقوق اللہ اور حقوق العباد کو غصب کرلے، اپنے کو دوسروں سے بڑا اور عظیم سمجھے۔ کیوں کہ عظمت اور بڑائی شانِ ایزدی ہی کے ساتھ مخصوص ہے، وہی سب سے بڑا اور اکبر ہے۔

خ ی ل

خَالَ : گمان کیا۔

اِخْتَالَ فِی مِشْیِہٖ : متکبرانہ چال چلنا۔

اَلْمَخِیْلَۃُ : کبر و نخوت۔

کہا جاتا ہے:

اِیَّاكَ وَالْمَخِیْلَةَ: تکبر سے احتراز کرو۔

مخیلة کے معنی سحاب کے بھی آتے ہیں۔

رَأَیْتُ فِی السَّمَاءِ مَخِیْلَةً: میں نے آسمان پر ابر کی ٹکڑیاں دیکھیں۔

خَایَلَ: مفاخرہ کا اظہار کرنا۔

خِلْتُهٗ کَرِیْمًا: میں نے اسے معزز سمجھا۔

تَخَیَّلَ الشَّیْءُ: شے نے رنگ بدلا۔

هٰؤُلَاءِ خَیَّالَةٌ: یہ لوگ گھوڑوں کے مالک ہیں۔

اَلْخَیْلُ: گھوڑا

خَیَّلَ عَلَیْنَا: اس نے ہم پر الزام دھرا، ہم پر تہمت لگائی۔

اَلْخَالُ: برسنے والا بادل، بجلی، فخر و غرور، نرم کپڑا، فیاض انسان، گھوڑے کی لگام، بدن کا تل، کفن۔

اَلْخِیَالُ: وہم و گمان۔

اَلْخُیَلَاءُ: تکبر و غرور۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی ۝ (طٰہٰ: ۶۶)

[پس یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں موسیٰ کے خیال میں ان کے جادو کے زور سے ایسی نظر آنے لگیں کہ گویا وہ دوڑ پھر رہی ہیں]۔

جب حضرت موسیٰ نے عصا پھینکا تو وہ سچ مچ کا سانپ بن گیا۔ اس کے جواب میں فرعون کے ساحروں نے بھی ایسا ٹرک اختیار کیا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں بھی سانپ کی طرح رینگتی ہوئی دکھائی دیں۔ یہاں سحر سے مراد نظر بندی نہیں محض ٹرک اور چال ہے، کیونکہ نظر بندی یا ہپناٹزم کا اثر انبیا پر نہیں ہو پاتا۔ ان کے نفوسِ قدسیہ اتنے طاقت ور، مضبوط اور استوار ہوتے ہیں اور ان کی نفسیات اس درجہ

محکم اور قوی ہوتی ہیں کہ نظربندی یا سحر کا کوئی ایسا اثر ان پر مترتب نہیں ہو سکتا جو اُن کے ذہن و فکر کو گھپلے میں ڈال دے یا ماؤف کر دے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ (بنی اسرائیل: ۶۴)

[اور ان پر اپنے پیادے اور سوار چڑھا لا]۔

شیطان سے تخاطب ہے کہ تو اپنی پکار سے اور اپنے لاؤ لشکر سے مسلح ہو کر بھی اگر چاہے تو میرے نیک بندوں پر تیرا داؤں چلنے والا نہیں۔

اِنَّ عِبَادِىْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ (بنی اسرائیل: ۶۵)

[بے شک جو میرے نیک بندے ہیں ان پر تیرا قابو نہیں چلے گا]۔

خ ی م

اَلْخَامُ: ہر وہ شے جس کو ابھی انسانی صنعت گری نے چھوا نہ ہو۔

اَلْخَيْمَةُ: ڈیرہ، خیمہ۔ وہ گھر جو اینٹ، پتھر یا مٹی سے نہ بنا ہو بلکہ کھال اور گھاس پھونس سے بنا ہو۔

اَلْخَامَةُ: ترو تازہ اور شاداب گھاس۔

خَيَّمَ بِمَكَانٍ: کہیں اقامت گزیں ہونا۔

هُوَ كَرِيْمُ الْخِيْمِ: وہ اچھی اور کریمانہ عادات کا حامل ہے، جمع خِيَمٌ بمعنی طبیعت۔

خَيَّمَتِ الْبَقَرُ: گائیں اپنے باڑے میں رہیں۔

تَخَيَّمَ: خیمہ نصب کیا۔

اَلْخَيَّامُ: خیمے میں رہنے والا۔

قرآن حکیم میں ہے:

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِى الْخِيَامِ ۚ (الرحمٰن: ۷۲)

[گورے رنگ والیاں خیموں میں محفوظ ہوں گی] ۔

جنت کی وہ گوری نسوانی مخلوق جو پاکیزہ اخلاق، پاکیزہ روش اور حیا پروری کا نمونہ ہوں گی، خیموں میں اقامت گزیں ہوں گی۔ خیمہ عربوں کے ہاں وہ بہترین اگامت گاہ ہے جہاں صبح و شام، جنگلی پھولوں اور بوٹیوں کی شمیم آرائیاں مشام جاں کو معطر کرتی رہتی ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو مغرب یہ چاہتا ہے کہ کوئی محفل، کوئی اجتماع اور تقریب ایسی نہیں ہونی چاہیے جہاں عورتیں جلوہ طراز نہ ہوں۔ لیکن دوسری طرف جب انھیں جنت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں روحانی مسرتوں اور شادمانیوں کے ساتھ ساتھ ایسی حسین کمپنی بھی انھیں میسر ہوگی جہاں پاکیزہ، معصوم اور حیادار نسوانی مخلوق ان کا دل بہلائے گی تو اس پر ناک بھوں چڑھاتے اور معترض ہوتے ہیں۔ یہ تضاد آخر کیوں۔ اگر دنیا میں جذبۂ جنسی قابلِ قدر اور عزیز تر جذبہ ہے تو آخرت میں اس کی تسکین کیوں بارِ خاطر ہونے لگی۔ دراصل یہ تضاد عیسائیت کا وہ اثر ہے جو عورتوں کو شر اور بدی قرار دیتا ہے۔ یاد رہے یہ جنت کا ایک پہلو ہے، دوسرا بلند تر پہلو یہ ہے کہ یہ رضائے الٰہی کا ایسا مقام ہے جہاں انسان کی روحانی اور جسمانی کوئی خواہش تشنۂ تکمیل نہیں رہے گی۔ جہاں انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کی روشنی میں اور آگے بڑھے گا اور چمکے گا اور فکر و ذہن کی تمام آسودگیوں سے بہرہ مند ہوگا۔ جہاں زندگی کے نئے آفاق اس کے سامنے آئیں گے اور ارتقا و تابش کے نئے مناظر سے اس کو واسطہ پڑے گا۔

داب

دَأْبٌ ۔ اپنے کام میں محنت ومشقت سے مصروف رہنا۔ عادت، طریقہ، اسلوب اور معاملہ، کسی کام میں تسلسل کے ساتھ لگے رہنا۔

دَأَبَ الرَّجُلُ فِی عَمَلِہٖ ۔ اپنے کام میں برابر کوشاں رہا۔

ھٰذَا دَأْبُکَ ۔ یہ تمھاری عادت ہے یا تمھارا دستور ہے۔

اَلدَّائِبَانِ ۔ رات دن ۔ جو ہمیشہ اپنے طریقے کے مطابق آتے جاتے رہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے :۔

كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ج ۔ (آل عمران: ۱۱)

[جیسا کہ معاملہ فرعون والوں کے ساتھ ہوا اور اُن سے قبل والوں کے ساتھ اُنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا]

غرض یہ ہے کہ کفارِ مکہ نے بھی آلِ فرعون کی طرح ہماری نشانیوں کو جھٹلایا، احکامِ الٰہی کی مخالفت کی اور ان اقدارِ حیات کو ماننے سے ابا کیا جو ان کی کامرانیوں کی ضامن تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے تمام سہارے ان کو اللہ کی گرفت سے نہ بچا سکے۔ اسی طرح کفارِ مکہ کا مآل ہوگا۔ اُن کی اولاد، ان کا مال و دولت اور اُن کی وجاہت دنیوی ان کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکے گی۔

خدائے تعالیٰ کا قانونِ مکافات تمام قوموں کے لیے یکساں ہے۔ جو قوم بھی احکامِ الٰہی

سے رُوگردانی کرے گی اور حق و صداقت کے تقاضوں کی تکذیب کرے گی، اس کو ہلاکت و بربادی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ زود یا بدیر بہر حال ان کو غضب الٰہی کا ہدف بننا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ۔ (ابراہیم: ۳۳)

[اور تمھارے نفع کے لیے سُورج اور چاند کو مسخر کر دیا، جو ہمیشہ اپنے اپنے مدار میں گھومتے رہتے ہیں]

یعنی یہ آفتاب اور یہ قمر دیوتا یا دیویاں نہیں کہ تم ان کی پرستش کرو۔ اُن کو تو اللہ تعالیٰ نے تمھاری نفع رسانی کے لیے مسخر کر دیا ہے، یہ تمھارے خادم ہیں مخدوم نہیں۔ قرآن کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ آج سے چودہ سو سال پہلے اس نے آفتاب و قمر کی تسخیر کا مژدہ نوعِ انسانی کو سُنایا۔ ہم آج ہزاروں تجربات کے بعد چاند تک رسائی حاصل کر سکے ہیں اور قرآنِ حکیم نے اس سے بہت پہلے تسخیر کائنات کے امکانات پر روشنی ڈالی۔ یہ صرف تحیر و استعجاب کی بات نہیں، اس میں انسان کی فتوحات سماوی کی پیشگوئی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ انسان کی تگ و تاز کے حدود کس درجہ وسیع اور پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر یہ انسان کی کس درجہ محرومی ہے کہ وہ اس مقام پر فائز ہونے کے باوجود نجوم و کواکب کی پرستش کرے اور اپنے ربّ کا شکر گزار نہ ہو جس نے تمام نظام علوی کو اس کے فائدے کے لیے مسخّر کر دیا۔

چاند اور سورج کو 'دائبین' قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ایک طرف انسانی عقلیت کا یہ عالم ہے کہ وہ ربّ جلیل کے احکام کی تکذیب کر رہا ہے اور دوسری طرف آفتاب اور چاند کو دیکھو کہ اوّل روز سے اللہ تعالےٰ نے جو کام ان کے سپرد کیا وہ اس کی سرانجام دہی میں صبح و شام برابر کوشاں اور جد و جہد میں مصروف ہیں۔

د ب ب

دَبَّ۔ رینگنا، چلنا، سرایت کرنا، کہا جاتا ہے۔

دَبَّ الشَّرَابُ فِی عُرُوقِہٖ ۔ شراب اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی۔

ھُوَ اَکْذَبُ مَنْ دَبَّ وَ دَرَجَ ۔ وہ ان سب سے جھوٹا ہے جو زمین پر چلتے ہیں یا قبر کی آغوش میں آسودہ ہیں۔

دَبَّ السُّقْمُ فِی الْجِسْمِ ۔ بیماری اس کے جسم میں سرایت کر گئی۔

دَبَّ اَلْجَدْوَلُ ۔ نہر میں پانی بہہ نکلا۔

دَبَّتْ عَقَارِبُہٗ ۔ اس نے بیر ڈالنے کے لیے چغل خوری کی۔

اَلدُّبُّ ۔ ریچھ

الدب الاصغر والدب الاکبر ۔ بنات النعش، کہکشاں

اَلدَّبَّابَۃُ ۔ ٹینک کی قسم کا لکڑی کا ایک آلہ جس کو محاصرے کے لیے عرب استعمال کرتے تھے۔

اَلدَّابَّۃُ ۔ زمین پر چلنے اور رینگنے والی ہر ذی حیات چیز۔ اس میں حشرات الارض اور حیوانات و انسان سب شامل ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ۰ (انفال: ۲۲)

[بدترین ذی حیات اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے ذرا کام نہیں لیتے]

کفار اور مشرکین کے بارے میں ہے کہ یہ لوگ اللہ کا کلام سنتے ہیں اور اس کی نشانیاں دیکھتے ہیں لیکن ایسے گونگے اور بہرے ہیں کہ ذرا سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتے، گویا انھوں نے نہ کچھ سنا ہے اور نہ یہ توفیق ہی ان کو حاصل ہے کہ حق کا اعلان کریں۔ قرآن حکیم نے عقل و خرد کے تقاضوں کو بہت اہمیت دی ہے۔ اس کے نزدیک دنیا میں، سوسائٹی میں اور خود فرد کی زندگی میں شر اس وقت راہ پاتا ہے جب انسان قلب و ذہن رکھتے ہوئے حق و صداقت کی تلاش میں کوشاں نہ ہو اور اپنے سامنے سچائی کو ابھرتا اور نشو و نما پاتے ہوئے دیکھے اور پھر بھی اس کی جانب مائل نہ ہو۔ انسان

کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ یہ حق و صداقت کو پانے اور دیکھنے کے لیے بصیرت و ادراک کے دریچوں کو ہمیشہ وا رکھے۔

قرآن حکیم میں ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ (النور: ۴۵)

[اور اللہ ہی نے ہر چلنے والے جانور کو پانی سے پیدا کیا ہے]

زندگی کا خمیر پانی سے اُبھرا ہے۔ یہ وہ مسلمہ حیاتیاتی صداقت ہے جس سے زندگی کے اصل سائنسی سرچشمے کا پتا چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے جن سیاروں میں پانی نہیں پایا جاتا وہاں زندگی کی طرفہ طرازیاں بھی پائی نہیں جاتیں۔ نہ وہاں روئیدگی کا کوئی نشان ہے، نہ حشرات الارض کا پتا اور نہ حیوانات کی قسم کی کسی شے کا وجود۔ کوپرنیکس نے کائنات کی وسعتوں کے مقابلے میں زمین اور اس میں رائج انسانی اقدار کو یہ کہہ کر حقیر قرار دیا ہے کہ اس کی حیثیت ایک نقطے سے زیادہ نہیں لیکن زمین کے لیے یہ کیا فخر کم ہے کہ اس نے زندگی کو جنم دیا ہے اور عقل و فکر کی دواعی کی پرورش کی ہے۔ حجم اور سائز کا موازنہ بھلا عقل و زندگی کی بوقلمونیوں سے کیونکر ممکن ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ھود: ۶)

[اور کوئی جاندار زمین پر ایسا نہیں کہ اللہ کے ذمہ اس کا رزق نہ ہو]

مقصد یہ ہے کہ ایک رینگنے والے کیڑے سے لے کر حیوانات اور انسان تک کے لیے اللہ تعالیٰ کے کرشمۂ ربوبیت نے رزق کا سامان بہم پہنچا رکھا ہے۔ اس لیے جہاں حصولِ رزق کے لیے اُن اسباب، عوامل اور اداروں سے تعرض کرنا ضروری ہے جو رزق بہم پہنچانے کے ضامن ہیں وہاں تشکر و امتنان کا ربط اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ رہنا چاہیے کہ اس کی ذاتِ گرامی نے یہ انتظام فرمایا ہے کہ ہر ذی رُوح کو اس کے رزق کا حصہ ملے۔

یہ تو ایک امر واقعہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ذی حیات کے لیے رزق مقرر کر رکھا ہے۔ اس کی رُوح یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی حکومت عادلانہ حکومت کہلانے کی

حق دار نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ تمام رعایا کے لیے رزق کی بہم رسانی کا اہتمام نہ کرے ۔ اگر کسی حکمرانی میں انسان بھوکے رہتے ہیں اور بھر پیٹ اُن کو صحت مند غذا نہیں ملتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ حکمرانی اللہ کے منشا کے خلاف ہے ۔

قرآن حکیم میں ہے ۔

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ (النمل: ۸۲)

[اور جب وعدہ اُن لوگوں پر پورا ہونے کو ہوگا تو ہم زمین میں سے ایسا جانور نکالیں گے جو اُن سے باتیں کرے گا]

سیاق آیت علائم قیامت سے متعلق ہے ۔ بعض احادیث و روایات میں آتا ہے کہ آخر آخر میں اتمام حجت کے طور پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے ایک خارقہ اس طرح کا ظہور پذیر ہوگا کہ زمین سے ایک جانور نکلے گا جو آیاتِ الٰہی کی تصدیق کرے گا اور بول بول کر کہے گا کہ قیامت برحق ہے اور احتساب و محاسبہ کا وقت آن پہنچا ہے ۔

روایات میں اس دابہ کا حلیہ اور دیگر تفاصیل بھی مروی ہیں ۔ لیکن جیسا کہ امام رازی نے کہا ہے ، قرآن حکیم میں ان تفاصیل کا کوئی ذکر نہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ہم خوارق و عجائب کے ظہور پذیر ہونے کو دائرۂ امکان سے خارج نہیں ٹھہرا سکتے ۔

اس آیت کی تفسیر کا یہ ایک روایتی پہلو ہے ۔ دوسرا پہلو اس سے زیادہ حیران کُن ، سائنسی اور قرآن حکیم کے اعجاز پر زبردست دلیل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ دابہ کا اطلاق قرآن ہی میں انسان پر بھی ہوا ہے ۔ اس لیے اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ایک دور ایسا بھی آئے گا جب انسان کشش ثقل کے اس محیط اور دائرے سے باہر نکل کر جو زمین سے متعلق ہے سپیس یا افلاک تک رسائی حاصل کر لے گا ۔ اس صورت میں " اخراج من الارض " کے معنی یہ ہوئے کہ انسان دائرہ ارضی سے باہر فضاؤں میں افلاک و نجوم کی سطح پر قدم جما لینے میں کامیاب ہو جائے گا اور اس خارقہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب اس لیے منسوب کیا ہے کہ اسی کی تکوینی جلوہ طرازیوں نے جہاں کشش ثقل کی وجہ سے لاکھوں برس سے انسان کو پا بہ گل بنا رکھا تھا ، اب اسی کی تکوینی مصلحتوں کے

تحت انسان کشش ثقل کے حدود کو پھلانگ کر ستاروں تک پرواز کر سکے گا۔
تعبیر کی اس صورت میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اس تعبیر کو مان لینے سے قرآنی سیاق کی تائید اس خارقہ واعجوبہ سے کیونکر ہو سکے گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک خوف ناک پیشگوئی مضمر ہے جو یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ انسان، زمین و آسمان سے رابطے کی اس اُمید افزا نوعیت سے تہذیب وثقافت میں کوئی اضافہ کرے اور آسمان کے خزائن کو زمین کی طرف منتقل کرے، ہوگا یہ کہ زمین کے اختلافات اور جھگڑوں سے آسمانوں کو بھی آلودہ کیا جائے یعنی جو لڑائی اس وقت بموں، میزائلوں اور زہریلی گیسوں سے زمین پر لڑی جا رہی ہے اس کا حلقہ آسمانوں تک پھیلا دیا جائے چنانچہ امریکہ اور روس کی حب استعمار نے یہ صورتِ حال پیدا کر دی ہے کہ اب سٹار وار کا کھلے بندوں آغاز ہونے کو ہے، اور اگر خدانخواستہ اس کا آغاز ہو گیا تو یہ خوب صورت دنیا، یہ حسین کائنات اور تہذیب و تمدن کے یہ دبستان جو انسان کی ہزاروں برس کی کوششوں سے معرضِ وجود میں آئے، یہ آن کی آن میں ملیا میٹ ہو جائیں گے۔ اور یہی قیامت کا مفہوم ہے جو شاید انسان ہی کی بداندیشی سے واقع ہوگی۔

د ب ر

دَبَّرَ - غور کیا۔ کسی فعل یا شئ کے انجام پر غور کرنا۔

دَبَرَ - ختم ہو جانا، انجام کو پہنچ جانا۔

دَبَرَ الرَّجلُ - مر گیا۔

دَبَرَ السهم - تیر نشانے سے اچٹ گیا۔

اَدْبَرَ - پیٹھ پھرنا۔

ادبرت الدنیا - اس کا اقبال ختم ہوا۔

الدُّبُرُ - پچھلا حصّہ۔

الدَّبُور - پچھوائی ہوا۔

الدّبری - وہ رائے جو بعد میں سُوجھے -

رجل مُقَابَلٌ و مُدَابَرٌ - نجیب الطرفین - شریف النسل -

جَعَلَہٗ دُبُرَ اُذُنِہٖ - اس نے بات سنی ان سنی کر دی - بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا -

وَلّوا دُبُرَھم - بھاگ کھڑے ہوئے -

دَبَرَ فُلَانٌ - وہ بوڑھا ہو گیا -

وَ شَرّ الرَّائِ الدَّبَرِی - وہ رائے اچھی نہیں جو بعد میں سُوجھے -

لا یصلی اِلاَّ دَبَرِیًّا - وہ ہمیشہ آخر وقت میں نماز پڑھتا ہے -

قرآن حکیم میں ہے -

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ - (النسا : ۸۲)

(کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے -)

کفّار مکہ سے تخاطب ہے کہ تم قرآن کے اس معجزانہ پہلو پر غور کیوں نہیں کرتے ، کہ اس میں جو دعوت مذکور ہے ، اس میں کوئی تناقض یا اختلاف پایا نہیں جاتا - حتّٰی کہ اس کے انداز بیان میں بھی وہی محکمی و استواری ، وہی فصاحت و بلاغت اور ہمواری و یکسانی جھلکتی ہے جو کسی الہامی کتاب کی شایانِ شان ہے - اس میں کہیں جھول نہیں کہیں رکاکت نہیں ، کہیں لفظ و معنی میں عدم تطابق نہیں - اس کی ہر آیت اور ہر لفظ ایسا حق اور خلال لیے ہوئے ہے کہ اس کے الہامی ہونے پر دلالت کناں ہے - یہی نہیں ، اس کی آیات میں وہ تناسب ، تناسق اور کھنک اور موسیقی جلوہ فرما ہے جو صرف اسی کا حصّہ ہے - اس کا ہر لفظ پکار پکار کر کہہ رہا ہے ، میں کسی انسانی فکر و کاوش کا نتیجہ نہیں ، بلکہ میرا تعلق براہِ راست خدائے سمٰوات سے ہے -

قرآن حکیم میں ہے -

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ - (ص : ۲۹)

(یہ بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل کیا تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں)

قرآن حکیم فوائد اور برکات کا خزینہ ہے۔ اس کے الفاظ و حروف میں برکات ہیں، اس کی تلاوت میں برکات ہیں، اس کے رسم الخط کی خوبصورتی، تصویر آرائی اور حسن اور نکھار کے متعدد پہلو ہیں، جن سے نہ صرف فنِ خطاطی کو فروغ ملا بلکہ مسلمانوں کے ذوقِ حسن آرائی اور جمالیات کی تسکین کا سامان بھی فراہم ہوا۔ علاوہ ازیں اس کا ادب و احترام جس حد تک کیا جاتا ہے کوئی دوسری الہامی کتاب اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی لیکن برکات کے یہ پہلو مقصودِ اصلی نہیں۔ اس کے نزول کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ مسلمان اس میں غور و فکر کریں، اس کے پیغام کو سمجھیں اور قلب و روح کو جلا بخشنے اور فرد و اجتماع کو سنوارنے کے جو تصورات اس میں مذکور ہیں، اُن کو عمل میں لائیں اور ان کی روشنی میں اپنے لیے ایسا نظامِ حیات وضع کریں جو انصاف، عدل اور حق اور عقل پر مبنی و استوار ہو، جو نہ صرف مسلمانوں کو کاروانِ انقلاب کی صورت میں پیش کرے بلکہ پوری دُنیائے انسانیت کے لیے بھی قابلِ پذیرائی ہو۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا۔ (نازعات: ۵)

[پھر ہر امر کی تدبیر کرنے والوں کی]

سیاق و سباق قیامت یا دوسری زندگی کا اثبات ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کائنات میں تدبیر کوئی کے جو ملکوتی مظاہر ہیں وہ اسی وقت تک کے لیے ہیں جب تک انسانی زندگی کو باقی رکھنا مقصود ہے۔

فلسفے کا ایک اہم سوال یہ ہے کہ اگر گردشِ افلاک کے لاکھوں اور اربوں برس کے پھیلاؤ کا مقصد صرف یہی تھا کہ آخر آخر میں عقل و بینش رکھنے والا انسان ہویدا ہو جو خلافتِ ارضی کو سنبھالے، تو پھر اس کو ہمیشہ زندہ رہنا چاہیے تھا۔ یہ کیا مذاق ہے کہ ادھر یہ پیدا ہوا اور چند برس کے بعد فنا کے آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آسودہ ہو گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عالم ضرور فانی ہے، لیکن انسان فانی نہیں۔ اس کو نہ صرف پھر زندہ ہونا ہے بلکہ زندگی کے نئے آفاق سے روشناس بھی ہونا ہے۔ یہ اللہ کی تدبیر ہے،

جس کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ملکوتی مظاہر کو مقرر کر رکھا ہے جو اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَالَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۙ (المدثر: ۳۳)

[اور رات کی جب وہ جانے لگے]

یہاں واو قسمیہ ہے اور قسم کے معنی شاہد اور دلیل کے ہیں۔ یہاں تین چیزوں کا ذکر ہے، قمر کی تابانیوں کا، رات کے جانے کا اور صبح صادق کے طلوع کا، دعویٰ یہ ہے کہ یہ تینوں مظاہر قیامت اور حیات بعد الممات کے لیے بمنزلہ شواہد کے ہیں۔ چاند کو ثبات نہیں۔ رات بھی آنی جانی شئے ہے اور رات کی تاریکی و ظلمت کے بعد صبح صادق کا طلوع بھی حقیقت ہے جس کا ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان پر غور کیجیے تو یہ پوری کائنات ردّوبدل اور فنا و زوال پر دلالت کناں نظر آئے گی۔ ٹھیک اسی طرح موت کے بعد حیات جاودانی بھی، ایک تغیّر ہے جو بالکل فطرت کے قاعدہ اور اسکیم کے مطابق ہے۔ موت قرآن کے نقطہ نظر سے، وہ صبح سعادت ہے اور وہ دوام درخشاں ہے۔ جسے بپا ہونا ہے اور اس میں تعجب و استحالہ کی کوئی بات نہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا۔ (الانعام: ۴۵)

[اسی طرح جڑ کاٹ دی گئی اُن لوگوں کی جو ظلم کرتے تھے]

'دابر القوم' سے مراد وہ لوگ ہیں، جن کو ان کے بعد آنا تھا۔ لیکن چونکہ ان لوگوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے اُن کی جڑ کاٹ دی گئی، اس لیے اُن کے اتباع، خود بخود ختم ہو گئے۔ یہ ان تمام قوموں کا حشر ہے جو اپنے دور میں، اپنے ذہنوں پر، اپنی دانش پر، اور معاشرے پر زیادتی کے مرتکب ہوتے رہے ہے۔ ظالموں کے لیے اس دنیا میں دوام نہیں۔ یہاں وہی قومیں زندہ رہنے کا حق رکھتی ہیں جو انصاف، عدل اور ہمدردیٔ بنی نوع انسان کے اصولوں پر کار فرما ہیں، جو قومیں اپنے پروردگار کو پہچانتی ہیں اور اُس کے

حکموں پر چلتی ہیں اور معاشرے کی بنیاد، خیر، نیکی اور سچائی پر استوار کرتی ہیں۔ ظالموں کو خود ان کا ظلم اور تعدی و استکبار ملیا میٹ کر دیتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ (الانفال: ۱۵)

[تو اُن سے پشت مت پھیرنا]

غرض یہ ہے کہ جب جہاد فرض ہو جائے اور تمہیں کفّار کے عساکر کا مقابلہ کرنا پڑے تو پشت پھیر کر بھاگ کھڑا ہونا جائز نہیں بلکہ پوری جرأت سے، ڈٹ کر ان کا سامنا کرنا لازم ہے۔ ہاں اگر جنگ کی مصلحت اس بات کی متقاضی ہو کہ کوئی فوجی دستہ اپنے محاذ کو چھوڑ کر کسی دوسرے محاذ پر جم جائے تو یہ دوسری بات ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ ۝ (ق: ۴۰)

[اور رات میں بھی اس کی تسبیح کیجیے اور نمازوں کے بعد بھی]۔

سجود سے مراد یہاں صلوٰۃ پنجگانہ ہیں

راغب نے اس کی تصریح کی ہے یعنی جہاں آپ طلوع فجر سے پہلے نماز پڑھتے ہیں اور غروب آفتاب سے پہلے ظہر و عصر کی نماز ادا کرتے ہیں، وہاں نہ صرف رات کا کچھ حصّہ آپ تسبیح کرنے کے لیے مخصوص کر لیں بلکہ ان نمازوں کے بعد بھی اللہ کی حمد و تسبیح کو جاری رکھیے۔ یہ جہاں نحوی طور پر امر و انشا کا صیغہ ہے وہاں آنحضرت ؐ کے بارہ میں یہ خبر بھی ہے کہ آپؐ کا اللہ تعالیٰ سے اس درجہ محبّت و تودد کا رشتہ استوار تھا کہ آپ اکثر اللہ تعالیٰ کی کبریائی و جلالت قدر کا تسبیحات کے ذریعے اظہار کرتے رہتے تھے۔

مغرب کے جو لوگ آنحضرت ؐ کو محض اس بنا پر، روحانی راہنما تسلیم نہیں کرتے کہ آپؐ کے حرم میں متعدد خواتین کو شرف زوجیت حاصل تھا۔ ان کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کے باوجود کیا۔ ان کی روحانی زندگی میں، رُوحانی معمولات میں اور اللہ تعالیٰ کی سچی اور دائمی محبّت میں کوئی فرق رُونما ہوا۔ اور کیا ان علائق نے ایک لمحہ بھر بھی ان کو

یادِ الٰہی کی لذّتوں سے غافل رکھا، یہ وہ حقیقت ہے جس سے آنحضرتؐ کی رُوحانی حالت کا صحیح صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

د ث ر

دِثار - بدن سے ملے ہوئے کپڑے کا، اُوپر کا گرم کپڑا۔ بدن سے ملے ہوئے کپڑے کو عربی میں شعار کہتے ہیں۔

دَثَر - مٹ گیا۔

دَثَرَ الرَّسْمُ - نشان مٹ گیا۔ دَثَرَ المَنْزِلُ - گھر کے در و دیوار ڈھ گئے۔

دَثَرَ السیف - وہ تلوار جسے ایک عرصے سے صیقل نہ کیا گیا ہو، تلوار زنگ آلود ہو گئی۔

تَدَثَّر - کپڑا اوڑھنا۔ تَدَثَّرَ الرَّجل - فرسہ - وہ کُود کر گھوڑے پر سوار ہوا۔

دَثْرٌ - مال وافر۔ لہ مالٌ دَثْرٌ - اس کے پاس وافر مال ہے۔

رجل دثور - وہ شخص جو غیر معروف ہو۔

فلان دِثارٌ - وہ کاہل اور سُست انسان ہے۔

رَجلٌ داثر - جو شخص زینت و آرائش کا خیال نہ رکھے۔

قرآن حکیم میں یہ لفظ ایک ہی بار استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری ہے:

یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۠ (المدثر: ٢)

[اے کپڑے میں لپٹے ہوئے اُٹھیے پھر کافروں کو ڈرائیے۔]

صحیح بخاری میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ یہ وہ پہلی سورت ہے جو آنحضرتؐ پر نازل ہوئی۔ جمہور محدثین کے نزدیک پہلی سورہ جو آپ پر نازل ہوئی وہ اقرأ ہے۔ ابوسلمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابرؓ سے پوچھا کہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ پہلی سورہ جو نازل ہوئی وہ اقراء ہے۔ آپ نے فرمایا، مَیں اسی حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں جو خود آنحضرتؐ نے بیان فرمائی۔ آنحضرتؐ نے بیان فرمایا کہ میں نے حرا سے نکل کر جب گھر کی راہ لی تو کیا دیکھتا ہوں کہ مجھے کوئی پُکار رہا ہے۔ مَیں نے اپنے دائیں بائیں اور

آگے پیچھے دیکھا مگر کوئی پکارنے والا نظر نہ آیا۔ پھر میں نے آسمان کی طرف نظر دوڑائی، تو عجیب و غریب سماں دیکھا، جس کو میں نے من و عن خدیجہ سے بیان کر دیا۔ میں اس عجیب و غریب اور پہلے پہلے روحانی تجربے سے اس درجہ مرعوب و متاثر ہوا کہ میں نے بے اختیار کہا مجھے چادر سے ڈھانپ دو۔ دَثِّرُوْنِی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اے چادر اوڑھ کر لیٹ جانے والے اُٹھ اور فرائض نبوت کو ادا کرنے کے لیے تیار ہو جا۔

یعنی جب آپؐ نے رداء نبوت کو اوڑھ ہی لیا اور خلعت رسالت سے آپ کو اللہ کی طرف سے نواز ہی دیا گیا، تو اب کسی نفسیاتی خوف یا وسوسے کی حاجت نہیں، آپؐ اُٹھیں اور لوگوں کو ان کے اعمال بد کے عواقب و نتائج سے بلا محابہ آگاہ اور متنبہ کریں اور بتائیں کہ ایمان باللہ کی قدر و قیمت کیا ہے اور بلا خوف و خطر اپنے رَبّ کی کبریائی کا اعلان کریں اور اُن کے دلوں میں اپنے ربّ جلیل کی عظمت و جلال کے دائمی اور گہرے نقوش مرتسم کریں کہ یہی منصبِ نبوت کے شایانِ شان ہے۔

د ح ر

دَحَرَ۔ دھتکارنا۔ دُور کرنا، رحمت حق سے محروم کرنا۔ اس میں توہین و تذلیل کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ نہج البلاغہ میں حضرت علیؓ کی یہ دُعا مروی ہے:

وَاستعینہ علی مداحر الشیطان — میں اللہ تعالیٰ سے ان اعمال کی استعانت چاہتا ہوں، جن سے شیطان دُور رہے۔

مَدْحُوْرًا۔ دھتکارہ ہوا۔ عند اللہ ذلیل و خوار۔

قرآن حکیم میں ہے:

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ (اعراف: ۱۸)

[خدا نے فرمایا یہاں سے تو نکل ذلیل و خوار ہو کر]

شیطان نے جب اللہ تعالیٰ سے کہا کہ میں تیرے بندوں کو گمراہ کر کے رہوں گا،

تو مجھے مہلت تو دے پھر دیکھ میں کس کس حیلے اور کس کس ترغیب اور ترہیب سے، انھیں راہ حق سے انحراف پر آمادہ کرتا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے اسے دھتکار کر جنّت سے نکال باہر کیا اور اس کی بات مان لی یعنی اس بات کی اجازت دے دی کہ تو اپنی طاقت آزمالے، دین حق کی جتنی مخالفت کرنا ہے کر دیکھ، میرے جن بندوں کو مجھ سے، میرے دین سے، میری تلقین کردہ اقدار جہات سے محبّت وعشق ہے وہ بہر حال تیرے قابو میں آنے والے نہیں۔

شیطان اور انسان کا قصّہ دراصل خیر و شر کے وجود تکوینی کا قصّہ ہے جب تک انسان اس کائنات میں موجود اور زندہ ہے یہاں قدم قدم پر اُسے محرکات شر ملیں گے۔ اسے ان کا سامنا کرنا ہوگا، اُن سے بچنا ہوگا، ان کا مقابلہ کرنا ہوگا اور محرکات شر کا پورا پورا تجزیہ کر کے انھیں فرد اور معاشرے کی سطح پر دُور کرنا ہوگا۔

خیر و شر کی یہ دوئی یا اثنینیت صرف اخلاقی و اصلاحی سطح پر محسوس ہوتی ہے، ورنہ کائنات کی بحیثیت مجموعی یہی سعی و کوشش ہے کہ اس امتیاز سے انسان ہر طرح کے جسمانی، ذہنی، روحانی یا انفرادی و اجتماعی شر کو پہچانے، اس کا مداوا کرے اور اس کا ازالہ کرے۔ یہی وہ فطرت کا عمل ہے جس سے انسان کی عقلی و تہذیبی سطح بلند اور اونچی ہوتی ہے۔ شر نہ ہو تو پھر خیر کو پہچاننے، اس کو پانے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کو پھیلانے کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں، گویا شر بھی اپنے اندر خیر کے بے شمار پہلو لیے ہوتے ہے۔

یہاں مملکت اور سیاست کے چھوٹے چھوٹے خداوندوں کے لیے بھی ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ احکم الحاکمین تو اپنے مخالف اور شدید دشمن کو بھی مخالفت کی کھلی چھٹی دے دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا۔ لیکن ان کی طبع نازک پر ہر طرح کی مخالفت یا اپوزیشن ناگوار گزرتی ہے، اگرچہ وہ مخالفت خیر خواہی پر ہی مبنی کیوں نہ ہو۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا (صافات: ۹)

[اور ہر طرف سے مار کر دھکے دے دیے جاتے ہیں]

یہ آیت کریمہ کا سیاق دو حقیقتوں کے انکشاف پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ ہمارے اوپر جو آسمان کی درخشانیاں پھیلی ہوئی ہیں اُن کو نجوم و کواکب کی خاص ترتیب سے آراستہ کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ جب کوئی شیطان یا شیطان صفت جن ملاء اعلیٰ کی باتوں کو سننے کے لیے آسمانوں کی طرف پرواز کناں ہوتا ہے تو اس پر شہابِ ثاقب کے ٹکڑوں کی اس قدر بارش ہوتی ہے کہ اس کے نتیجے میں یہ ذلیل وخوار ہو کر واپسی پر مجبور ہو جاتا ہے اور ملاء اعلیٰ کا قرب ہرگز حاصل نہیں کر سکتا۔

اسلام سے پہلے کہانت کا زور تھا اور کاہن عوام سے یہ کہتے تھے کہ ہم نے جو جن مسخر کر رکھے ہیں وہ قضا و قدر کے فیصلوں کو براہِ راست ملاء اعلیٰ کی زبان سے سُن کر ہم تک پہنچا دیتے ہیں اور ہم ان کی مدد اور وساطت سے اس قابل ہو جاتے ہیں کہ لوگوں کو سماوی اسرار و غیوب کی قبل از وقت اطلاع دے سکیں۔ قرآن حکیم کی اس آیت میں اس وہم وظن کی تردید مذکور ہے۔ یہ فلک اور نجوم و کواکب کا یہ نظام اس درجہ استوار و محکم ہے کہ چوروں اور غنڈوں کو قطعی اس کا موقع نہیں ملتا کہ وہ آسمان پر جا کر اُس کے اسرار و رموز کو جان سکیں اور ملاء اعلیٰ کے پیغام، دعوت یا فیصلوں کو سُن اور سمجھ سکیں۔

جہاں تک پہلی حقیقت کا تعلق ہے اس کا منشا یہ ہے کہ نجوم و کواکب کے اس نظام میں جو حُسن، جو درخشانی جو تزئین اور حیران کن تناسق و نظم پایا جاتا ہے، اُسے دیکھ کر عقل ششدر و حیران رہ جاتی ہے، حتیٰ کہ افلاطون ایسا شخص یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس سے بڑھ کر خدائے کلیم و برتر کے اثبات کی اور کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ کانٹ نے بھی ایک جگہ فلکِ نیلگوں کے اس حُسن و زیبائی کو اپنے ایک بلیغ فقرے میں بے حد سراہا ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ ایک عامی سے لے کر ایک فلسفی تک آسمان کے حسن و زیبائی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دوسری حقیقت کا تعلق سائنس کے اس پہلو سے ہے کہ سپیس (فضا) میں

جن لوگوں نے چاند کی سطح پر قدم رکھا اُنھوں نے دیکھا کہ اس درمیان بلندی کی ایک سطح ایسی بھی ہے کہ جہاں کثرت سے شہاب ثاقب کے ٹکڑے گرتے رہتے ہیں اور اس سطح سے اُوپر اُٹھ کر نجوم وکواکب تک رسائی حاصل کرنا کسی شخص یا جِنّ کا کام نہیں، اس کے لیے سائنسی علم میں مہارت و رسوخ درکار ہے، یہاں کہانت یا محض اٹکل سے کام نہیں چلتا۔

جو لوگ قرآن کی ڈکشن یا اسلوب بیان کو سمجھتے ہیں ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآن بعض لطیف اور اُونچے معارف کو سمجھانے کے لیے بسا اوقات اس دور کے مالوفات اور ذہنی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے بطور کنایہ کے ایسا پیرایۂ بیان بھی اختیار کرتا ہے جس کو جہاں اس دور کا انسان سمجھ سکے، وہاں راسخ فی العلم لوگ بھی اس سے اُونچے، لطیف اور بلند تر حقائق کا استنباط کر سکیں جو اس پیرایۂ بیان میں مضمر ہیں ہمارے نزدیک اس میں جس لطیف حقیقت کو سمجھانا مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ علوی علوم و معارف ملکوتی حقائق اور فرشتوں کے ذریعے سے انسان تک پہنچنے والے تنزیل وحی کے انوار صرف انہی قلوب پر ارتسام پذیر ہوتے ہیں جو پاکیزہ اور ملکوتی صفت ہوں، شیاطین اور خواہشات میں گھرے ہوئے لوگوں پر نہیں۔ ان پر ادنیٰ خواہشات کے شہاب اس طرح گرتے رہتے ہیں کہ جن سے ان کے قلوب مسخ ہو جاتے ہیں۔ ملائکہ تک رسائی تو دُور کی بات ہے، یہ لوگ اپنے ضمیر و وجدان کی آواز بھی نہیں سن پاتے۔

د ح ض

دَحَضَ ۔ پھسلنا، لغزش میں مبتلا ہونا۔

اَدْحَضَ ۔ باطل قرار دینا، لغزش میں مبتلا کرنا۔

اِنْدَحَضَ ۔ باطل قرار پایا۔

الدَّحَضُ ۔ مقام لغزش، پھسلن کی جگہ۔ اس کو حاء جزم کی شکل میں پڑھ سکتے ہیں۔

دَاحِضَۃٌ ۔ باطل، جھوٹ، زائل ہو جانے والی بات۔

دَحَضَتْ رِجْلُهٗ - اس کا پاؤں پھسل گیا۔

ھٰذِہٖ مَدْحَضَۃُ الْقَدَمِ - یہ وہ جگہ ہے جہاں پاؤں پھسلتے ہیں۔

دَحَضَتِ الشَّمْسُ - آفتاب زوال پذیر ہوا۔

دَحَضَتْ حُجَّتُہٗ - اس کی پیش کردہ دلیل کا ابطال ہو گیا۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِہِ الْحَقَّ۔ (المؤمن: ۵)

[اور ناحق کے جھگڑے نکالے تاکہ حق کو باطل ٹھہرائیں۔]

یعنی حضرت نوح اور اُن کے بعد آنے والے انبیا نے جب بھی اپنی قوم کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین کی، جب بھی انھیں ایمان صحیح اور عمل صالح کی طرف بُلایا اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ تو بجائے اس کے کہ یہ لوگ ان کی دعوت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے الٹا کج حجتی سے کام لے کر ایسے ایسے جھگڑے نکالے کہ جن کا عقل سے، منطق سے، اصلاح احوال اور اصلاح قلوب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تاکہ ان براہین اور دلائل کو باطل ثابت کریں جن کو انبیا علیہم السلام نے پیش کیا۔ بحث و تمحیص بُری بات نہیں، لیکن کج بحثی سے کوئی شخص نہ تو حق اور سچائی کو پا سکتا ہے اور نہ سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ سچائی میں بجائے خود بڑھنے، دلوں میں بار پانے اور فروغ پانے کی طاقت پائی جاتی ہے۔ عربی میں حق کے معنی یہی ہیں کہ یہ ایسی حقیقت ہے جو اپنے کو منوا کے چھوڑے گی۔ جو آپ اپنا ثبوت مہیا کرے گی اور مستقبل میں متحقق ہو کر رہے گی۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَالَّذِیْنَ یُحَآجُّوْنَ فِی اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَہٗ حُجَّتُھُمْ دَاحِضَۃٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ۔ (شوریٰ: ۱۶)

[اور جو لوگ اللہ کے باب میں جھگڑے نکالتے ہیں بعد اس کے کہ اس کو مان لیا گیا، ان کی حجت ان کے پروردگار کے ہاں باطل ہے]

مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے اللہ کی توحید اور

اس کے دین کی حقانیت کو بہ دل تسلیم کر لیا تو ان کو بھی چاہیے تھا کہ اسلام کی اس قبولیت و پذیرائی کے اسباب پر غور کرتے اور خود بھی اس زمرے میں شامل ہو جاتے ، جس نے اس سچائی کو شرح صدر سے مان لیا۔ لیکن اُن کے ذاتی مفادات و تعصبات نے انھیں اس سعادت کے حصول سے باز رکھا۔ ان حالات میں ان کی کج حجتی قطعی باطل اور زائل ہونے والی ہے۔ اس کو ثبات اور دوام نہیں۔

دح و

الدَّحو ۔ پھیلانا ، بچھانا ، وسعت دینا ، زمین کو اس کے مرکز سے جدا کرنا ، حرکت میں لانا ، پیٹ کا بڑھ جانا اور لٹک جانا۔

دِحْیَۃ ۔ ایک شخص کا نام ۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ؕ (نازعات : ۳۰)

(اور اس کے بعد زمین کو بچھایا)

یعنی جب افلاک اور نجوم و کواکب کا مقر اور مقام متعین کر دیا گیا تو اس کے بعد زمین اس مقر اور مقام سے جُدا ہوئی اور اس نے ایک مستقل مرکز حیات کی شکل اختیار کی ۔ اس کو اللہ تعالےٰ نے ہمارے پاؤں تلے بچھایا اور اس قابل ٹھہرایا کہ اس میں سے پانی کے چشمے پھوٹیں اور روئیدگی پیدا ہو ۔ حیات انگڑائی لے اور انسان اپنی فکری و ذہنی نشاط آفرینیوں سے کام لے کر تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالے ۔

غور فرمایئے اس طبعی انکشاف کو قرآن حکیم نے آج سے تیرہ سو سال پہلے بیان کیا کہ زمین ، فلک یا کسی کوکب و سیارہ کا ٹکڑا ہے جو فضا میں گرا ، منجمد ہوا اور پھر اس نے بجائے خود ایک ٹھوس مرکز کی شکل اختیار کر لی ۔ کیا ہمارے سائنس دانوں نے زمین کی تخلیق و آفرینش کے بارے میں ٹھیک یہی کچھ نہیں کہا ۔

اگر قرآن وحی و تنزیل کا کرشمہ نہیں ہے تو یہ کیوں ہے کہ ایک امّی ایسے علمی

طبیعیاتی اور سائنسی انکشاف کا اظہار کرے جو بہت سی تحقیقی کاوشوں کے بعد آج انسان نے معلوم کیا ہے۔

قرآن حکیم کے یہی وہ معجزات و خوارق علم و معرفت ہیں جو دنیا کی تمام الہامی کتابوں سے اس کو امتیاز بخشتے ہیں۔

د خ ر

دَخَرَ۔ ذلیل و حقیر ہونا (راغب) کہا جاتا ہے۔

اَلْاَوَّلُ نَاخِرٌ وَالْاٰخِرُ دَاخِرٌ۔ پہلا قابل فخر ہے اور دوسرے نمبر پر رہنے والا ذلیل ہے۔ خضوع و خشوع کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ۝ (المؤمن: ۶۰)

[جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں جہنّم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے]

اس سے قبل کی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ صرف مجھ سے دُعا کے طالب ہوتے ہیں میں اُن کی دُعا کو شرف پذیرائی عطا کرتا ہوں لیکن جو لوگ از راہ کبر و نخوت اللہ کے سامنے نہیں جھکتے، اس کے احکام و اوامر ماننے سے ابا کرتے ہیں اور اس کی عبادت کو اپنی تذلیل قرار دیتے ہیں، اُن کا مقدر جہنّم ہے، جس میں یہ نہایت ذلّت و احتقار سے داخل ہوں گے۔

مشرکین میں ایک عجیب تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ بے جان بتوں کو پوجتے ہیں، نجوم و کواکب کی تعظیم بجا لاتے ہیں اور اپنے ان خود ساختہ خداؤں کو مانتے ہیں، جو اختیار، قدرت اور علم و حکمت سے قطعی ناآشنا ہیں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ جو پوری کائنات کی تخلیق و آفرینش کا ضامن ہے اور ان کے دل کی دھڑکنوں تک سے آگاہ ہے، ان کو ہر چند یقین دلاتا ہے کہ میں تمہاری دُعائیں سنتا ہوں،

قبول کرتا ہوں اور تمھاری شہ رگ سے بھی زیادہ تمھارے قریب ہوں لیکن اس کے باوجود ان کی گردنیں اس کے سامنے نہیں جھکتیں اور یہ اس کی بات ماننے پر آمادہ نہیں ہوتے ۔ انسان بھی عجیب مخلوق ہے، ماننے پر آئے تو پتھروں، دریاؤں اور بے اختیار چیزوں کو اپنا ربّ مان لے اور انکار کرنے پر آئے تو اپنے پروردگار کے بارے میں طرح طرح کے جھگڑے نکالنے لگے ۔

قرآن حکیم میں ہے :

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ وَھُمْ دٰخِرُوْنَ ۝ (نحل : ۴۸)

[کیا انھوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو نہیں دیکھا جن کے سائے داہنی طرف بائیں طرف جھکتے ہیں، اللہ کو سجدہ کناں ہیں اور اس کے آگے خاشع اور عاجز ہیں ۔]

یعنی یہ صرف گمراہ اور مشرک انسان ہے جو اپنے ربّ کو اور اس کے احکام و اوامر کو نہیں پہچانتا۔ اس کے سوا تمام مظاہر تکوینی ان بندھے ٹکے قوانین کے تابع ہیں جو اوّل روز سے اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت میں سمو دیے ہیں حتیٰ کہ حرکت اور اس کے لوازم، شئ اور اس کا سایہ سب اللہ کے ان اوامر تکوینی کو نہایت خشوع و خضوع سے نہ صرف مانتے ہیں بلکہ اُن کے تابع ہیں ۔ یہ مشرک اور گمراہ انسان کی بدنصیبی ہے کہ یہ اطاعت الٰہی کی نعمت سے محروم ہے اور اپنے اختیار کا غلط استعمال کرنے پر مصر ہے ۔

دخل

دَخَلَ ۔ داخل ہوا، اندر آیا، راغب نے اُسے ازمان، امکنہ اور عقائد و اعمال سب پر مشتمل قرار دیا ہے ۔

دَخَلَ عَلَیْہِ ۔ اس نے اس کی زیارت کی، اُس سے ملا ۔

دُخِلَ فِی عقلِہٖ ۔ اس کی عقل میں خلل ہے ۔

ھُوَ دَخِیْلُ فُلَانٍ ۔ وہ اس کے تمام امور میں شریک ہے ۔

هُوَ دَخِیلُ بنی فلانٍ - فلاں قبیلے ہی اپنے کو منسوب کرتا ہے حالانکہ اس قبیلے کا اس کا شمار نہیں ہوتا۔

هُوَ عَفِیفُ الدَّخلَةِ - وہ باطن کا اچھا ہے - وہ دل کا اچھا ہے۔

شیءٌ مَدخُولٌ - شئ میں کوئی عیب پایا جاتا ہے

دَخلَةُ الرَّجُلِ - نیت، مذہب، راز۔

اَلمُدخَلُ - مصدر اور ظرف دونوں معنوں میں مستعمل ہے، یعنی داخل ہونا اور داخل ہونے کا مقام۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَمَن دَخَلَهٗ کَانَ اٰمِنًا ط (آل عمران: ۹۷)

[اور جو کوئی اس میں داخل ہوا، امن میں داخل ہو گیا۔]

یعنی جو حدودِ حرم میں داخل ہوا، اُسے ہر طرح کا امن حاصل ہو گیا، جان کا امن بھی اور روح و قلب کا اطمینان بھی۔ جان کا امن بھی کچھ کم قیمت نہیں لیکن یہاں آکر مناسکِ حج ادا کرنے میں جو روحانی لطف و کیف حاصل ہوتا ہے اور قلب و ضمیر جس طرح وساوس، خطرات اور اندیشہ ہائے دُور و دراز کی طرف سے یکسو ہو کر برکات و سعادت کے ڈھیر اپنے دامنِ عمل میں سمیٹ لینے میں مصروف ہو جاتا ہے، وہ انمول نعمت ہے، جس سے ہر کوئی بہرہ مند نہیں ہوتا۔

دَخَلَهٗ کی ضمیر کا مرجع مقامِ ابراہیمؑ ہے اور اس سے مراد پورا حرم ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَلَمَّا یَدخُلِ الاِیمَانُ فِی قُلُوبِکُم ط (حجرات: ۱۴)

[اور ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا]

یہ اُن بدوی اور گنوار لوگوں سے متعلق ہے جنہوں نے بظاہر اسلام کی اطاعت قبول کر لی تھی، لیکن ایمان ان میں رچا بسا نہیں تھا۔ بظاہر ایمان لے آنا اور ملّت اسلامیہ میں شریک ہو جانا اور بات ہے اور ایمان پر اطمینان کا اظہار کرنا اور اس کے ظاہری و باطنی تقاضوں کو پورا کرنا شئ دگر۔ یہ منافقین کچھ مرعوب ہو کر اور کچھ

اسلامی معاشرے کی برکاتِ مالی و مادی کے حصول کی خاطر، اپنے کفر و نفاق کا اظہار نہیں کرتے تھے، لیکن حقیقی ایمان کی حلاوت و شیرینی سے ان کے قلوب یکسر ناآشنا تھے۔ اسی بنا پر فرمایا کہ ابھی تمھارے دلوں میں ایمان کی شعاعیں کب داخل ہوئی ہیں کہ مومن ہونے کا اعلان کرو۔

یہاں یہ نکتہ ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ کسی شخص کے دل کا نفاق ۔ اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہے ہمیں نہیں۔ اس لیے جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اس شخص کو مسلمان ہی شمار کریں گے جو اسلام کا مدعی ہو اور کوئی ایسی بات نہ کرتا ہو، جو اسلام کے لوازم کے منافی ہو۔

قرآن حکیم میں ہے :

مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ؗ (نساء : ۲۳)

[اور جو تمھاری بیویوں سے ہوں جن سے تم نے صحبت کی ہے]

یہاں اُن عورتوں کا بیان ہے جن سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ ان محرمات میں ایسی لڑکیاں بھی شامل ہیں جو تمھاری اُن بیویوں میں سے ہوں جن سے تم نے زناشوئی کا تعلق استوار کیا۔ یعنی جو تمھاری سگی بیٹیاں نہیں، تاہم تمھاری بیویوں میں سے ہونے کی وجہ سے اُن کو بھی ایک طرح کا احترام و تقدس حاصل ہو جائے گا۔ یہاں دُخول، کنایہ، مقاربت اور جنسی تعلق کے قائم کرنے کے مترادف ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ۔ (بنی اسرائیل: ۸۰)

[اور آپ کہتے رہیے کہ اے پروردگار مجھے پہنچائیو، پہنچانے کے وقت خوبی کے ساتھ اور مجھے نکالیے وقت خوبی سے نکالیو]

آیت کا مفہوم عام ہے۔ یعنی آپ دُعا کرتے رہیے کہ یا اللہ میں جب بھی کسی امر کا فیصلہ کروں تو اس کے آغاز و انجام کو صدق و خوبی سے نباہ سکوں۔ مفسرین نے ہجرت کے وقت، مکہ سے نکلنا اور مدینہ تک خیر و خوبی کے ساتھ پہنچ جانا،

مراد لیا ہے ۔بعض نے اس سے زندگی کے آغاز اور قبر میں اُترنا سمجھا ہے ۔لیکن آیت کا مفہوم بہرحال زندگی کی تمام تگ و دو کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ یعنی ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے صحت و صواب کی توفیق طلب کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے اللہ تعالیٰ سے ربط و تعلق قائم رہتا ہے اور بڑے سے بڑے کام کو انجام دینے کے لیے حوصلہ و برداشت کی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں ۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ ۔ (نحل : ۹۴)

[اور اپنی قسموں کو فساد کا ذریعہ نہ بناؤ۔]

یہاں "دَخَلًا" سے مراد فساد و خلل بپا کرنا ہے ۔غرض یہ ہے کہ اپنے عہد و پیمان کو بہر نوع پورا کرو اور قسموں کو توڑ کر غلط مقاصد حاصل نہ کرو ۔

دخ ن

دَخَنَتِ النَّارُ ۔ آگ سے دھواں اُٹھا ۔

دَخَّنَ ۔ دھونی دی ۔آج کل سگریٹ یا حُقّہ کے استعمال کو تدخین کہتے ہیں ۔

الدَّخَنُ ۔ دھواں ، فساد عقلی فتور ۔

اَلدُّخْنَةُ ۔خوشبو ، عود جسے خوشبو کے لیے جلاتے ہیں ۔

هُوَ دَخِنُ الخلق ۔ وہ لاخو ہے ۔

لَيْلَةٌ سَخَانَةٌ دَخَانَةٌ ۔گرم ، اور گرد آلود رات ۔

اَلْمِدْخَنَةُ ۔وہ انگیٹھی جس میں خوشبو کے لیے عود جلائی جائے ۔

الدُّخَانُ ۔دھواں ۔ وَدَاخِنٌ ۔ تمباکو یا سگریٹ ۔لفظ مولد ہے ۔

قرآن حکیم میں ہے :

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ ۔ (حٰم السجدۃ : ۱۱)

[پھر اُس نے آسمان کی طرف توجہ کی کہ وہ دھوآں تھا]

افلاک اور زمین کی آفرینش کے بارے میں الہامی کتابوں میں سے اس سائنسی انکشاف کا سہرا قرآن حکیم کے سر ہے کہ اس نے واضح لفظوں میں ان کی ابتدائی شکل کو دُخان سے تعبیر کیا۔ دُخان کے معنی دھواں یا گیسوں کا مجموعہ ہے۔ اولاً جو فضا میں چھایا ہوا تھا، انہی گیسوں سے افلاک، نجوم و کواکب اور کرۂ زمین ممیّز ہوئے۔ دھواں اور گیس ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، ایک سائنسی اور دوسرا مذہبی۔ اس دور میں جب قرآن مجید نازل ہوا، گیس کے لیے دُخان سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا تھا۔ فرق صرف ڈکشن اور زبان کا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ کائنات کا اوّلین ہیولیٰ گیسوں کا وہ مجموعہ ہی تھا جس نے آگے چل کر نیلگوں آسمان اور نجوم و کواکب کی درخشانیوں کو اور جنم دیا اور یہی گیس جب پگھلی، ٹھنڈی ہوئی اور اس نے انجماد کی شکل اختیار کی تو زمین کہلائی۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ۙ يَغْشَى النَّاسَ ۖ هَٰذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (دخان: ۱۰)

[تو آپ انتظار کیجیے اُس روز کا جب آسمان کی طرف ایک نظر آنے والا دھواں پیدا ہو جو سب لوگوں پر چھا جائے یہ ایک دردناک عذاب ہوگا۔]

احادیث اور روایاتِ صحیحہ کی روشنی میں اس آیت کی شانِ نزول یہ بیان کی گئی ہے کہ ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی جب کفّار نے آنحضرت ؐ کی دعوت کو نہ پہچانا اور برابر یہی رٹ لگاتے رہے کہ آپ کی یہ دعوت اپنی نہیں بلکہ دوسروں سے مستعار لی گئی ہے اور یہ کہ معاذاللہ آپ کے دماغ میں خلل اور جنون کا اثر ہے تو آپ نے تنگ آکر اُن کی تنبیہ کی خاطر بددُعا کی جو قبول ہوئی۔ بارش نہ ہونے کے سبب مکہ میں سخت قحط پڑا، یمامہ سے جو غلہ آتا تھا وہ بھی بند ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مارے بھوک کے مُردار تک کھانے لگے۔ سب کی آنکھوں میں گرسنگی کی وجہ سے اندھیرا چھا گیا، اور ہر طرف اُنھیں دھواں ہی دھواں نظر آنے لگا۔ اس پر ان کو تنبہ ہوا، اور انھوں

نے اللہ سے مغفرت چاہی۔

ان ناوالوں نے اگر نبوّت کے فیوض کو اچھی طرح نہ سمجھا تو تعجب کی بات نہیں اس لیے کہ انھیں نبوت کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ تعجب اس پر ہے کہ آج بھی مغرب کے دانشور اور نفسیات کے ماہرین یہی کہہ رہے ہیں کہ نبوت مریضانہ ذہن کا کرشمہ ہوتی ہے اور اس کی کوئی صحت مندانہ سائنسی اور علمی توضیح ممکن نہیں۔ حالانکہ انبیا میں فکر و شعور کی جو بلندیاں اور توازن و اعتدال کی جو اعجاز فرمائیاں جلوہ کناں ہوتی ہیں، ان میں کوئی دوسرا ان کا شریک و سہیم نہیں ہوتا۔ اگر مذاہب عالم بالعموم اور اسلام بالخصوص فتور عقل کا نتیجہ ہے تو اس پر ہزار عقل و دانش کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم کا معجزانہ انداز و اسلوب، دعوتِ اسلامی کی پہنائیاں اور انبیا کا اونچا اور عالی کردار کیا ان کی صداقت کی کھلی ہوئی نشانیاں نہیں۔ پھر یہ بھی تو دیکھو کہ آنحضرتؐ کی تعلیم نے ابوبکرؓ، فاروقِ اعظمؓ اور حضرت علیؓ ایسے عظیم قائدین پیدا کیے جنھوں نے نہ صرف ایک پاکیزہ معاشرے کی داغ بیل ڈالی بلکہ فقہ و اجتہاد اور قانون اور فلسفۂ قانون کے نئے آفاق کی نشان دہی کی اور یہی وہ چشم کشا تعلیم تھی جس نے رازی، طغرائی، ابن سینا اور غزالیؒ اور ابن رشد ایسے حکما اور فلسفیوں کو فکر و شعور کی بلند ترین سطح پر ابھارا اور مغرب کے ادعائے علم و عرفان کو صدیوں انہی کی ریزہ چینی پر نازاں اور قانع رکھا۔ درخت اگر اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو مغرب کو کم از کم اسی پیمانے سے آنحضرتؐ کی عظمت و رفعت کو جانچنا اور پرکھنا چاہیے۔

درأ

الدّرأ۔ کسی ایک جانب جھکنا (راغب)، دھکا دینا، ہٹانا، دُور کرنا، ٹالنا۔

دَرَأَ عَنْہُ الْبَلَاءَ۔ اس کی تکلیف کو رفع کر دیا۔

فلانٌ ذُو تُدْرِءٍ۔ وہ دشمنوں کو ہٹا دینے پر قادر ہے۔ قوی اور بہادر ہے۔

دَرَأَ الْكَوْكَبُ ۔ کوکب طلوع ہوا۔
دَرَأُوْا علینا ۔ ہم پر آ دوڑے، حملہ کر دیا۔
دَرَأَ السَّیْلُ ۔ سیلاب اُمڈ آیا۔
تَقَوَّمْتُ دَرْأَہٗ ۔ مَیں نے اس کی کجی کو دُور کر دیا۔ اس کی اصلاح کر دی۔
دَرَأْتُ عَنْہُ ۔ میں نے اس کی مدافعت کی، اس کی جانب سے لڑا۔
تَدَارَأَ الْقَوْمُ ۔ جھگڑے میں معاملے کو ایک دوسرے پر ڈالنا۔

قرآن حکیم میں ہے:
وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ ۔ (الرعد: ۲۲)
[اور بدسلوکی کو حُسنِ سلوک سے ٹالتے رہتے ہیں]

آیت کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ لوگ جو ایمان و عمل صالح سے بہرہ مند ہیں، بُرائی، بدسلوکی اور ایذا رسانی کا جواب نیکی، حُسن سلوک اور نرمی و محبّت سے دیتے ہیں۔ کوئی شر یا تکلیف دہ عمل ان کو انتقام پر نہیں اُبھارتا اور ان کے اخلاقی توازن کو بگاڑنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ دوسرے یہ کہ ان سے جو بتقاضائے بشری لغزشیں سرزد ہوتی رہتی ہیں، یہ اپنی نیکیوں سے ان کا ازالہ کرتے رہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:
فَادْرَءُوا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ ۔ (آل عمران: ۱۶۸)
[آپ کہہ دیجیے اگر تم سچّے ہو تو اپنے کو موت سے بچا لینا]

منافقین پہلے تو ڈھکے چھپے کسی نہ کسی طرح اپنے نفاق کو چھپانے میں کامیاب رہے، لیکن غزوۂ اُحد میں ان کا نفاق کھل کر سامنے آ گیا۔ یہ نہ صرف جہاد میں شریک نہیں ہوئے اور گھروں میں بزدلوں کی مانند بیٹھے رہے بلکہ یہ کہہ کر مسلمانوں کی جرأت و شجاعت کا مذاق اُڑاتے رہے کہ خواہ مخواہ ان لوگوں نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالا، اگر جہاد میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے۔

اِس آیت میں ان کے اس اعتراض کا جواب ہے کہ اگر جہاد میں شریک ہونا

ہونا ہی موت کو دعوت دینا ہے تو تم ذرا موت کو ٹال کر دکھاؤ۔ اگر تمھیں بہرحال موت کے چنگل میں جانا ہی ہے تو کیوں نہ شجاعانہ مردانہ اور جہاد کر کے حیات جاودانہ حاصل کرو جس طرح زندگی کا ایک فلسفہ ہے، اسی طرح موت کا بھی ایک فلسفہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تمھیں چار و ناچار موت کے اس زہر کو اپنے حلقوم میں اُتارنا ہی ہے تو کیوں نہ سقراط کی طرح اس زہر کو مزے لے لے کر حلق میں اُتارو۔ شہداد کی طرح مردانہ وار دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کرو اور کسی اُونچے دینی، اجتماعی اور اصلاحی نصب العین کے حصول کی خاطر جان کی بازی لگاؤ۔ یہ کیا کہ بے کار کی موت مرو، جس کی حیثیت ایک طبعی اور ناگزیر حادثے سے زیادہ نہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

فَادّٰرَءۡتُمۡ فِيۡهَا ؕ (البقرہ: ۷۲)

[پھر تم اس باب میں آپس میں جھگڑنے لگے]

بنی اسرائیل میں سے کسی شخص نے ایک آدمی کو مار ڈالا حضرت موسیٰؑ نے اس پر جب مجرموں سے پوچھ گچھ کرنا چاہی تو ہر ایک نے معاملے کو ٹالنا چاہا اور الزام کو ایک دوسرے پر لگانے کی کوشش کی۔ حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ جرم کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ وہ تفتیش و تحقیق کے دوران بہرحال ظاہر ہو کر رہے۔ حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی مروجہ روایت کے مطابق جو طریق کار اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اس کی تعمیل میں بھی انھوں نے حیص بیص اور لیت و لعل سے کام لیا، اور اس سے بہر صورت دامن چھڑانا چاہا۔ کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اس ڈھب سے قاتل آپ سے آپ اقبال جرم کرلے گا۔

فَادّٰرَءۡتُمۡ تفاعل کا صیغہ ہے، اصل میں یہ تَدَارَأْتُمْ تھا، جس کے معنی الزام کو ایک دوسرے پر دھرنے اور باہم جھگڑنے کے ہیں جس میں قلب و ادغام سے کام لیا گیا۔

علامہ راغب نے ان ادبا کی مخالفت میں سات صرفی نکات کی تشریح کی ہے جو اس کو تفاعل کے بجائے باب افتعال میں شمار کرتے ہیں۔

د ر ج

دَرَجَ - چلا - سیڑھی پر چڑھا - مٹ گیا - بے اولاد مر گیا - کہا جاتا ہے -
هٰذِهٖ اٰثَارُ قَوْمٍ دَرَجُوْا - یہ ان قوموں کے نشان ہیں جو مٹ گئیں جن کا دور ختم ہو گیا۔
دَرَجَ فُلَانٌ - وہ بے اولاد موت کا شکار ہو گیا۔
دَرَجَ الشَّیْخُ - بوڑھا انسان آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا چلا -
فُلَان دَرّاجٌ - فلاں چغلخور ہے - دَرَّاجٌ بھی کے معنوں میں بھی آتا ہے -
اَدْرَجَ الْکِتَابَ - کتاب لپیٹ دی -
اِتَّخَذَ دَارَہٗ مَدْرَجَۃً - انھوں نے اس کے گھر کو گزرگاہ بنا دیا۔
لِفُلَانٍ دَرَجَۃٌ رَفِیْعَۃٌ - فلاں کا مرتبہ بلند ہے -
عَلَیْکَ بِالنَّحْوِ فَاِنَّہٗ مَدْرَجَۃُ الْبَیَان - تمھیں نحو کو ضرور سیکھنا چاہیے، اس لیے کہ نحو حسن بیان کا ذریعہ ہے -
ذَھَبَ دَمُہٗ اَدْرَاجَ الرِّیَاحِ - اس کا خون رائیگاں گیا۔
الدَّرْجُ - وہ کاغذ جس پر کچھ لکھا جائے -
اَلدَّرَجَۃُ - سیڑھی، مرتبہ، مقام -
دَرَّاجَہ - محاصرہ کرنے کا ایک آلہ، آج کل سائیکل کو کہتے ہیں -
تَدَرَّجَ - آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ -

(الاعراف : ۸۲)

(اور جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں انھیں ہم رفتہ رفتہ اس طرح پکڑتے ہیں کہ انھیں خبر ہی نہیں ہوتی۔)

قومیں ایک دم اور اچانک تنزل و ادبار کے گڑھوں میں نہیں جا گرتیں، بلکہ تباہی و بربادی کا یہ عمل تدریج کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ قوموں کو اس مقام پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں اُن کا مٹ جانا یقینی ہو جاتا ہے - یہ قومیں وہ ہیں جو اللہ کی اُن نشانیوں پر غور و فکر

نہیں کرتیں، جو ان کے چاروں طرف بکھری پڑی ہیں، ان سچائیوں پر ایمان نہیں لاتیں، جو ظاہر و عیاں ہیں، ان مقامات عبرت سے عبرت پذیر نہیں ہوتیں، جن سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ کہیں ان سے انفرادی و اجتماعی زندگی میں غلطی تو سرزد نہیں ہوئی۔ یہ آہستہ آہستہ ہلاکت و بربادی کی طرف لڑھکنے والی قومیں وہ ہوتی ہیں جو اپنے ماضی کو فراموش کر دیتی ہیں۔ حال کے تقاضوں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتیں اور مستقبل کے خطرات یا کامرانیوں کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ (البقرۃ: ۲۲۸)

[اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ عورتوں پر حق ہے موافق دستورِ شرعی کے اور مردوں کو ایک گونہ فضیلت حاصل ہے]

اس سے بڑھ کر حقوق نسواں کا واضح چارٹر کیا ہو سکتا ہے کہ مردوں پر عورتوں کے بھی اسی طرح کے حقوق ہیں جس طرح کہ مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں۔ ہاں یہ البتہ واقعہ ہے کہ مردوں کو اُن کی جسمانی قوت اور اُن کی اجتماعی ذمہ داریوں کے اعتبار سے ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔ یہاں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس ایک گونہ فضیلت کے معنی کلی اور زندگی کے ہر خانے میں فضیلت کے نہیں ہیں، بلکہ یہ فضیلت اس بات سے متعین ہوتی ہے کہ "معروف" کے مطابق مرد و عورت کے ذہنی مشمولات کا کیا عالم ہے۔ یہ مشمولاتِ ذہنی و فکری، راکد و جامد ہرگز نہیں۔ تاریخی تقاضوں کے مطابق یہ ہمیشہ ترقی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے آج کی پڑھی لکھی اور شائستہ عورتیں، فکر و نظر کی وسعتوں اور پہنائیوں کے پیشِ نظر اب سے ہزار سال پہلے کی عورتوں سے قطعی مختلف ہیں آج کی عورتیں جہاں گھر گرہستی کے معاملوں کو زیادہ عمدگی اور سلیقے سے انجام دے سکتی ہیں، وہاں اس بات کی بھی صلاحیت رکھتی ہیں کہ اجتماعی زندگی میں مردوں کے شانہ بشانہ اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں اور کسب معاش یا تہذیب و تمدن کے قافلوں کو رواں دواں رکھنے میں۔ مردوں کی

ذمہ داریوں کو نہ صرف نسبتاً ہلکا کرسکیں، بلکہ ان میں شجاعانہ شریک ہوسکیں۔ انھیں ہمدردانہ طریق سے باہم بانٹ سکیں اور بحیثیت مجموعی زندگی کو زیادہ خوش گوار بنانے میں مردوں کی ممد و معاون ثابت ہوسکیں۔

فضیلت و مرتبہ کا تعین تنہا اس بات سے نہیں ہوپاتا کہ کون مرد ہے اور کون عورت، اس کا تعلق زیادہ تر اس بات سے ہوتا ہے کہ کس نے انسانیت کے لیے، علم و معرفت کے لیے نیکی کو اختیار کرنے اور پھیلانے کے لیے کیا کارنامہ انجام دیا ہے جس طرح بعض مرد اپنی صلاحیت کار کی وجہ سے بعض مردوں سے زیادہ بہتر اور زیادہ مقام و مرتبت کے اہل ثابت ہوتے ہیں، ٹھیک اسی طرح بعض عورتیں اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل پر بعض عورتوں اور متعدد مردوں سے زیادہ قابل اور زیادہ تکریم و تعظیم کی اہل ہیں۔

یہ مسئلے کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو جو اس سے کم اہم نہیں یہ ہے کہ گو عورتیں اپنے مشمولاتِ فکری میں اعلیٰ منزلوں تک رسائی حاصل کرسکتی ہیں اور انھیں آج کی پیچیدہ اور مہنگی زندگی میں مردوں پر اور معاشرہ پر صرف بوجھ نہ بن کر رہنا چاہیے بلکہ اس بوجھ کو وسعت و صلاحیت کی حد تک بانٹنا چاہیے۔ تاہم یہ بھی ایک تاباں اور درخشاں حقیقت ہے کہ قدرت نے اُسے ایک مخصوص جسمانی ساخت عطا کی ہے، خاص نوع کی نفسیات تودد و ایثار سے نوازا ہے اور اس کے جسم، اعصاب اور جذبات میں وہ خصوصیات سمودی ہیں جو اس کو ایک متعین فریضے کے ادا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ وہ متعین فریضہ جو قدرت نے اُسے سونپا ہے ہمارے نزدیک یہ ہے کہ وہ پاکیزہ اور بلند شعار ماں بنے، مخلص، نیک اور فرض شناس بیوی کے رُوپ میں نکھرے اور سنورے، گھر کو جنّت و دلبستان کی شمیم آرائیوں سے آراستہ کرے۔ عورت بقول ابن عربی، اللہ کی حسین ترین تجلی ہے، اس کی حفاظت و صیانت، انسانی معاشرے پر فرض ہے۔ اس کا تمام تر حسن، تمام تر زیبائی اور جمال آرائی اس کے عفاف نظر و فکر میں مضمر ہے۔ اسلامی نظریّے میں عفاف، صرف ایک منفی قدر نہیں، جس کے

معنی فسق و فجور سے بچنے اور احتراز کرنے کے ہیں بلکہ عفاف ایک مثبت اور تخلیقی قدر ہے ۔ یہ وہ سر چشمۂ اخلاق ہے جس سے اخلاص، محبّت اور وفاداری ایسے جذبات کی لہریں پھوٹتی ہیں، جن سے رشتوں کی پاکیزگی کا احساس اُبھرتا اور نشو و نما حاصل کرتا ہے ۔

عفاف ہمارے نقطۂ نظر سے عورت کا زیور نہیں، عورت کی خصوصیّت ہے بلکہ یوں کہیے کہ عورت کا امتیاز و تشخص ہے ۔ اگر کسی معاشرے میں عفاف کی قدر و قیمت کا احساس نہیں تو وہ معاشرہ ہرگز مہذب و متمدن معاشرہ کہلانے کا حق دار نہیں ۔

عورتوں کے بارے میں ان دونوں پہلوؤں پر ہمیں غور کرنا ہوگا اور ان میں اس طرح باہم تطبیق دینا ہوگی کہ نہ تو عورتیں، علم و تہذیب کے خزائن سے محروم رہیں، نہ اُن کے بنیادی اور انسانی حقوق مجروح ہوں اور نہ اُن کی پاکیزگیٔ فکر و نظر ہی پر حرف آئے ۔ بزم بھی ان کے وجود سے دمکے اور گھر بھی اُن کی محبّت، توجہ، نگرانی اور اہتمام سے فردوس ثابت ہوں ۔ نہ اولاد، اُن کی محبّت و شفقت سے محرومی کا شکار ہو اور نہ گھر ہی ان کے عدم وجود سے ویرانہ اور خرابہ بن جائیں، تہذیب و تمدّن کے تقاضے بھی پورے ہوں اور شریعت و فطرت کے مقاصد کی بھی تکمیل کا سامان فراہم ہو جائے ۔

قرآن حکیم میں ہے :

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۔ (بقرہ : ۲۵۳)

(ان میں سے وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا ہے اور ان میں سے بعض کے درجے اس نے بلند کیے ہیں)

کفّار مکّہ کو اور یہود و نصاریٰ کے بڑے بڑے علما و احبار کو اس بات پر اچنبھا محسوس ہوتا تھا کہ آنحضرتؐ کو بھی انبیاؑ کے زمرہ میں شمار کریں، حالانکہ آپؐ کا مقام تمام انبیاؑ سے اُونچا ہے ۔ اس لیے کہ آپؐ پر وحی و تنزیل کا وہ طویل سلسلہ اختتام پذیر

ہوتا ہے جو آدمؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ تک پھیلا ہوا تھا۔ آپؐ نے ان تمام تعلیمات کو تکمیل و اتمام کی اس منزل پر پہنچا دیا کہ اب کسی پیغامِ نو، کسی شریعتِ جدیدہ اور نبوّت حدیثہ کی حاجت نہیں۔

اس آیۂ مبارکہ میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انبیا اگرچہ مخاطبہ الہیٰہ کے اعتبار سے سب یکساں احترام و تکرم کے حامل ہیں، تاہم ان میں تفوق و امتیازات کے درجات و مراتب کا فرق موجود ہے، جس طرح آنحضرتؐ کو ختمی مرتبت کے پرفخار لقب سے نوازا گیا، ٹھیک اسی طرح حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ کہلائے وحی و صفات نبوّت کا یہ فرق چونکہ سابق انبیا میں بھی پایا جاتا تھا اس لیے تمھیں اس بات پر متعجب نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو بھی ارسال اور تنزیل وحی کے انوار سے بہرہ مند کیا ہے اور بنی نوع انسان کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ (الانعام: ۱۳۲)

[ہر ایک کے لیے درجے ہیں، جتنے اُس نے عمل کیے اور جو کچھ یہ کرتے رہتے ہیں آپ کا پروردگار اس سے بے خبر نہیں]

یعنی قوموں کی جزا و سزا اور صلہ و عقوبت کا معیار، عمل ہے۔ اگر عمل صحیح ہے اور ایمان و یقین کے سوتوں سے پھوٹتا ہے تو لائق اجر و ثواب اور قوموں کے ثبات و احیا کا ضامن ہے اور اگر عمل کا سرچشمہ خواہشات نفس ہیں تو یہ سرے سے وہ عمل ہی نہیں جو اجر کا متقاضی ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں چونکہ تمام قوموں کی عملی زندگی کا نقشہ اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ موجود ہے اس لیے اگر کوئی قوم فنا کے گھاٹ اُترتی اور اپنے کو عذاب الٰہی کا مستحق قرار دیتی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی غفلت کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ اس قوم کے اپنے کیے دھرے کا منطقی نتیجہ ہے جس سے اس کو بہرحال دوچار ہونا تھا۔

د ر ر

اَلدَّرُّ ۔ دودھ ۔ دودھ کی کثرت و فراوانی، کہا جاتا ہے لِلّٰہِ دَرُّکَ ۔ کلمۂ استعجاب و تحسین، تیری خوبی اللہ ہی کے لیے ہے۔

اَلدُّرُّ ۔ موتی ۔

اَلدِّرَّۃُ ۔ دودھ، دہی کی کثرت ۔

کَوکَبٌ دُرِّیٌّ ۔ موتی کی طرح درخشاں ستارہ ۔

دَرَّ الحَلِیبُ ۔ دودھ زیادہ ہونا۔

دَرَّ الفَرَسُ ۔ گھوڑے کا تیز دوڑنا ۔

اَدَرَّ المِغزَلَ ۔ سوت کو مضبوط بٹنا ۔

اَلمِدرَارُ ۔ کثرت سے برسنے والا، مینہ ۔

اَلدَّرُورُ ۔ زیادہ دودھ دینے والی اونٹنی ۔

قرآن حکیم میں ہے ۔

یُرسِلِ السَّمَآءَ عَلَیکُم مِّدرَارًا ۔ (نوح : ۱۱)

[وہ تم پر کثرت سے بارش بھیجے گا۔]

حضرت نوح کا ذکر ہے کہ انھوں نے ہر چند اپنی قوم کو سمجھایا کہ اگر تم ایک اللہ پر ایمان لے آؤ اور اس سے بخشش و رحم طلب کرو تو نہ صرف وہ تمھارے درجات اخروی میں اضافہ کرے گا بلکہ تمھاری دنیا بھی سنوار دے گا ۔ تم پر اس کا ابرِ کرم چھاجوں برسے گا اور تمھاری سوکھی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو جائیں گی ۔ تمھیں اولاد و اموال سے بھی نوازے گا۔ لیکن انھوں نے ایک نہ مانی اور بدستور کبر و غرور سے کام لے کر دعوت خداوندی کو جھٹلاتے رہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن طوفان نے ان کو آلیا اور ان کا انکار و کفر ان کو اللہ کے عذاب سے بچا نہ سکا ۔

کسی قوم کو دنیوی خوشحالی، باد و باراں کی کرم گستری اور مال و دولت کی فراوانی کا تعلق

اگرچہ بظاہر قانون فطرت اور انسان کی سعی و تدبر سے ہے، لیکن اس کا ایک پہلو تعلق باللہ، ایمان خالص اور عمل صالح سے بھی متعلق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی تدبیر کونی میں یہ امر بھی شامل ہے۔ جو قوم اپنے تعصبات اور مفادات سے اونچا اُٹھ کر اللہ کی دعوت پر لبیک کہے، اللہ بھی اس کی مدد کرے گا اور اپنی نصرت و اعانت کا اس کو یقین دلائے گا۔

قرآن حکیم میں ہے۔

اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ - (نور : ۳۵)

(قندیل گویا ایک چمکدار ستارہ ہے)۔

یہ ایک طویل تشبیہ کا حصہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو کائنات ارضی وسماوی کی روشنی اور نور قرار دیا گیا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے طاق کی ہے جس میں ایک چراغ دہک رہا ہے اور یہ چراغ ایک قندیل میں ضوفشاں ہے گویا وہ ایک درخشاں موتی ہے۔ اس نور اور روشنی کا انعکاس صرف اُن قلوب پر ہوتا ہے جو مصفا اور مجلی ہوں اور ادنیٰ خواہشات کے تلوث سے ہر طرح سے پاک ہوں، جو ہدایت و رہنمائی کے خواہش مند ہوں، جو روشنی کو پسند کرتے ہوں اور ہر طرح کی تاریکی سے نفور ہوں۔ جو اللہ کو پانا، سمجھنا اور اس کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہوں۔ ہر کس و ناکس اس کے انوار ہدایت سے استفادے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

درس

دَرَسَ الرَّسْمُ - خیمہ و مکان کا نام و نشان مٹ گیا۔

دَرَسَ الثَّوْبُ - کپڑا بوسیدہ ہو گیا۔

دَرَسَ الْعِلْمَ - علم پڑھا، اس پر غور و فکر کیا۔ اُسے پیہم اور بتکرار پڑھا۔

دَرَسَ الْحِنْطَةَ - گیہوں کا گاہنا۔ اس پر اس طرح بار بار بیلوں کو چلانا کہ بھوسا دانوں سے الگ ہو جائے۔

دَرَسَتِ الرِّيَاحُ - ہوائیں اس پر اس قدر چلیں کہ اس کو مٹا کر رکھ دیا۔

رَجُلٌ مُدَرَّسٌ - تجربہ کار آدمی۔ منجھا ہوا انسان

تَدَارُسٌ - باہم مل کر پڑھنا۔

مِدْرَاسٌ - یہودیوں کا تعلیمی و دینی مرکز۔

دَارَسَ الذنوب - گناہوں کو ترک کر دیا۔

طریق مدروسٌ - پامال راستہ جس پر کثرت سے لوگ آئیں جائیں اور وہ اس سے بوسیدہ ہو جائے۔

قرآن حکیم میں ہے :-

وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۔ (آل عمران : ۷۹)

[یہ اس لیے کہ تم آسمانی کتاب پڑھتے ہو]

یہود و نصاریٰ سے ایک ساتھ خطاب ہے کہ تم نے اللہ کی کتاب میں دانستہ تحریف کی - ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ انبیا کو علم و حکمت سے نوازے اور پھر وہ خدا بن بیٹھیں۔ تم نے تورات و انجیل کو اچھی طرح پڑھا ہے اور اس پر غور کیا ہے - اس میں کہیں شرک کی، بدعات کی اور دین میں تحریف کی اجازت ملتی ہے، ہم یہ باتیں قرآن کے ذریعے اس لیے تم تک پہنچا رہے ہیں کہ تم پھر سے دین حنیف کی طرف لوٹ آؤ اور اپنے رب کو پہچاننے والے، اس کے آگے جھکنے والے اور اس کی عبادت کرنے والے ہو جاؤ۔ اس ایمان سے تم میں عقل و فکر کے وہ ابواب بھی وا ہوں گے جو تمھیں یہ بتائیں گے کہ دنیوی فلاح و بہبود حاصل کرنے کے کیا ذرائع ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ کتب الٰہیہ کا علم و عرفان بھی اگر تم میں بندگی و عبودیت کی روح کو بیدار نہ کر سکے تو ایسے علم سے کیا فائدہ۔

قرآن حکیم میں ہے :-

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ص وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۵ (انعام : ۱۵۶)

[اور اس لیے بھی کہ کہیں تم یہ نہ کہنے لگو کہ کتابیں تو بس اُن دو گروہوں پر اُتاری گئی ہیں جو ہم سے پہلے تھے اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے غافل ہی رہے]

تخاطب مشرکین مکہ سے ہے، کہ یہ کتاب ہدیٰ جو دنیا بھر کی برکتوں کو سمیٹے ہوئے ہے ہم نے تم پر اس غرض سے نازل کی ہے کہ اس کی اتباع کرو اور اس کی برکتوں سے اپنا دامن عمل آراستہ کر لو اور قیامت کے روز یہ نہ کہو کہ کتابیں تو یہود و نصاریٰ پر ہی اتاری گئی تھیں۔ ہمیں کیا معلوم کہ ہدایت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ قرآن نے تمہاری اس کج حجتی کا جواب دے دیا۔ اب تمہارا فرض ہے کہ اس کتاب کو پڑھو، اس کو سمجھو اور اس کی روشنی میں اپنے کردار و عمل کا نقشہ درست کر لو، شرک سے باز آؤ اور خدائے واحد سے لو لگاؤ کہ وہی تمہاری جملہ ضروریات و حاجات کا کفیل و ضامن ہے۔

حضرت ادریس

قرآن حکیم میں ہے:-

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّاۙ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (مریم: ۵۶)

[اور آپ اس کتاب میں ادریس کا بھی ذکر کیجیے۔ بے شک وہ بڑی راستی والے تھے، اور نبی تھے اور ہم نے اُن کو بلند مرتبت تک پہنچایا]

حضرت ادریس کا تورات میں نام اخنوخ ہے۔ یہودی روایات کے مطابق یہ حضرت آدم کے پوتے تھے۔ اسی طرح یہودی روایات کے مطابق یہ تین سو برس تک جیے اور بعد میں آسمان پر اُٹھا لیے گئے تاکہ یہ موت کا مزہ نہ چکھ سکیں اور خدا کے ساتھ ساتھ جئیں اور اس کے جلو میں رہیں۔ ان کو حنوک کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

لیکن یہ تمام روایات قبل تاریخ کی ہیں، اس لیے غیر مستند ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اسرائیلیات کے ضمن میں ان روایات کا تذکرہ ملتا ہے۔ خصوصاً شیعی روایات میں ان کے رفع آسمانی کا ذکر صاف صاف پایا جاتا ہے، لیکن یہ قطعی صحیح نہیں، قرآن نے جو یہاں رفع

مکانی کا ذکر کیا ہے اس سے مراد رفع درجات ہے، رفع منزلت ہے اور عمل و کردار میں بلندیٔ مقام ہے۔

ادریس انھیں اس لیے کہا جاتا تھا کہ صحف ابنیا اور صحف علم و ادراک پر اُن کی گہری نظر تھی۔ یہ اپنے دَور کے علوم و فنون کو اچھی طرح جانتے بوجھتے تھے۔

صدیق کے ساتھ ساتھ انھیں سورہ انبیا میں صابر کے پُر فخار لقب سے بھی ملقب کیا گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے اُنھوں نے اپنے مشن میں مخالفت و عناد کی آندھیوں کا پامردی اور صدق و صفا سے مقابلہ کیا۔

قرآن اور بائبل کے انداز بیان میں : یہ نمایاں فرق ہے کہ جہاں بائبل میں غیر ضروری، غیر تاریخی اور خلاف عقل ہدایات اور اساطیر، کثرت سے بیان کی جاتی ہیں وہاں قرآن صرف اہنی واقعات کا تذکرہ کرتا ہے جن میں کوئی سبق، عبرت آموزی کا کوئی اشارہ یا کردار و عمل پر دلالت کناں کوئی نکتہ پایا جاتا ہے۔ قرآن لاطائل کہانیوں اور غلط روایات پر مبنی قصّوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔

دَرَکَ۔ جُستجو کی اور پالیا، ڈھونڈا اور جا لیا۔

اَدْرَکَ۔ جا ملنا، جالینا، پالینا، معانی اور اجسام دونوں پر یکساں بولا جاتا ہے۔

اَدْرَکَ الشَّیُٔ۔ اپنے وقت پر پہنچا۔

اَدْرَکَ الثَّمَرُ۔ پھل کے پکنے کا وقت آپہنچا۔

دَارَکَ المَطَرُ۔ بارش پے بہ پے برستی رہی۔

دَارَکَ۔ لاحق ہونا۔

تَدَارَکَ۔ غلطی کی اصلاح کرنا۔

اِستِدرَاکٌ۔ تلافی مافات کرنا، کلام سابق میں جو وہم پیدا ہوا اُسے دُور کر دینا۔

اَلدَّرَکُ۔ انتہائی گہرائی، قعر بفتح را، اور بجزم را

دَرَاکِ۔ اسم فعل بمعنی اَدْرِکْ۔ یعنی جان لے۔

مَدَارِکُ الشَّرْعِ ۔ وہ نصوص جن سے احکام مستنبط ہوتے ہیں ۔

قرآن حکیم میں ہے :۔

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدْرَکَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ ۔ (سورہ یونس ۹۰)

[یہاں تک کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو بولا میں ایمان لاتا ہوں] ۔

فرعون سے متعلق ہے کہ جب اُس نے بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے دریا پار کرنے اور بنی اسرائیل کو پکڑنے کی کوشش کی تو غرقابی نے اُسے آ لیا ۔ اس وقت اس کی آنکھیں کھلیں اور اُس نے جان لیا کہ حضرت موسیٰؑ جس خدا کو ماننے کی تلقین کرتے تھے اُس کا وجود برحق ہے، لیکن اس وقت کا ایمان عند اللہ معتبر نہیں، اس لیے کہ ایمان کی تعریف یہ ہے کہ بغیر کسی جبر و اکراہ کے بہ رضا و رغبت اللہ تعالیٰ کے حکموں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے ۔

قرآن حکیم میں ہے :۔

لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِکَ الْقَمَرَ ۔ (یٰسین : ۴۰)

[اور نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے ۔]

ادراک کا لفظ لغت میں لازم بھی استعمال ہوا ہے لیکن قرآن حکیم میں ہر جگہ متعدی کے معنوں میں آیا ہے ۔

اس آیۂ شریفہ نے، اس نظام، ڈسپلن اور باقاعدگی پر روشنی ڈالی ہے جو نظام عالم میں کارفرما ہے اور اس کی وجہ سے یہ دُنیائے ہست و بود قائم و استوار ہے ۔ یہاں سورج کی ایک مخصوص رفتار ہے اور چاند کی متعین چال، اس لیے نہ یہ ممکن ہے کہ چاند سورج کو جا لے اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ سورج چاند کو جا پکڑے ۔ اس نظام کی محکمی و استواری اور تسلسل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک کامل شعور، کامل حکمت، اور کامل ہندسی اور ریاضیاتی ادراک جلوہ کناں ہے ۔ یعنی یہ مادے کی غیر شعوری حرکت کا نتیجہ نہیں کہ لیل و نہار کی یہ ترتیب اس طرح باقاعدگی کے ساتھ پیہم و مسلسل جاری رہے یا یہ نظام آپ سے آپ، بغیر کسی شعوری محرک اور حکمت کے ظہور پذیر ہو جائے،

یہ اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ نظام ہے، جو حکمت وقدرت کا ایسا پیکر تنزیہی ہے جس کی کوئی نظیر نہیں پائی جاتی۔

قرآن حکیم میں ہے:-

فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَىٰ ۝ (طٰہٰ: ۷۷)

[پھر اُن کے لیے عصا مار کر خشک رستہ بنا لینا تم کو نہ پانے کا اندیشہ ہوگا اور نہ کوئی اور خوف ہوگا]

جب مصر میں بنی اسرائیل پر مظالم وتشدد کی انتہا ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ اب تم بحر احمر کی خلیج پار کر کے وادی میں پناہ گزین ہو جاؤ اور اس سے نہ ڈرو کہ پانی کے ریلے تم کو بہالے جائیں گے۔ کیونکہ تم جونہی عصا مارو گے تمھارے لیے ایک رستہ بن جائے گا جس کے ذریعے تم آسانی سے خلیج پار کر لو گے۔ یہ محض بخت واتفاق کا کرشمہ نہ تھا کہ پانی پایاب ہو گیا اور حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ یہ کھلا ہوا اعجاز تھا عصائے موسوی کا اور اللہ کی قدرت ومعاونت کا۔ قانون فطرت کا جبر والتزام مسلم۔ لیکن یہ قانون جس ربّ فاطر نے وضع کیا ہے اس نے اس میں اتنی لچک بھی رکھی ہے کہ کبھی کبھی، بالالتزام انسانی مصلحت کی خاطر یہ اپنی خو سے دست بردار ہو کر اخلاق وہدایت کے قانون کی اطاعت قبول کر لے۔

قرآن حکیم میں ہے:-

حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ أَضَلُّونَا ۔ (اعراف: ۳۸)

[حتیٰ کہ جب اس میں داخل ہو جائیں گے تو اس وقت ان کے پچھلے اپنے اگلوں کی نسبت کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار انہی نے تو ہمیں گمراہ کیا تھا۔

"اِدَّارَکُوا" دراصل تدارکوا تھا۔ "تا" کو دال میں مدغم کر دیا گیا ہے اور سکون کی وجہ سے الف وصل بڑھا دیا گیا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ جب جہنم میں پچھلے اگلوں سے آملیں گے تو اس وقت اپنی گمراہی کا الزام پہلوں پر دھریں گے اور کہیں گے کہ ہم تو محض ان کی وجہ سے گمراہ ہوئے۔ یہ اگر راہِ راست پر ہوتے تو ہم بھی گمراہی سے محفوظ رہتے۔ حالانکہ تقلید سے قطع نظر یہ ہر جماعت کی اپنی ذمہ داری ہے کہ اپنے لیے حق و صداقت کی راہ متعین کرے۔ حق کو پہچانے اور گمراہی سے کنارہ کش رہے، اگلوں کے افکار و عقائد کا جائزہ لے اور اپنے لیے صرف انہی باتوں کو قبول کرے جو قرینِ عقل و دین ہوں اور ان عقائد و افکار کو ماننے سے قطعی انکار کر دے جو گمراہی، شرک اور بدعات پر منتج ہوں، جن سے خدا ناراض ہو اور اپنا مستقبل تاریک ہو جائے۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ۔ (الانعام : ۱۰۳)

(اُسے نگاہیں نہیں گھیر سکتیں اور وہ نگاہوں کو گھیرے ہوئے ہے اور وہ بھید جانتا ہے خبردار ہے)

یوں تو اس کے حریم ذات تک جانے والی متعدد راہیں ہیں اور کائنات میں بکھری ہوئی ہزاروں نشانیاں ہیں جن سے اس کے وجود باجود کا اتا پتا چلتا ہے، لیکن اس کی ذات کا پورا پورا ادراک، ان حسی آنکھوں سے ممکن نہیں۔ انسان محدود ہے، اس کی رسائی محدود ہے اور اس کی عقل و دانش کے دائرے سمٹے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں اس کی ذات و کنہ کی پہنائیوں تک کس کی دسترس ہو سکتی ہے۔ ہاں اس کو پہچاننے اور جاننے بوجھنے کا البتہ ایک طریق ہے کہ پہلے اس کو تسلیم کیا جائے، اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کیا جائے، اُس سے لو لگائی جائے اور اس سے اپنی عبودیت و بندگی کے رشتوں کو اُستوار کیا جائے۔ اس کے بعد بجا طور سے توقع کی جائے کہ اب اس کی رحمتیں آگے بڑھ کر ہمارا خیر مقدم کریں گی۔ اس کی راہنمائی شاملِ حال ہو گی اور مشکلات و مصائب کی ہر گھڑی میں ہر طرح اس کی رحمت ہماری دستگیری فرمائے گی۔ اس کے سوا اس کے جاننے کا اور کوئی قطعی و یقینی راستہ نہیں

درہم

دِرْهَمٌ - چاندی کا ایک سکہ جس سے عرب لین دین کا معاملہ کرتے تھے۔ یہ لفظ یونانی سے معرب ہے۔ مولدین کے نزدیک مطلقاً نقود کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اَلْمُدَرْهَمُ - جس کے پاس کثرت دراہم جمع ہوں۔

اِدْرَهَمَّ - بڑی عمر پائی، بڑھاپے سے دانت گر گئے۔

اِدْرَهَمَّ الْبَصَرُ - نظر مدھم پڑگئی - بینائی کمزور ہوگئی۔

قرآن حکیم میں ہے:-

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ (یوسف: ۲۰)

[اور انھوں نے بہت کم قیمت پر گنتی کے چند درہم کے عوض فروخت کر دیا]

حضرت یوسف کو حضرت یعقوب ان کی پیش آئند صلاحیتوں کے پیش نظر بہت چاہتے تھے۔ بھائیوں میں حسد کی آگ بھڑکی اور انھوں نے سوچا کہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے حضرت یعقوب، یوسف کے بجائے، اپنی محبت کا مرکز انھیں ٹھہرائیں۔ اس تدبیر کو بروئے کار لانے کے لیے یوسف کو یہ اپنے ساتھ جنگل میں لے گئے اور چاہا کہ انھیں جان سے مار ڈالیں۔ یہودا نے انھیں سمجھایا کہ انھیں موت کے گھاٹ اتار دینے سے کیا فائدہ۔ کیوں نہ ہم انھیں اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔ چنانچہ ان کا قافلہ جب ادھر سے گزرا تو چند دراہم کے عوض بھائیوں نے اپنے عزیز بھائی کو بیچ ڈالا، جسے آئندہ چل کر مصر کے تخت اقتدار پر پہنچنا تھا۔ اپنی پیغمبرانہ بصیرت سے نہ صرف نظام مملکت کو چلانا تھا بلکہ احکام الٰہی کی تبلیغ بھی کرنا تھا۔ نیز عزیز مصر کو یقین دلانا تھا کہ نبوت کے عادلانہ طریق سے دلوں کو کیونکر جیتا جا سکتا ہے، اور آئندہ آنے والے مصائب کا پہلے سے کیونکر سدباب کیا جا سکتا ہے۔ بھائیوں نے ازراہ حسد ان کی ان خوبیوں کا اندازہ نہیں کیا۔ جن کا اندازہ حضرت یعقوب کی نگاہ دوررس نے اس وقت کر لیا تھا جب حضرت یوسف نے وہ خواب دیکھا، جس میں ان کے عروج و اقبال کی جھلکیاں ہویدا تھیں۔ بھائیوں نے یہ کہہ کر کہ یوسف ہمارا غلام ہے، حضرت یوسف کو فروخت کر دیا۔ لیکن ان کی وفاشعاری ملاحظہ ہو کہ بھائیوں کے اس

دعوے کی قطعی تغلیط نہیں کی، مبادا یہ اپنے کیے پر نادم ہوں، آخر وقت تک یہ خاموش رہے، اور سستے داموں بک گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہی بھائی بالآخر ذلیل ہوئے اور اپنی آنکھوں سے ان کے جاہ وجلال کو دیکھ کر انھیں اپنی غلطیوں کا احساس ہوا۔

د ر ی

دَرَیٰ ۔ جاننا، معلوم کرنا، کسی تدبیر سے کسی حقیقت کو پالینا۔

دَرَیٰ ۔ شکار کو دھوکا دے کر پکڑنا، دھوکہ دینا۔

دَارَیٰ ۔ مُدَارَاۃً ۔ نرمی اور ملاطفت سے پیش آنا، شکار کو ورغلانا۔

اَدْرَیٰ ۔ جتلانا۔

اَلْمِدْرَیٰ ۔ کنگھی۔

اَلدِّرَایَۃ ۔ علم، معرفت، بصیرت، صحیح ادراک۔

قرآن حکیم میں ہے :۔

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا (لقمان : ۳۴)

[اور کوئی بھی نہیں جانتا وہ کل کیا عمل کرے گا۔]

سیاق آیت کا تعلق ان امور غیبیہ سے ہے جن کو بجز اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا، ان میں ایک امر یہ بھی ہے کہ کل اپنے آغوش میں کن فجائی اور اچانک پیش آنے والے واقعات کو لیے ہوئے ہے، یعنی کل کے پردۂ غیب سے کون غیر متوقع حوادث ظہور پذیر ہونے والے ہیں اور یہ کہ آنے والا کل، کن خوشخبریوں کا حامل اور کن اندوہناک خبروں کو اپنے دامن میں چھپائے ہوتے ہے ۔ اس سے انسانی علم کی واماندگی بھی ظاہر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم کی ہمہ گیری بھی۔

قرآن حکیم میں ہے :۔

سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝ مدثر : ۲۶، ۲۷

[سو اس کو جلدی ہی دوزخ میں داخل کردوں گا اور آپ کو کیا خبر کہ دوزخ کیا چیز ہے]

ولید بن مغیرہ کے بارے میں ہے جو قریش مکہ میں بہت با اثر شخص تھا، اس نے جب قرآن پر غور کیا تو بہت سے غور و فکر اور تامل کرتے اور ناک بھوں چڑھانے کے بعد کہا تو یہ کہا کہ یہ تو وہی جادو کا کرشمہ ہے، جس کو ہم زمانۂ قدیم سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ یعنی نہ تو یہ قرآن کی ان اعجاز فرمائیوں سے متاثر ہوا جن کا تعلق خوارق معارف سے ہے۔ نہ اس کی زبان نے اس کو متاثر کیا، نہ اس کی کور چشمی نے یہ دیکھا کہ یہ ایک مرتب کلام ہے، رشد و ہدایت کا ایک خاص صحیفہ ہے اور ایک انقلابی دعوت و منشور ہے۔ اور اس میں ایسے ایسے خوارق ہیں جن کا اظہار سحر و جادو کے بس کا روگ نہیں۔ اس نے ازراہِ کبر و نخوت قرآن کی عظمت جاننے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر فرمایا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ پھر "ما ادراک" کہہ کر جہنم کی اذیتوں کی تفصیل بیان کی۔ یہ ایک سوالیہ جملہ ہے، اس سے مقصود اس کے بعد جس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے، اس کی اہمیت جتانا ہے۔ آنحضرتؐ کے علم کی نفی مقصود نہیں۔ ہر زبان میں علم بلاغت کا یہ جانا بوجھا اسلوب ہے کہ زیادہ اہم امور کو استفہامیہ انداز میں بیان کیا جائے۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۚ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ۝ (نمل:۶۶)

[بات یہ ہے کہ آخرت کے باب میں ان کا علم نیست ہو چکا بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں بلکہ یہ اس کی طرف سے اندھے بنے ہوئے ہیں]

آخرت پر ایمان لانا مذہب کی جان ہے، اقدار حیات اور اخلاق و سیرت کی تشکیل کا اہم انداز ہے، اگر ہم زندگی کے عمل کو جاری و ساری نہیں مانتے اور اس بات کے قائل نہیں رہتے کہ آخر میں اس زندگی کو اور سنورنا اور آراستہ ہونا اور جملہ اضداد سے مبرا ہو کر اور نکھرنا ہے، اور انسان کو اپنے عقائد و اعمال کے مطابق ایک نئی اور کامل زندگی سے آشنا ہونا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ زندگی سراسر بے معنی، ناقابل اعتنا اور مہمل ہے اور اس کو معرض وجود میں لانے والا علیم و حکیم

خدا نہیں، بلکہ فطرت کے اندھے بہرے قوانین ہیں، جنھوں نے اس معقول، حسین اور مبنی بر اقدار حیات کو پیدا کیا ہے، اس صورت میں، قطع نظر اس تضاد کے کہ اندھے بہرے قوانین، حسن و عقل کے اس امتزاج کو کیوں کر جنم دے سکتے ہیں۔ یہ سوال بھی اُبھرتا اور کھٹکتا ہے کہ پھر "قاعدہ، قانون، ضابطۂ حیات، اخلاق و اقدار کو ملحوظ و مرعی رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

قرآن حکیم کی اس آیت میں انکار آخرت کی نفسیات کو تین درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے تو یہ ہوتا ہے کہ آخرت کے بارے میں کفار کا علم تہی دامن ثابت ہوتا ہے، پھر یہ شک و ارتیاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر یہ اس کو ناشائستہ اعتنا سمجھ کر اس کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

'اِدَّارک' اصل میں تدارک تھا، غرض کہ ان لوگوں کے ذہن میں اگلے پچھلے کافرانہ عقائد نے کچھ اس طرح گھل مل کے انکار کی شکل اختیار کر لی ہے کہ اب تدارک کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

یہاں لفظ 'بل' کا تکرار، عربی جاننے والوں کے لیے اعجاز سے کم نہیں، مقصد پہلی چیز کی نفی اور دوسری چیز کا اثبات نہیں، جیسا کہ لفظ بل کا عمومی تقاضا ہے، بلکہ کیفیات انکار کی تقسیم اور ارتقا اور درجہ بندی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (الانعام: ۱۰۳)

[اُسے نگاہیں نہیں گھیر سکتیں اور وہ نگاہوں کو گھیرے ہوئے ہے]

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات و کنہ کا تعلق ہے، یہ محدود القویٰ انسان اس کا احاطہ نہیں کر سکتا، یہ حسی آنکھیں اس کو پا لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ یہی نہیں، یہ روایتی دلائل و براہین بھی اس کے حریم ناز تک رسائی حاصل کرنے میں قاصر ہیں۔ ہاں اس کی تجلیات ربوبیت کو، اس کی حکمت و دانش کے کرشموں کو اور اس کی قدرت و خلاق کے خوارق کو، اس دبستان عالم کے ایک ایک پتہ،

شاخ اور ایک ایک بوٹے میں دیکھ سکتے ہیں - یہ نگاہیں اس کو نہیں گھیر سکتیں، البتہ اس کے دائرۂ علم و ادراک میں کائنات کا ذرہ ذرہ دمک رہا ہے ۔

د س ر

اَلدِّسَارُ - کشتی کو جوڑنے والی ایک چیز، جس کو درخت کے ریشوں سے بنایا جاتا تھا میخ، کیل، اَلدَّسُرَاءُ - کشتی -

دَسَرَ - ہٹانا، راغب نے دفع شدید کے معنوں میں استعمال کیا ہے -

دَسَرَ السَّفِینَۃَ - کشتی کے تختوں کو باہم جوڑا، کشتی کے تختوں کو میخوں سے جوڑا -

اَلدَّوْسَرُ - موٹا اونٹ نعمان بن منذر کی فوج کا نام، موٹا اور مضبوط -

رَجُلٌ مِدْسَرٌ - بلا کا نیزہ باز -

ایک روایت میں ہے :-

لَیْسَ فِی العنبر زَکَاۃٌ اِنَّمَا ھُوَ شَیْءٌ دَسَرَہُ الْبَحْرُ عنبر میں زکوٰۃ نہیں، وہ تو ایسی چیز ہے، جس کو سمندر کی موجوں نے باہر پھینکا ہے -

قرآن حکیم میں ہے :-

وَحَمَلْنٰہُ عَلٰی ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ ﴿القمر، ۱۳﴾

[اور ہم نے نوح کو سوار کر دیا تختوں اور میخوں والی کشتی پر]-

جب حضرت نوحؑ کے زمانے میں قوم کی سرکشی کی وجہ سے ایک طوفان نے انھیں آگھیرا تو سب اس میں غرق ہو گئے - حضرت نوحؑ اور اُن کے ماننے والے جو کشتی میں سوار تھے، کشتی میں سوار ہو کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے - یہ کشتی وحی کی ہدایت اور اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں تیار ہوئی تھی اور اس انداز سے بنائی گئی تھی کہ آنے والے طوفان کی موجیں اور لہریں اس کو گزند نہ پہنچا سکیں -

اس کے معنی یہ ہیں کہ قدیم اشیا کے فرائض میں جہاں یہ امر داخل تھا کہ لوگوں کی رُوحانی و اخلاقی اصلاح کریں وہاں ان کے دائرۂ کار میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اس

دور کی تکنیکی اور تہذیبی روایات کو آگے بڑھائیں۔

د س س

دَسَّ ۔ کسی چیز کو زمین میں چھپا دینا، گاڑ دینا، دھنسا دینا۔

دَسَّ علیہ ۔ کسی کے خلاف سازش کرنا، خفیہ چال چلنا۔

اِنْدَسَّ ۔ زمین میں دفن ہونا۔ زمین میں دھنس جانا۔

اَلدَّسِیْسَۃ ۔ سازش، خفیہ مکر و حیلہ یا تدبیر۔

اَلدَّاسُوْسُ ۔ جاسوس۔

اَلدَّسِیْس ۔ جاسوس جسے دوسروں کی خبریں معلوم کرنے کے لیے بھیجا جائے۔

قرآن حکیم میں ہے :-

اَیُمْسِکُہٗ عَلٰی ھُوْنٍ اَمْ یَدُسُّہٗ فِی التُّرَابِ ۔ (نحل : ۵۹)

[آیا اِس مولود کو ذلّت کی حالت میں رہنے دے یا اسے مٹی میں گاڑ دے]

اس آیت میں دراصل مشرکینِ عرب کے بعض قبائل کے اس تضاد کی نشان دہی کی گئی ہے کہ ایک طرف تو تمہاری حالت یہ ہے کہ اگر تمہارے ہاں لڑکی پیدا ہو جائے تو تم مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتے ہو، لوگوں سے منہ چھپاتے پھرتے ہو، اور یوں سوچتے ہو کہ اس لڑکی کو رسوائی و ذلّت اور عار کے باوجود زندہ رہنے دیا جائے یا زمین میں زندہ گاڑ دیا جائے۔ اور دوسری جانب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے کر اُن کی پرستش کرتے ہو، یعنی اپنے لیے تو اولادِ ذکور پسند کرتے ہو اور ذاتِ باری۔ جو لَمْ یَلِدْ کے وصف سے اتصاف پذیر ہے۔ اس کی جانب صنفِ اناث کو منسوب کرتے ہو۔

لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تمام قبائلِ عرب کا شیوہ نہ تھا۔ صرف خزاعہ و کنانہ کے دو قبیلوں میں یہ بُرائی رائج تھی، ورنہ عام طور پر جاہلیت میں، عورتوں کو خاص تہذیبی مقام حاصل تھا۔ مردوں کے ساتھ یہ میلوں ٹھیلوں میں برابر شریک ہوتیں، تجارت

کرتیں، جنگ میں اپنے بہادروں کو شجاعت پر اُبھارتیں اور شعر و شاعری میں حصّہ لیتیں اور اپنے قبیلے کے وقار و افتخار کے گُن گاتیں۔

خزاعہ و کنانہ کے قبائل یا تو عار اور جھوٹی عشرت کی خاطر ان کو موت کے گھاٹ اتار دیتے یا اس لیے کہ اُن کے ہاں عورتیں چونکہ کسی پیداواری عمل میں شریک نہیں ہوتی تھیں اس لیے ان کو فقر و افلاس کا موجب جان کر ان سے گلو خلاصی حاصل کر لیتے۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ (الشمس : ۹، ۱۰)

[بامراد ہو گیا جس نے اپنی جان کو پاک کر لیا اور یقیناً وہ نامراد ہوا جس نے اس کو دبا دیا]

تزکیہ نفس یا جان کو پاک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کو ان تمام آلائشوں سے بچایا جائے جو ادنیٰ ہیں، ارضی اور جسمانی ہیں، جن کا تعلق فسق و فجور سے ہے اور ان تمام جذبات و خواہشات سے ہے جو انسانی رُوح کو پرواز سے روکتی ہیں، نشو و نما اور رُوحانی ارتقا سے باز رکھتی ہیں۔ جس نے تزکیہ نفس کی منزل طے کر لی وہ بامُراد ہوا کامیاب اور سرخرو ہوا، اور جس نے نفس و روح کو خواہشات اور آرزوؤں کے جال میں پھنسا دیا اور ادنیٰ اور ارضی تقاضوں کی تکمیل کے سلسلے میں جان کو غیر معقول، غیر رُوحانی اور غیر ارتقائی فسق و فجور کی خواہشات کے انبار تلے دبا دیا وہ دُنیا و آخرت کی کامرانیوں سے محروم رہا اور نفع اندوزی کے بجائے گھاٹے اور خسارے میں رہا۔

تزکیہ نفس کے اسلامی مفہوم کو جاننے کے لیے اس حقیقت سے آشنا ہونا ضروری ہے کہ اس کے دو پہلو ہیں، ایک انفرادی اور ایک اجتماعی۔ انفرادی تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ گو یہ دنیا میں رہے اور جسم و جان کے رشتوں کو قائم رکھنے کے لیے سعی و کوشش کی ہر تدبیر آزمائے تاہم ان رشتوں سے اُونچا رہے، اپنا مطمح نظر بلند رکھے اور آسائش و آسودگی کی کسی بھی صورت سے براہِ راست تعلق خاطر نہ استوار کرے بلکہ رضائے الٰہی کو اپنا ہر حال میں مقصود قرار دے اور اس کے حصول کے لیے کوشاں

رہے۔ اجتماعی پہلو کے نقطہ نظر سے انفرادی اصلاح، انفرادی تزکیہ اور فرد کا ذاتی، اخلاقی و روحانی ارتقا کافی نہیں، اس کو قائم رکھنے اور پروان چڑھانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان ایسے اجتماعی اداروں کی بنیاد رکھے جو نیکی کو پھیلائیں، فسق و فجور کو مٹائیں اور گناہ و معصیت کے ماحول کو خیر سگالی، باہمی ہمدردی، انسان دوستی اور روحانی و اخلاقی ماحول میں تبدیلی کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہوں۔ نیکی اور برائی کی جڑیں دراصل اتنی فرد کے دائرۂ قدرت میں مرکوز نہیں ہوتیں جتنی کہ معاشرے کی گہرائیوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ دونوں باتیں یکساں صحت و صواب کی حامل ہیں کہ اگر فرد اپنی اصلاح آپ کرلے تو معاشرہ خود بخود سدھر جائے گا۔ اور اگر معاشرہ صحیح اور صالح اقدار پر مبنی ہو گا تو افراد بھی ترقی اور ارتقا کی راہ پر گامزن ہو جائیں گے

پھر اصلاح وارتقا کے ان دونوں پہلوؤں میں باہمی تفاعل اور تاثر آفرینی کا عمل جاری رہتا ہے۔ کبھی ایک نفس ذکیہ پورے معاشرے کے لیے نیکی اور خیر کا نمونہ بن جاتا ہے اور کبھی اچھا اور صالح معاشرہ بہت سے نفوس کو سنوار دینے کا موجب ثابت ہوتا ہے۔

د ع ع

دَعَّ الْيَتِيْم۔ یتیم کو دھتکار دیا، قساوت قلبی سے یتیم کو دھکا دے کر اپنے دروازے سے باہر نکال دیا۔ اساس البلاغہ میں زمخشری نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ ظلم و تعدی سے یتیم کو دھتکار دیا۔

جَفْنَةٌ مُدَعْدَعَةٌ۔ بھرا ہوا قدح۔

قرآن حکیم میں ہے :۔

فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ۔ (ماعون : ۲)

(سو وہ شخص ہے، جو یتیم کو دھکے دیتا ہے)

اس سے پہلے اس شخص کا ذکر ہے جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے وہ کون ہے، قرآن

کی زبان میں وہ وہ ہے جو اپنی عیش کوشیوں کے لیے تو روپیہ پانی کی طرح بہاتا ہے، لیکن اگر یتیم و مسکین کی مدد کرنا پڑے تو نہ صرف ہاتھ جھٹک کر الگ ہو جائے بلکہ ان کی مسکنت و غربت کا مذاق اُڑائے، ان کی تذلیل کرے اور ایسے لوگوں کو دھکے دے کر گھر سے نکال باہر کرے۔

اسلام کے نظام عدل و انصاف کا یہ تقاضا ہے اور ایمان بالآخرۃ کا یہ منطقی اقتضاء ہے کہ انسان اللہ سے ڈرے اور ہر حاجت مند سے اظہار ہمدردی کا اظہار کرے اور اسی غرض کے لیے کچھ اس طرح اپنے اقتصادی ڈھانچے کو ترتیب دے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی محتاج کو دستِ سوال دراز کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو اور نہ کوئی حاجت مند کسی صاحب ثروت کے دروازے پر جا کر اس کے رحم و کرم کی بھیک ہی مانگے۔

دَعَا پکارا، التجا کرنا، مدد طلب کرنا، دُعا کرنا، نام رکھنا۔

دَعُوْتُ فلانا۔ میں نے اس کو پکارا۔

مَا فِی الدَّارِ دَاعٍ وَلَا مُجِیْبٌ۔ گھر میں نہ کوئی پکارنے والا ہے، نہ جواب دینے والا۔

النبی داعی اللہ۔ نبی اللہ کا داعی ہے۔

دَعُوْتُہٗ زَیْدًا۔ میں نے اُسے زید کے نام سے پکارا۔

اَصَابَتْہُ دَوَاعِی الدَّھْرِ۔ اُسے زمانہ کے تغیرات نے اپنا ہدف ٹھہرایا۔

مَا دَعَاکَ اَنْ فَعَلْتَ کَذَا۔ تو نے ایسا کیوں کیا۔ تمہیں ایسا کرنے پر کس چیز نے مجبور کیا۔

تَدَاعَتْ عَلَیْہِ الْقَبَائِلُ۔ اس پر قبائل ٹوٹ پڑے۔

تَدَاعَتْ عَلَیْھِمُ الحیطان۔ اس پر چھت کی دیواریں آ گریں۔

کاعاہ۔ جھگڑا کرنا۔

تَدَّعَتِ النَّائِحَۃُ۔ نوحہ کرنے والی، باآواز بلند نوحہ کیا۔

اِسْتَدْعَاہُ۔ اس کو پکارا۔

اَلدُّعَاءُ۔ دعا کا مصدر۔ پکارنا، حاجت روائی کے لیے اللہ سے دُعا کرنا۔

الدَّعْوَةُ - پکار، قسم، پیغام۔
الدَّعْوٰی - مقدّمہ، دعویٰ
الدَّعِیُّ - لے پالک، وہ شخص جس کا نسب معلوم نہ ہو۔

قرآن حکیم میں ہے :-
وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ لا۔ (بقرہ : ۱۸۶)
[اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو میں قریب ہی ہوں، دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں]۔
اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ (ابراھیم : ۲۹)
[بے شک میرا رب دعاؤں کو خوب سننے والا ہے]
وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ (المؤمن : ۶۰)
[اور تمھارے پروردگار نے کہا ہے مجھے پکارو میں تمھاری درخواست قبول کروں گا]
اِنَّکَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ۔ (آل عمران : ۳۸)
[تو دعا کو شرف قبول بخشنے والا ہے]

ایک ہی مضمون کی یہ آیات ہم نے اس لیے یک جا درج کر دی ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ دعا اور اس کی قبولیت و پذیرائی کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ پہلے خدا کے متعلق یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ وہ کائنات سے، انسان سے، اور اپنے بندوں سے لاتعلق اور بیگانہ حقیقت کا نام نہیں ہے، اس کی تجلیات ربوبیت، اس کے عکوس رحم و کرم اور اس کے دریائے محبت و کرم سے اُٹھنے والی لہریں اور موجیں، ان سب کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ بھلا وہ ذاتِ اقدس، جو اس عالم اور عالم انسانی کی تخلیق و آفرینش کا سرچشمہ ہے، اس کی دیکھ بھال، اس کی پرورش اور نشو و نما اور اس کی جملہ ضرورتوں اور حاجتوں میں اس کی رہنمائی اور کفالت سے کیونکر دست بردار ہو سکتی ہے؟ اور اس سے بیگانگی اور غیر جانبداری کا

سلوک کیونکر روا رکھ سکتی ہے؟

ہم کمزور اور محدود القویٰ انسان جب اپنے بچّوں کا خیال رکھتے ہیں اور اپنی تخلیقاتِ فنی کے شاہ پاروں کی تکمیل و اتمام کے ہمہ وقت درپے رہتے ہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو لامحدود قوتوں کا مالک ہے وہ اپنی مخلوق سے سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہ رکھتا ہو، ان کی ضرورتوں کی طرف مطلق دھیان دینے والا نہ ہو، اور اپنے بندوں سے جن کو اس کی آقائی و خداوندی پر فخر و ناز ہے کسی طرح کا واسطہ اور رابطہ رکھنے کا روادار نہ ہو۔

خدا تعالیٰ کے باب میں یہ سوءِ ظن نہ صرف جہل و نادانی کا کرشمہ ہے بلکہ واضح طور پر خدا کے وجود باجود کی نفی و انکار کے مترادف ہے۔

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ کے اسی تصوّر کو نکھار کر بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی دُعاؤں کو سُنتا ہے، اُن کو شرفِ پذیرائی بخشتا ہے۔ اور یہ کہ یہ اس کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لیے مشکل کشا ثابت ہو۔ یہی نہیں ہر آڑے وقت میں، ان سے وہ براہِ راست تعاون کرے، ان کی رہنمائی کرے اور ان کے درد اور دُکھ کا مداوا ثابت ہو۔ کیونکہ یہی تو وہ توقع اور آرزو ہے، جو محدود اور غیر محدود میں، تعلق کو قائم رکھنے والی شئے اور رابطہ ہے۔ خدا ان آیات میں کھلے لفظوں میں اپنے بندوں کو یقین دلاتا ہے کہ تم مانگو تمھیں دیا جائے گا۔ تم اس کے بابِ رحمت پر دستک دو، تمھارے لیے کواڑ کھولے جائیں گے تمھاری دُعاؤں اور درخواستوں کو بکمال شفقت منظور کیا جائے گا۔ ایمرسن نے اسی حقیقت کو اپنے ایک ادبی شہ پارہ میں یوں بیان کیا ہے:۔

"دیکھو میں اس کے قصرِ جمال کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ ابھی دروازہ کھٹکھٹاؤں گا اور میرا دوست دروازہ کھول کر مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے جائے گا اور پھر ہم اکٹھے بیٹھ کر عشائے ربانی کی مئے ایک ایک گھونٹ کر کے اپنے حلقوم میں اُتاریں گے۔"

جو لوگ دُعا کی قبولیت کے قائل نہیں وہ غور کریں ان کا خدا ایمرسن کے دوست کے مقابلے میں کتنا چھوٹا، کتنا گیا گزرا، اور کم درجے کا شخص ہے جو نہ اپنے دوست کی آواز سنتا ہے، نہ اس کو اپنے حریم محبت و تودد کے قریب پھٹکنے دیتا ہے اور نہ اس کی محبت و عبودیت کا جواب یکساں محبت و ہمدردی سے دینے کا عادی ہی ہے۔

بات یہ نہیں! قرآن میں اللہ تعالیٰ کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ ایمرسن کے اس تصور دوستی سے کہیں اونچا ہے اس لیے کہ اس میں ڈرائنگ روم اور پھاٹک کے مابین جو فاصلہ ہے وہ سرے سے مفقود ہے۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ (ق: ۱۶)

[اور ہم تو اس کی رگِ گردن سے بڑھ کر اس کے قریب ہیں]

یعنی اس کی تجلیاتِ رحمت و شفقت کا ڈرائنگ رُوم تو ہمارے اندر جلوہ کناں ہے اور آراستہ پیراستہ صورت میں موجود ہے۔ جس نے اس حقیقت کو جان لیا اس پر یہ حقیقت مخفی نہیں رہے گی کہ اس کے بندے جب چاہیں اس ڈرائنگ روم میں معرفت و تقرب کے جام نوش کر سکتے ہیں۔ اعتماد، یقین اور کردار و عمل کی پاکیزگی و اخلاص البتہ شرط ہے اور پھر دُعا کی پذیرائی و قبولیت کا تعلق صرف ان نصوص ہی سے نہیں ہے۔ یہ ایک تجربہ اور واقعہ بھی ہے جس سے انبیاء، صحابہ، صلحا اور اس کے متعدد پاک بندے اکثر دوچار ہوئے ہیں اور شاید ہر شخص کی زندگی میں ایسے مرحلے یقیناً آئے ہیں جب دُعا کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمتیں جوش میں آئی ہیں اور اس کے نتیجے میں گور ِلب بیماروں نے شفا پائی ہے۔ مایوس حاجتمندوں کی ضروریات خلاف توقع پوری ہوئی ہیں اور انسان نے حقیقتاً محسوس کیا ہے کہ میں اس دنیا میں تنہا اور بے بس نہیں ہوں، بلکہ میرے ساتھ، میرا خدا ہے جو ہر آڑے وقت میں میری اعانت و نصرت پر آمادہ ہے۔ ہاں دُعا اور قبولیت کے بارے میں چند نکات اور شرائط کا ملحوظ رکھنا البتہ بہت ضروری ہے۔

۱۔ سب سے پہلے اس باب میں اس نکتے کو ملحوظ و مرعی رکھنا چاہیے کہ اللہ

سے دعا کرنا بجائے خود بندوں کے لیے کتنا بڑا اعزاز ہے کہ وہ اپنے آقا و مولا سے شرف تخاطب حاصل کر رہے ہیں یعنی ایک محدود انسان، لامحدود ہستی سے اپنا رشتہ نیاز استوار کر رہا ہے اور محدود اور سمٹے ہوئے دائرۂ اختیار سے نکل کر لاہوت کی لامحدود پہنائیوں، رحمتوں اور برکتوں میں شمولیت اختیار کر رہا ہے۔

۲۔ پھر مخلصانہ دُعا میں جو روحانی لذتیں اور نگہتیں ہیں ان سے بہرہ یاب ہو رہا ہے۔ دعا میں کیا لذتیں اور نگہتیں پنہاں ہے، اس کو کسی صاحب دل سے پوچھیے۔

۳۔ علاوہ ازیں انسان اس انداز سے دُعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے محوِ گفتگو ہوتا ہے کہ اس سے اس کی اندرونی اور باطنی قوتیں نہ صرف بیدار ہوتی ہیں بلکہ مادی اسباب و علل پر غلبہ پا لیتی ہیں۔ یہی نہیں، انسان کی دُعا اس کو اس نقطۂ اتصال و عروج پر پہنچا دیتی ہے جہاں اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے چشمۂ رحمت و کرم سے چھلکنے والی لہریں اور موجیں آملتی ہیں اور اسباب و علل کا کارخانہ ربِ اسباب و مسببات کی تکوینی مصلحتوں سے پوری طرح ہم آہنگی اختیار کر لیتا ہے۔

۴۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر دُعا بلفظہ پوری ہو جائے۔ بسا اوقات انسان اللہ سے وہ شئ طلب کرتا ہے جو ادنیٰ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اُسے وہ چیز عطا کرتا ہے جو اس سے کہیں اعلیٰ اور خوب تر ہوتی ہے۔

۵۔ دُعا اپنے فائدے کے لیے ہونی چاہیے، کسی کو نقصان اور ضرر پہنچانے کے لیے نہیں ہونی چاہیے۔

۶۔ آدابِ دُعا میں بنیادی چیز یہ ہے کہ جب کوئی مشکل پیش آئے سب سے پہلے انسان اللہ کی جانب رجوع ہو اور پھر اسباب کی جانب۔

۷۔ دُعا کے ساتھ ساتھ اسباب سے بھی تعرض کرنا ضروری ہے۔ لیکن اسباب ہی کو فیصلہ کن نہیں سمجھنا چاہیے۔ فیصلہ کن شئ ہستی ربِ اسباب ہے۔

دف ء

دِفْءٌ - حرارت، گرمی، ذریعہ حرارت۔

رَجُلٌ دَفِئٌ - کپڑوں سے گرمی حاصل کرنے والا شخص۔

بَيْتٌ دَفِيٌّ - گرم گھر۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ (نحل: ۵)

[اور چوپائے بھی اسی نے بنائے۔ ان میں تمھارے گرم لباس بھی اور بھی فائدے ہیں اور ان میں تم کھاتے بھی ہو]

یعنی اللہ تعالی نے ان تمام چوپایوں کو پیدا کیا ہے، جن میں بعض کو تم پوجتے ہو۔ یہ تمھارے نفع کے لیے ہیں پوجنے کے لیے نہیں۔ اُن کے اُون سے تم اپنی گرم پوشش تیار کرو، خیمے اور ڈیرے بناؤ، یا اگر یہ حلال ہیں تو اُن کا گوشت کھاؤ، اس کے علاوہ بھی ان میں متعدد فائدے پنہاں ہیں جن سے استفادہ کر سکتے ہو۔

اِس آیت میں ایک تو شرک کی نفی کی گئی ہے۔ دوسرے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کائنات کی ہر شئے خیر، منفعت اور فوائد کی ایک دُنیا لیے ہوئے ہے۔ اب یہ تمھارا کام ہے کہ فکر و تجربہ سے ان میں پنہاں فوائد کو ڈھونڈو اور اُن کو اپنے کام میں لاؤ۔ زندہ قوموں کا یہی شعار ہوتا ہے کہ وہ کائنات میں پائے جانے والی ہر شئے کا مطالعہ کرتی ہیں اور ان میں مضمر فوائد کو دریافت کر کے بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے وقف کر دیتی ہیں۔

دف ع

دَفَعَ - ہٹایا، دُور کیا۔

دَفَعْتُهٗ عَنِّی - مَیں نے اُسے اپنی ایذا دہی سے ہٹایا، باز رکھا۔

دَفَعَ اللہُ الْمَکْرُوْہَ عَنْكَ - اللہ تم کو تکلیف و ایذا سے محفوظ رکھے۔

۸ - دعا جہاں زبان سے نکلے، وہاں دل کی گہرائیاں بھی اس کا ساتھ دیں، اور اگر اس دعا میں چشم بھی شبنم افشانی کرے تو سبحان اللہ۔

۹ - دُعا اگر قبول نہ ہو تب بھی اسے جاری رکھنا چاہیے تاکہ معبود کے ساتھ تعلق عبودیت قائم رہے۔

بعض کوتاہ نظر حضرات دُعا کی پذیرائی اور قبولیت کے بارے میں یہ سطحی اعتراض پیش کرتے ہیں کہ جب ہر شے اللہ کے دائرۂ علم میں پہلے سے مقرر و مرتب ہے تو دُعا سے فائدہ؟ نیز جب اسباب و علل کا دائرہ متعین ہے تو دُعا سے اس میں تغیر کا اُبھرنا کیوں کر ممکن ہے؟

جواب بہت سادہ اور صحیح ہے کہ جو شے اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم میں پہلے سے طے شدہ ہے اس میں یہ بھی طے شدہ ہے کہ فلاں وقت میرا ایک بندہ اپنی حاجت روائی کے لیے مجھے پکارے گا اور میں اس کی درخواست سنوں گا اور اُسے پورا کروں گا۔

رہی اسباب و علل کی بات تو اس میں دو باتیں سمجھنے کی ہیں۔

۱ - اسباب کا دائرہ کار صرف مادیات تک محدود نہیں، بلکہ رُوحانی اسباب بھی شامل ہیں۔

۲ - دعا سے علل و اسباب کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ اسباب سے رجوع ضرور کیا جائے۔ لیکن اس حقیقت کو ایک دقیقہ کے لیے بھی فراموش نہ کیا جائے کہ جس ذاتِ گرامی نے ہماری بھلائی اور کائنات کے نظم ونسق کو برقرار رکھنے کی غرض سے اس سلسلہ اسباب کو پیدا کیا ہے اسی کی رحمت وکرم نے دُعا کو بھی قبولیت و پذیرائی کا ایک مؤثر ذریعہ ٹھہرایا ہے۔

دُعا اور مادی اسباب میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں مادی اسباب ساتھ نہیں دیتے اور انسان مایوسیوں کی گھنی تاریکیوں میں کھو کر بسا اوقات خودکشی پر مجبور ہو جاتا ہے وہاں دُعا آخرت وقت تک امید بقا، اُمید کامرانی، اور اُمید فتح ونصرت کی قندیلوں کو روشن وتابندہ رکھتی ہے۔

دَفَعَ اِلَیهِ مَالَهُ۔ اپنا مال اس کے سپرد کر دیا۔
جَاؤُا دَفعَةً۔ وہ سب بیک وقت آئے۔
فُلَانٌ مُدَفَّعٌ مُدَفَّعٌ۔ وہ فقیر ہے، جسے لوگ دھکے دے کر اپنے گھر سے باہر نکال دیتے۔
اِندَفَعَ السَّیلُ۔ زور سے بہ نکلا۔
اِندَفَعَ الرَّجُلُ فِی الکَلَامِ۔ گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ باتیں کرنے لگا۔

قرآن حکیم میں ہے :۔
وَلَولَا دَفعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعضَهُم بِبَعضٍ لَّهُدِّمَت صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذکَرُ فِیهَا اسمُ اللّٰهِ کَثِیرًا۔ (حج : ۴۰)
[اور اگر اللہ لوگوں کا زور ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو نصاریٰ کی خانقاہیں اور عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے منہدم ہو گئے ہوتے]

اس آیت میں جہاد کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے کہ اس کی اگر مشروعیت نہ ہوتی اور ان سرکشوں، متمردوں اور فرعونوں کا زور اہل حق، سیف وسنا اور قوت سے نہ توڑتے، ان کے حملوں اور ریلوں کو نہ روکتے اور ان کا جواب حشمت وشجاعت سے نہ دے پاتے تو کوئی عبادت گاہ محفوظ نہ رہتی۔ نہ عیسائیوں کی عبادت گاہیں باقی رہتیں، نہ یہودیوں کے صومعے ظالموں کے دستِ تظلم سے بچتے اور نہ وہ مسجدیں ہی اپنا وجود قائم رکھ پاتیں جن میں اللہ تعالیٰ کا اخلاص اور کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جہاد بقائے حق کا ضامن ہے، جو قومیں جذبۂ جہاد سے محروم ہو جاتی ہیں وہ اپنے تمام دینی، دنیوی اور اجتماعی حقوق سے محروم ہو جاتی ہیں۔ یعنی باطل، ظلم اور تعدّی کے خلاف برسرپیکار رہنا ہر اس قوم کا فریضہ ہے جو اپنے دینی وتہذیبی تشخص کو قائم و تابندہ رکھنے کی خواہاں ہیں۔

جہاد اللہ کی سنت مستمرہ ہے جو ہمیشہ جاری رہے گی، اور اس کی وجہ سے کسی ظالم کو جرأت نہ ہوگی کہ حق کا گلا گھونٹ سکے، سچائی کو موت کے گھاٹ اتار سکے اور

روشنی کو تاریکیوں اور ظلمتوں سے بدل سکے۔

اس آیت میں یہ مژدہ بھی مضمر ہے کہ چاہے کوئی بھی دین او رنظریہ حیات مٹ جائے اور اپنا بھرم کھودے وہ دین بہرحال نہیں مٹے گا جس میں اللہ کے کلمہ کو بلند کیا جائے۔ جس میں کثرت سے اس کا نام لیا جائے اور اس کے ساتھ ذکر و فکر اور عشق و محبت کا مستحکم رشتہ استوار کیا جائے۔ یعنی کچھ بھی ہو جائے ذکرِ الٰہی کی قندیلیں ہمیشہ دمکتی رہیں گی۔

دف ق

دَفَقَ۔ پانی کا گرنا، زور سے بہہ نکلنا، لازم و متعدی دونوں معنوں میں آیا ہے۔

دَفَقَ النَّهرُ۔ نہر اس طرح بہہ نکلی کہ پانی کناروں تک اُچھلنے لگا۔

اِنْدَفق الما۔ پانی بہہ نکلا۔

مَاءٌ دَافِقٌ۔ پانی جو اچھل کر گرے۔

جَاءَ الْقَوْمُ دُفْقَةً۔ سب کے سب ایک دم آدھمکے۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ (طارق: ۶)

[وہ ایک اُچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے]

سیاقِ آیت، اثباتِ معاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انسان کو دعوت فکر و نظر دی ہے کہ وہ اپنے آغاز پر غور کرے، وہ مادہ منویہ جو اس کی تولید و آفرینش کا باعث ہوا۔ اپنی ابتدائی منزل میں صرف تغذیہ تھا، جس میں زندگی، شعور اور ادراک و فہم کی صلاحیتوں کا دُور دور تک پتا نہیں چلتا۔ پھر یہی تغذیہ مادّۂ حیات کا سبب بنا اور بالآخر یہ مادّہ حیات رحمِ مادر میں ایک جیتے جاگتے مولود کی شکل میں ڈھل گیا۔ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ آغاز میں جب عدمِ حیات و شعور نے زندگی اور شعور کی شکل اختیار کر لی تو انجام اس انداز کا کیوں نہیں ہو سکتا کہ کتمِ عدم سے نکلا انسان دوبارہ وجودِ حیات

کی انگڑائیوں سے آشنا ہو سکے۔

دک ک

دَکَّ - دیواریں گرا کر زمین کے برابر کر دینا۔ کوٹنا پیٹنا ۔ریزہ ریزہ کر دینا۔

دَکَّ الْبِئْرَ- کنواں مٹی سے پاٹ دینا۔

دَکَّ الدَّابَۃَ - جانور کو بھگا کر تھکا دیا۔

دَکَّہُ الْمَرَضُ - اس کو بیماری نے ہلکان کر دیا۔

اِلدِّکَۃَ - ازار بند۔

اَلدُّکَّانُ - چبوترہ. دکان -

نہج البلاغہ میں ہے :-

وَدَکَّ بَعْضُھَا بَعْضًا من ھَیْبَتِہٖ جَلَالِہٖ۔

زمین کا بعض حصہ ہیبت جلال الٰہی سے زمین کے بعض حصے کو کوٹ کر ہموار کر دے گا

قرآن حکیم میں ہے :-

وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُکَّتَا دَکَّۃً وَّاحِدَۃً ۝ (الحاقۃ : ۱۴)

(اور زمین اور پہاڑ اُٹھا لیے جائیں گے یہ دونوں ایک دفعہ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے]

یہ زمین، یہ پہاڑ، یہ نجوم و کواکب سے یہ آراستہ پیراستہ آسمان ایک دن فنا کے گھاٹ اُتر جائے گا۔ یہ کب ہوگا، اس کا عِلم صرف باری تعالیٰ کو ہے۔ یوں ہر وقت یہ امکان ہے کہ یہ دنیا، اپنی تمام ترا ستواریوں کے بعد فنا ہو جائے، اور اس کے بدلے میں ایک نئی دُنیا آباد ہو جہاں ہر شخص کو اس کے عقیدہ و فکر اور عمل و کردار کے مطابق زندگی کے لبسر کرنے کے مواقع حاصل ہوں۔ یہ عالم دراصل ایک درس گاہ ہے جس نے یہاں رہ کر عبرت و موعظت، غور و تدبّر اور پاکیزگیٔ قلب و ذہن کا سامان فراہم کر لیا۔

وہ اس عالم جاودانی میں بھی کامیاب وکامران رہا، اور جس نے یہاں خسران اور گھاٹے کے سوا کچھ حاصل نہ کیا وہ یہاں بھی محرومیوں، اذیتوں اور تکلیفوں کے سوا کچھ پا نہ سکے گا۔

دل ک

دَلَكَ ۔ ملنا، رگڑنا، مائل بہ غروب ہونا، آفتاب کا ڈھلنا۔
دَلَكَہُ الدَّھْرُ ۔ زمانے کی رگڑنے اسے آزمودہ کار بنادیا۔
دَلَكَ الغَرِیْمَ ۔ قرض خواہ کو ٹالنا۔
دَلَكَ الثَّوبَ ۔ کپڑے کو دھونے کے لیے ملنا۔
بَعِیْرٌ مَدْلُوْكٌ ۔ اُونٹ جو سفر کا عادی ہو۔
دَلَكَتِ الشَّمْسُ ۔ سورج ڈھلا، مائل بہ غروب ہوا۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ۔
(بنی اسرائیل: ۷۸)

[نماز ادا کیجیے آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کے اندھیرے ہونے تک۔ صبح کی نماز بھی]

اس مختصر سی آیت میں نمازوں کے پانچوں اوقات آگئے۔ پہلی نماز فجر ہے جو طلوع آفتاب سے قبل پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا، اس کا بڑا درجہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی برکات وانوار اور ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ دوسری نماز ظہر ہے اور تیسری عصر۔ یہ دونوں نمازیں، دلوک شمس کے ضمن میں آگئیں۔ اس لیے کہ ظہر کے وقت بھی اور عصر کے وقت بھی دلوک، یعنی غروب کی طرف اس کا میلان ہوتا ہے۔ مغنی اللبیب میں ہے کہ حرف "لام" توقیت کے لیے بھی آتا ہے یعنی یہ ہوں گے۔ کلما دَلَکَتِ الشَّمْسُ۔ یعنی جب جب آفتاب ڈھلے، آپ نماز پڑھیں۔ "غَسَق" کا لفظ بھی دو مرحلوں میں

اتمام پذیر ہوتا ہے۔ ایک اُس وقت جب آفتاب غروب ہو جائے اس سے نماز مغرب کی تعیین ہوئی، دوسرے جب اندھیرا پوری طرح چھا جائے اس سے نماز عشاء کا تقرّر ہوا۔

د ل ل

نمازیں پانچ ہی ہیں۔ اس بارے میں اُمّت میں کسی بھی دور میں کوئی اختلاف رُونما نہیں ہوا۔ آنحضرت سے لے کر تمام دنیائے اسلام میں آج تک تسلسل کے ساتھ ان فرائض کو مقررہ پانچ اوقات میں ادا کیا جاتا ہے۔ قرآن میں احکام و فرائض کا کیا نقشہ مذکور ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھیں کہ جس شخصیت گرامی پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے، اس نے اس نقشے کو کس انداز میں سمجھا اور اس پر عمل کیا۔ اس دور کے معاشرہ نے اس نقشے کو کس طرح اپنے عمل و کردار میں سمو کر دکھایا۔ اور پھر تواتر و تسلسل کے ساتھ یہ نقشہ ہم تک کیونکر پہنچا۔ قرآن تاریخ کی روشنی میں نازل ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ایک فعال تاریخی عمل کو جنم دیا جو اپنی تمام تر کڑیوں کے ساتھ دنیا کے سامنے موجود ہے اس لیے یہ بالکل غیر منطقی حرکت ہے کہ قرآن کو مسلمہ تاریخی سیاق سے الگ کر کے دیکھا جائے اور اس کی من مانی تاویلیں کی جائیں۔

دَلَّ - راستہ دکھانا، رہنمائی کرنا، دلالت کناں ہونا دلیل وہ شئ یا نشان ہے جس سے مقصود کا پتہ چل سکے۔ ناز و نخرہ کرنا، نفر کرنا۔

اِستَدَلَّ۔ استدلال کیا۔

دَلَالَۃٌ۔ رہنمائی۔

دَلٌّ۔ ناز و ادا۔

الدَّال عَلَى الخَيرِ كَفَاعِلِه۔ نیکی کی نشان دہی کرنے والا اس طرح ہے جیسے خود اس نے نیکی کی ہو۔

دَلَّهٗ عَلَى الصِّرَاطِ المُستَقِيم۔ اس کو سیدھی راہ بتائی۔

ولِي عَلٰى هٰذا دَلَائِلُ۔ میرے پاس اس کے دلائل ہیں۔

اَدِلَّةُ العقل۔ عقلی دلائل۔

اَدِلَّةُ السَّمعِ۔ روایتی دلائل۔

قرآن حکیم میں ہے :-

مَا دَلَّهُمْ عَلٰی مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ - (سبا : ۱۴)

[تو کسی چیز نے ان کی موت کا پتہ نہ بتایا بجز ایک زمینی کیڑے کے -]

حضرت سلیمان کے بارے میں ہے کہ جب ان کو اس بات کا احساس ہوا کہ موت کا مقررہ وقت آن پہنچا ہے تو عصا سے ٹیک لگا کر، اپنی کرسی پر بیٹھ گئے - اسی اثنا میں ان کا انتقال ہو گیا اور ایک عرصے تک ہیکل کے ان مزدوروں کو جو ہیکل کی تعمیر میں مصروف تھے، یہی دکھائی دیتا رہا کہ حضرت سلیمان ان کے کام کی برابر نگرانی کر رہے ہیں - ان کو موت کا علم عین اس وقت ہوا جب دیمک نے چاٹ کر عصا کو کھوکھلا کر دیا اور حضرت سلیمان کرسی سے زمین پر آ رہے - اس وقت ان کی غیب دانی کا بھرم کھل کر ان کے سامنے آ گیا - اس مرحلے پر یہ کف افسوس ملنے لگے اور بے اختیار کہنے لگے کہ اگر ہمیں پہلے سے ان کی موت کا علم ہوتا تو اس بیگار کی ذلّت سے نجات پا جاتے - حضرت سلیمان کی پُر شکوہ اور پُر جلال شخصیت، اساطیر یہود میں اس طرح گھری ہوئی ہے کہ ان سے کسی تاریخی شخصیت کا ٹھیک اندازہ کرنا مشکل ہے - اتنا بہر حال مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوّت و شوکت کی فراوانیوں کے ساتھ حکمت و دانش کے خزائن سے بھی انھیں نواز رکھا تھا - ان کی طرف منسوب گیت، امثال، اور حِکم تورات میں مذکور ہیں جو غالباً، ان کی موت کے کچھ عرصے بعد تک مختلف مرحلوں میں ترتیب پائے - ان میں عشقِ الٰہی کو بکمال شاعرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے -

یہ "جن" کون تھے جن کو ہیکل کی تعمیر میں استعمال کیا گیا - بائبل سے معلوم ہوتا ہے، اس سے مراد وہ اجنبی، غیر مہذب اور طاقت ور قومیں تھیں، جو حضرت سلیمان کی قلمرو میں تو شامل تھیں مگر ان پر ایمان نہیں لائی تھیں - قرآن میں جن ان معنوں کہیں استعمال نہیں ہوا - قرآن کے نقطۂ نظر سے یہ مستقل نوع ہے جو انسانوں سے مختلف ہے اور ان کی آنکھوں سے اوجھل ہے - عرب ان کو پوجتے تھے اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ عالم الغیب ہیں - اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسانوں

کی طرح ان کا علم بھی محدود ہے اور یہ کسی طرح غیوب پر مطلع نہیں۔

دل و (ی)

دَلْوٌ - ایک آسمانی بُرج کا نام، مُصیبت۔

اَدْلَیْتُ دَلْوِی - مَیں نے اپنا ڈول کنوئیں میں ڈالا۔

دَلَوْتُ دَلْوِی - مَیں نے ڈول کنوئیں سے کھینچا۔

دَلَوْتُ حَاجَتِیْ - مَیں نے اپنی حاجت پیش کی۔

اَدْلٰی بِحُجَّتِہٖ - اس نے اپنی دلیل پیش کی۔

اَدْلَ بِہٖ اِلَی الْحُکَّام - حکام تک اپنی بات پہنچائی۔

تَدَلّٰی - قریب ہوا۔

اُدْلُ دَلْوَکَ فِی الدِّلَاءِ - اپنی سی کوشش کر دیکھو۔

قرآن حکیم میں ہے:-

وَجَاءَتْ سَیَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰی دَلْوَهٗ ؕ قَالَ یٰبُشْرٰی هٰذَا غُلٰمٌ ؕ (یوسف: ۱۹)

[اور ایک قافلہ آنکلا، سو ان لوگوں نے اپنا سقہ بھیجا اور اس نے اپنا ڈول ڈالا اور بول اٹھا ارے واہ واہ یہ تو ایک لڑکا نکل آیا۔]

حضرت یوسفؑ سے متعلق ہے کہ برادران یوسفؑ نے انھیں جس کنوئیں میں پھینک دیا تھا اتفاقاً ادھر سے ایک تجارتی قافلہ جو مصر یا صنعا جا رہا تھا وہاں آرکا - پانی پینے کے لیے اس میں ان کے سقے نے جب ڈول ڈالا تو یہ دیکھ کر خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں کہ یہ تو بڑا خوبصورت لڑکا ہے جو ڈول کے بجائے رسّی کے سہارے باہر نکل آیا ہے۔ خدا کی قدرت و کرم دیکھیے کہ بھائیوں نے از راہِ حسد جس کو کنوئیں میں پھینک دیا تھا، اللہ نے نہ صرف اس کنوئیں سے ان کو نکلوایا بلکہ ان کے سر پر اقتدار کا تاج بھی سجایا۔

قرآن حکیم میں ہے:-

عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰیۙ ذُوْمِرَّةٍؕ فَاسْتَوٰیۙ وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰیؕ
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰیۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰیۚ فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ
مَاۤ اَوْحٰیؕ (نجم: ۵-۱۰)

[انھیں بڑی قوت والا فرشتہ سکھاتا ہے، پیدائشی طاقت ور۔ پھر وہ نزدیک ہوا سو دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا، بلکہ اور بھی کم، پھر اللہ نے اپنے بندے پر وحی نازل کی جو کچھ کہ نازل کیا]۔

کفارِ مکہ نبوت کو کہانت کی اعلیٰ صورت قرار دیتے تھے۔ قرآن کی اس آیت میں اس حقیقت کی نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آنحضرتؐ پر نبوت وہم کلامی کا جو فیضان ہوتا ہے اس کو کہانت سے کوئی نسبت نہیں۔ یہ فیضان براہِ راست ایک تجلّی مجسم کے ذریعہ سے ہوتا ہے جسے جبرئیلؑ کہتے ہیں۔ یہ تجلی اتنی حسین، مکمّل اور مستحکم ہے کہ اس پر شیاطین اور جنات اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ پھر اس سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب یہ تجلی روحانیت کے افق اعلیٰ پر نمودار ہوئی اور قلبِ پیمبر کے افق عبدیت و بشریت کے قریب تر ہوتی گئی یہاں تک کہ بشریت کے سارے حجابات اُٹھ گئے اور آنحضرتؐ نے بہت قریب سے اس تجلّی سے استفادۂ انوار کیا۔ یہ وہ وحی ہے جو آنحضرتؐ پر نازل ہوتی ہے، اس میں بشریت کی ہوا وہوس کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے ہم کلام ہوتا ہے اس لیے وہ جو بھی شریعت کے بارے میں کہتا ہے، اس سطح اور افق سے کہتا ہے، جہاں فیضان الٰہی کی تجلیات قلبِ پیمبر کی گہرائیوں میں دمک اور پھیل جاتی ہیں۔ یہ ہمکلامی یا تعلیم صرف قرآن حکیم تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اس کی ضیا افروزیوں سے پیمبر کی پوری زندگی، پورا کردار اور صبح ومسا کے تمام مشاغل متاثر ہوتے ہیں اور رضائے الٰہی میں ڈھل جاتے ہیں۔ پیغمبر اور قرآن میں جو نسبت رونما ہے وہ صرف متن وشارح کی نہیں ہوتی، بلکہ اس متن کی ہوتی ہے جس نے مکمل ترین زندگی کا روپ دھار لیا ہے، ان الفاظ وحروف کی، جو پیغمبر کے اسوۂ حسنہ پر دلالت کناں ہیں مختصر

لفظوں میں یوں کہیے کہ اگر قرآن حکیم تجسیم اختیار کر لے تو اس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں گے، اور اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو الفاظ و حروف کی اصطلاحوں میں سمجھنا چاہیں تو وہ آنحضرت کی ذات گرامی ہو گی۔ یعنی آنحضرتؐ کی ذات کا پھیلاؤ، قرآن ہے اور اس کا ایجاز قرآن ــــ قرآن اور آنحضرت کی سیرت طیبہ، ایک ہی حقیقت کے دو پرتو ہیں، ایک کا تعلق، وحی جلی سے ہے اور دوسرے کا تعلق وحی خفی سے ہے۔ وحی ہونے میں بہر حال دونوں پہلو برابر ہیں، بلکہ صحیح تر تعبیر یہ ہے کہ اصل شئی نبوت ہے، اس کا ایک انعکاس کتاب ہوتا ہے اور دوسرا اس پر عمل ــــ عمل کو اگر وحی و تنزیل کے مقدس دائرے سے خارج کر دیا جائے تو خود کتاب اور متن کی قدر و قیمت گھٹ کر ایک ذاتی روحانی تجربے کی سی رہ جاتی ہے۔ عمل ہی یہ بتاتا ہے کہ اس کتاب کے تہذیبی، ثقافتی، روحانی، آفاق و ابعاد کے حدود کہاں سے کہاں تک وسعت پذیر ہیں۔

دم دم

دَمْدَمَ ۔ صحاح میں ہے، دَمْدَمْتُ الشَّیْءَ ۔ میں نے اس کو ہلاک کر کے زمیں بوس کر دیا، صاحبِ قاموس نے، اس کے معنی، عتقیب کے کیے ہیں۔ علامہ راغب نے کسی شئی کو ہلاک کر دینے کے معنوں میں اسے استعمال کیا ہے۔

قرآن میں یہ لفظ ایک مرتبہ آیا ہے۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوَّاهَا ۔ (شمس : ۱۴)

[تو ان کے پروردگار نے ان پر ان کے گناہ کے سبب ہلاکت نازل کی]

قوم ثمود، شمالی عرب میں آباد تھی اور اپنے زمانے میں فن تعمیر، ہندسہ اور ریاضی اور سنگ تراشی میں مشہور تھی۔ ان میں حضرت صالح کو ان کی روحانی و اخلاقی اصلاح کی خاطر بھیجا گیا۔ جنھوں نے معمول انبیا کے مطابق انھیں توحید کی طرف دعوت دی اور اصنام پرستی کی مضرتوں سے روکا۔ انھوں نے حضرت صالح کی کھل کر تکذیب کی اور معجزہ دکھانے کا مطالبہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مطالبے کو پورا کر دیا۔ ایک اونٹنی خرق عادت

کے طور پر پہاڑ سے برآمد ہوئی، جس کے بارے میں حضرت صالح نے ان سے کہا کہ یہ اللہ کی نشانی ہے، اسے آزادی سے چراگاہوں میں گھومنے پھرنے دو۔ اگر کسی نے اسے روکا، تو سمجھ لو کہ اس نے عذاب الٰہی کو دعوت دی۔ انھوں نے ازراہِ سرکشی نہ صرف اس کو آزادانہ گھومنے پھرنے سے منع کیا بلکہ پکڑ کر ذبح کر ڈالا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر آیا اور ان کی آباد اور بارونق بستیوں کو برباد کر دیا گیا اور ان کی فنی و تعمیری مہارت ان کے کسی کام نہ آئی۔ قوموں کے عروج و زوال اور بقا و فنا کے اصول قرآن کے نقطہ نظر سے اس کے اپنے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ عروج و زوال یا بقا کا تعلق عمرانیات کے دراصل اس پیمانہ سے ہے کہ کون قوم احکام الٰہی کی تعمیل کرتی ہے، خیر اور نیکی کے لیے کوشاں رہتی ہے اور اپنی تمام تر مادّی ترقیات کا رُخ قوانین الٰہیہ کی اطاعت و متابعت کی جانب منعطف کرتی رہتی ہے اور کون قوم اساسی، اخلاقی و روحانی تقاضوں سے منحرف رہ کر محض مادّی قوتوں اور علوم و فنون کے ارتقا کے بل پر تہذیب و تمدن کے بلند بام ایوان تعمیر کرتی ہے۔ روح کی زندگی، دل کی زندگی، اہداف و ابعاد کی زندگی، اصل زندگی ہے۔ اور جسم و مادہ کی زندگی اپنی تابناکیوں کے باوجود عارضی رو بہ زوال اور فانی ہے۔ اس لیے وہی قومیں سطح ارض پر بقائے دوام کی نعمتوں سے بہرہ ور رہیں گی جو انبیا کی بتائی ہوئی ترقی کی راہ پر گامزن رہیں گی اور جسم و مادہ کے تقاضوں کے پہلو بہ پہلو، روح و باطن اور خیر و نیکی کے طریقوں کی پیروی کریں گی۔ جو اللہ کو مانیں گی، اس کے رسولؑ کو تسلیم کریں گی اور زندگی کا مقصد رضائے الٰہی کو قرار دیں گی۔ سرکش و نافرمان قومیں آخر آخر میں ماری جائیں گی۔

د م ر

دَمَرَ۔ تباہ ہونا۔ بغیر اجازت کے اندر آنا۔

هُوَ يَدْمُرُ اللَّيْلَ۔ رات بھر کلفت سے دوچار رہا۔ جاگتا رہا۔

دَمَّرَ۔ ہلاک کر ڈالا۔

دِمَارٌ - ہلاکت - فنا - بربادی -

قرآن حکیم میں ہے :-

دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ٥ (محمد : ١٠)

[اللہ نے انھیں ہلاک کر مارا اور کافرین کے لیے بھی ایسے معاملات ہونے کو ہیں]

گزشتہ قوموں کے سیاق میں مشرکین مکہ اور کفار کو بتایا ہے کہ جس طرح پہلی قومیں تکذیب وکبر کی وجہ سے عذاب الٰہی کا شکار ہوئیں، اسی طرح تمہارا انجام بھی ہونے والا ہے

دَمَّرَ - کبھی بغیر صلہ کے متعدی ہوتا ہے اور کبھی صلہ علی کے ساتھ۔

قرآن حکیم میں ہے :-

وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ ٥ (اعراف : ١٣٧)

[اور جو کچھ فرعون اور اس کی قوم نے تیار کیا تھا ہم نے ملیا میٹ کر دیا]

فرعون اور اس کی قوم نے مصر میں اونچی اونچی اور بلند بام عمارتیں تعمیر کر رکھی تھیں اور عیش کوشیوں کی خاطر مصر کو باغیچوں اور چمنستانوں کا شہر بنا دیا تھا، لیکن چونکہ اس نے حضرت موسیٰ کے پیغام حق کو جھٹلایا اور روح کو سنوارنے اور سجانے کی کوئی کوشش نہ کی، یہی منبع روح کے اندر جو دبستان پنہاں تھے ان کی شمیم آرائیوں سے استفادہ کی بھی کوئی صورت پیدا نہ ہونے دی، بلکہ الٹا انکار اور سرکشی پر اتر آیا اور خود خدا بن بیٹھا۔

دم ع

دَمَعَتِ الْعَيْنُ - آنکھ آنسوؤں سے تر ہوگئی -

لَهٗ عَيْنٌ دَامِعَةٌ - اس کی آنکھ آنسو بہانے والی ہے -

مَكَانٌ دَامِعٌ - ترجگہ جہاں نمی ہو -

امْرَاَةٌ دَامِعَةٌ - جو عورت فرط تاثر فوراً رو پڑے -

جَفْنَةٌ دَامِعَةٌ - لبالب بھرا ہوا قدح

شَجَّۃٌ دَامِعَۃٌ - ایسا زخم جس سے تھوڑا تھوڑا خون بہے۔
اَلدَّمْعُ - آنسو - اشک - بیک وقت اسم بھی ہے اور مصدر بھی۔
قرآن حکیم میں ہے :-
تَرٰٓی اَعْیُنَہُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ج (مائدہ: ۸۳)
[تو آپ ان کی آنکھیں دیکھیں گے کہ ان میں آنسو بہہ رہے ہیں اس لیے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا]

عیسائیوں میں اسی گروہ کا ذکر ہے جو درویش صفت اور حق پسند ہیں جن میں غرور اور گھمنڈ یا تعصب نام کو بھی نہیں۔ یہ چونکہ کتب الٰہیہ کے ماہر ہیں اور وحی و تنزیل کے تیور پہچانتے ہیں اس لیے جب قرآن حکیم کی آیات سنتے ہیں تو فرط تاثر سے اُن کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں، اس لیے کہ قرآن میں ان کو وہی حقیقت نکھرے ہوئے انداز میں دمکتی نظر آتی ہے جو تمام کتب سماویہ میں بیان کی گئی ہے۔

اس تاثر پذیری میں جہاں ان لوگوں کے علم کتب سماویہ کی ادا شناسی اور بے تعصبی کو دخل ہے وہاں یہ بات بھی شامل ہے کہ قرآن حکیم کا اسلوب بیان اس درجہ تاثر آفرین اور دل میں اُتر جانے والا ہے کہ کوئی بھی شخص جب اس کا مطالعہ کرے گا اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ وہ حق ہے، وہ صداقت ہے اور وہ سچائی ہے جس کا تعلق انسانی و بشری دائرۂ معرفت و ادراک سے نہیں اس کا تعلق براہِ راست آسمان سے ہے، وحی سے ہے اور اللہ کے کلام سے ہے۔

دم غ

دَمَغَ - مغلوب کرنا، چوٹ یا زخم کا بھیجے تک پہنچ جانا، شکست دینا، بھیجا نکال دینا۔
دَمَغَ رَأْسَہٗ - اس کے سر کو کچل ڈالا۔
دَمَغَ الْحَقُّ الْبَاطِلَ - حق نے باطل کا زور توڑ دیا۔ غالب آگیا۔

الدِّمَاغُ - بھیجا - جسم کا وہ حصّہ جو علم و ادراک کا مرکز ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :-

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ - (انبیآء: ۱۸)

[ہم تو حق کو باطل پر پھینک دیا کرتے ہیں۔ سو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے تو وہ دفعۃً مٹ جاتا ہے]

اس آیت میں اللہ کی سنت اور اسلوب مکافات کا ذکر ہے۔ حق و باطل جھوٹ اور سچ اور ظلم و انصاف میں قرنوں سے آویزش چلی آرہی ہے لیکن ہمیشہ حق کی فتح ہوتی ہے، سچ کا بول بالا ہوتا ہے اور عدل و انصاف کا آفتاب جب آفاق ذہن پر طلوع ہوتا ہے تو ظلم و تعدّی کے دل بادل ایک دم چھٹ جاتے ہیں اور حق کی روشنی چارسو پھیل کر رہتی ہے۔ تاریخ عالم کے اوراق پلٹ کر دیکھو۔ عقیدہ، فکر، تہذیب و ثقافت اور نظریات کی کتنی سچائیوں کو سرکشوں اور فرعونوں نے چھپا کر اور دبا کر رکھا لیکن آج جب انسان میں وقوف و علم نے انگڑائی لی ہے، کتنی ہی دبی اور کچلی ہوئی سچائیوں کو بغیر کسی تحفّظ کے تسلیم کر لیا گیا ہے۔

حق بجائے خود ایک قوّت ہے، ایک فعال اور متحرک حقیقت ہے، تھوڑے عرصے کے لیے بلاشبہ اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈالی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہ جب بیدار ہوتا ہے تو باطل اس طرح مٹ جاتا ہے جیسے کبھی اس کا وجود ہی نہ تھا یعنی دلیل اور قوت میں جب بھی باہم ٹھنے گی، دلیل کا غلبہ ہوگا اور قوت کا بھیجا پاش پاش ہو کر رہ جائے گا۔ کیونکہ اصل قوت دلیل کی ہے، برہان کی ہے، سچائی اور حق کی ہے، جو سرمدی اور دائمی ہے، جسے اپنا وجود بہر حال منوانا ہے اور اپنی حقانیت کو، تاریخ کی کروٹوں اور تاریخ کے صفحات میں ثبات و دوام کے رنگ میں ظاہر کرنا ہے،

اگر اللہ کی یہ سنت جاری نہ رہے تو کسی بھی دور میں سچائیاں نہ اُبھر سکیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ظلمتوں کے سائے منڈلاتے رہیں۔ کائنات کی سب سے بڑی سچائی اللہ کی توحید ہے اور یہ برابر نکھر رہی ہے۔

دم ی

دَمِیَ ۔ اَلْجُرْحُ ۔ زخم سے خون بہہ نکلا ۔ رِسا ۔

اَدْمیٰ ۔ خون نکالنا ۔

اَلدَّامِیْ ۔ جس کا خون بہہ رہا ہو ۔

اَلدَّمُ ۔ خون ۔ اصل دمیٌ تھا ۔

دَمُ الْاَخْوَیْنِ ۔ ایک دوا کا نام ۔

اَلدَّمْیَۃُ ۔ گڑیا ۔

شَجَّۃٌ دَامِیَۃٌ ۔ وہ زخم جس سے خون رِسے ۔

فُلَانٌ دَامِی الشَّفَّۃِ ۔ وہ پرلے درجے کا حریص ہے ۔

قرآن حکیم میں ہے :-

حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ وَالدَّمُ ۔ (المائدۃ : ۳)

(تم پر حرام کیے گئے ہیں مردار اور خون) ۔

یہاں جو خون حرام قرار دیا گیا ہے، وہ دم مسفوح ہے ۔ عربوں میں بعض زندہ جانوروں کا خون پی جاتے تھے ۔ قرآن نے اس کو اس کی طبی و روحانی مضرتوں کے علاوہ اس لیے حرام قرار دیا ہے کہ اس سے عہد توحش کی یاد تازہ ہوتی ہے ۔ یہ یاد رہے کہ یہاں خون پینا مراد ہے ۔ کسی مریض کے جسم میں خون داخل کرنا نہیں ۔

قرآن حکیم میں ہے :-

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ ۔ (البقرہ : ۸۴)

(اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ بہانا)

یہودیوں سے اللہ تعالیٰ نے ان کے نوشتوں میں اس امر کی تاکید کی تھی کہ آپس میں لڑنا جھگڑنا نہیں اور یہودیوں نے عہد کیا تھا کہ ہم باہمی امن و دوستی کے ساتھ رہیں گے اور کوئی فساد یا لڑائی جھگڑا بپا نہیں کریں گے لیکن ان کا حال یہ تھا کہ بنو نضیر اور

بنو قریظہ یہودیوں کے دو قبیلے جو مدینے کے قریب جا بسے آباد تھے، آپس میں ہمیشہ برسرِ پیکار رہتے اور ایک دوسرے کا خون بہانے میں کوئی دریغ نہ کرتے۔ اس آیت میں ان کو یہ عہد یاد دلایا گیا ہے۔

د ن ر

دِینَارٌ۔ ایک طلائی سکہ۔ جو عربوں میں بمنزلہ اشرفی کے رائج تھا۔
ثَوبٌ مُدَنَّرٌ۔ وہ کپڑا جو طلائی سکے کی طرح سرخ اور چمکدار ہو۔
کَلَّمتُہٗ فَتَدَنَّرَ وَجھُہٗ میں اس سے گفتگو کی تو اس کا چہرہ دینار کی طرح چمک اُٹھا۔

قرآن حکیم میں ہے:۔
وَمِنْھُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْہُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّہٖٓ اِلَیْکَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْہِ قَآئِمًا ط (آل عمران: ۷۴)

[اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تو اس کے پاس ایک دینار امانت رکھدے تو وہ تم کو واپس نہ کرے گا بجز اس صورت کے تو اس کے سر پر کھڑا رہے]

وہ قومیں جن میں فیاضی، فراخ دلی اور عالی ظرفی ہوتی ہے وہ دنیا میں خیر اور نیکی کو پھیلانے میں کوشاں رہتی ہیں اور وہ قومیں جو تنگ دل، تنگ ظرف اور سیم و زر کی محبت میں مبتلا ہوتی ہیں، اُن سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہاں یہودیوں کی اس قومی خصوصیت کا تذکرہ ہے کہ یہ پرلے درجے کے بددیانت، نادہندا اور بخیل ہیں۔ ایک دینار کیا چیز ہے۔ لیکن ان میں ایسے ایسے اشخاص بھی ہیں کہ اگر ان کو ایک دینار بطور قرض یا امانت کے دیا جائے تو اس کو بھی وہ آسانی سے لوٹانے والے نہیں۔

یہودیوں کا بخل اور کم ظرفی آج بھی، یعنی صدیاں بیت جانے کے بعد بھی بدستور ساری دنیا میں ضرب المثل ہے۔ بخل دراصل ایک ذہنی بیماری ہے جو ناقابلِ تقسیم ہے۔ اس لیے جو بخیل ہوتا ہے وہ ہر معاملے میں بخل کا اظہار کرتا ہے۔ حق کے اظہار میں

حق کی قبولیت و پذیرائی میں، اخلاق میں، عام میل جول میں، عقائد و کردار میں، عہد و میثاق کے احترام میں اور دوسروں کے ساتھ برتاؤ میں، یہی وجہ ہے یہودیوں میں سے عیسائیوں کے مقابلے میں بہت کم لوگوں کو یہ توفیق ہوئی کہ یہ اسلام ایسے فیاض مذہب کی حلقہ بگوشی اختیار کر سکیں، اس لیے کہ ان کا طبعی بخل اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ایسے دین کو قبول کریں جو اپنی ذات کو کم اہمیت دیتا ہے اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کو زیادہ اہم ٹھہراتا ہے۔

دن و

الدُّنُوّ۔ قرب چاہے ذات سے متعلق ہو چاہے زمان و مکان سے، حکم و منزلت بھی اس کے دائرۂ اطلاق میں داخل ہے۔

دَنَا مِنْهُ۔ اس کے قریب ہوا۔

دَخَلْتُ عَلَى الْأَمِيرِ فَرَحَّبَ بِي وَأَدْنَى مَجْلِسِي۔ میں امیر مملکت کے ہاں گیا۔ اُس نے میرا خیر مقدم کیا اور اپنا قرب بخشا۔

دَنِيَ۔ گھٹیا ہونا، کم درجے کا ہونا، خسیس ہونا۔

أَدْنَى إِدْنَاءً۔ عسرت کی زندگی بسر کرنا۔

أَدْنَى۔ قریب تر، زیادہ دنیٔ اور خسیس۔

الدُّنْيَا۔ موجودہ زندگی، آخرت کے مقابلے میں۔ قریب تر زندگی۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ۔ (روم : ۳)

[اہل روم ایک قریب کی زمین میں مغلوب ہو گئے۔]

قریب کی زمین سے مراد شام ہے جو حجاز کے قریب ہے، یہاں رُومی عیسائیوں اور ایرانی مجوسیوں کے درمیان معرکہ آئی ہوئی۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ (سجدہ: ۲۱)

[ہم انھیں قریب کا عذاب بھی علاوہ اس بڑے عذاب کے چکھا کر رہیں گے]

قریب کا عذاب وہ عذاب ہے جس کی اذیتیں کفّار دُنیا ہی میں بھگتیں گے۔

قرآن حکیم میں ہے:-

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً۔ (البقرہ: ۲۰۱)

[اے پروردگار ہمارے ہم کو دُنیا میں بھی بہتری دے اور آخرت میں بھی بہتری]

یہاں سیاق کی رُو سے دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے، ایک وہ لوگ ہیں جن کی ساری تگ و دو کا محور ادنیٰ خواہشات، ادنیٰ لذّتوں سے بہرہ یابی اور قریب کے فوائد کا حصول ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ آخرت کی شادکامیوں میں ان کا کوئی حصّہ نہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں جن کی سعی و کوشش کا مدار و محور یہ نقطۂ نظر ہوتا ہے کہ وہ دُنیا کی کامرانیوں میں بھی حصّہ لیں۔ اس کو بھی سنواریں، آگے بڑھائیں اور کائنات انسانی کے لیے اس کو زیادہ آسودہ، زیادہ مفید، زیادہ آرام دہ گہوارے کی شکل میں ڈھالیں اور اس کے ساتھ ساتھ آخرت کی جاوداں، رواں دواں روحانی زندگی کی زُلف و کاکل کو بھی زیادہ چمکانے، مستنیر کرنے اور یہاں رہ کر اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے قلب و رُوح کے اجالوں کا مزید اہتمام کرنے میں بھی برابر کوشاں رہیں۔ یہ دوسرا گروہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ صحیح اور زیادہ متوازن گروہ ہے، جو زندگی کے مبداء و مآل کو صحیح سمت کی طرف لے جانے کا ضامن ہے۔

رہبانیت اور اسلام میں دراصل یہی نقطہ افتراق ہے۔ رہبانیت جہاں دُنیا کو یکسر حقیر، ادنیٰ اور ناقابل اعتنا قرار دیتی ہے وہاں اسلام دنیا کو ایک درس گاہ ٹھہراتا ہے، جہاں رہ کر اور یہاں کی مسرتوں سے بہرہ مندی کے باوجود انسان اپنی رُوح و باطن کا اس انداز سے تزکیہ کر سکتا ہے کہ آخرت میں، قربِ الٰہی کی لذّتوں سے ہمکنار ہو سکے۔ اسلام جس دُنیا کی مذمت کرتا ہے، وہ یہ مستقر نہیں جہاں یہ رہا ہے بلکہ

وہ ذہن ہے جو ایمانی، اخلاقی اور تہذیبی اقدار سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے ادنیٰ تر فوائد کو اعلیٰ تر فوائد پر ترجیح دیتا ہے۔

قرب اور آسان فوائد کے لالچ میں مستقبل اور آخرت کے دائمی فوائد کو بھلا بیٹھتا ہے جن کے حصول کے لیے محنت و ریاضت درکار ہے۔ رُوح اگر پاکیزہ ہو اور دنیا کے حصول کے باوجود دل اس میں اگر اٹکا ہوا نہ ہو تو مردِ مومن اس دنیا میں بھی، اُن بہجت آفریں مناظر کی دید کا شرف حاصل کر سکتا ہے جن سے آخرت میں بہرہ یاب ہونا ہے۔ ایمان البتہ شرط ہے اور اس مے معرفت سے دل کے لبوں کا آشنا ہونا ضروری ہے جو سکر و صحو کے دوگونہ مزوں کی حامل ہو۔

د ھ ر

دَھْرٌ۔ کا اطلاق وقت کی اُن وسعتوں سے ہوتا ہے جو آغاز آفرینش سے انتہائے آفرینش تک پھیلی ہوئی ہیں۔ زمان کا اطلاق وقت پر ہوتا ہے جو قلیل بھی ہو سکتا ہے اور کثیر بھی۔

مَضیٰ عَلَیْہِ دَھْرٌ۔ اس پر ایک زمانہ گزر گیا۔

مَا ذَاکَ بِدَھْرِی۔ یہ میری عادت نہیں ہے۔

اَلدَّھْرِیّ۔ وہ شخص جو زمانے کو حیات و موت کے بارے میں مؤثر خیال کرتا ہو۔ دہریہ۔

اَلدُّھْرِیّ۔ جس کی عمر طویل ہو۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا ۝ (الدھر: ۱)

[بے شک انسان پر ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا]

یعنی یہ انسان جو آج دنیا میں اتراتا پھرتا ہے اور اپنے وجود پر اس قدر نازاں ہے کہ خدا کی حقیقت کو بھی نہیں سمجھتا، بلکہ اُلٹا اس کے ساتھ دوسروں کو شریک گردانتا ہے۔

یہ نہیں سوچتا کہ ہم نے شکم مادر میں اس کی تخلیق و آفرینش کی طرح ڈالی اور مراحل اس قابل ٹھہرایا کہ انسان کے قالب میں ڈھل سکے ورنہ اس پر ایسا وقت بھی گزرا ہے جب یہ کوئی قابل ذکر شئ نہ تھا۔ یہاں دہر سے مراد مطلق زمانہ ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :-

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ (جاثیہ : ۲۴)

[یہ لوگ کہتے ہیں کہ بجز ہماری اس دنیوی حیات کے اور کوئی حیات نہیں ہم اس میں ایک ہی بار مرتے ہیں اور ایک ہی بار زندگی پاتے ہیں اور ہم کو صرف زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے]۔

مشرکین عرب میں کچھ لوگ اس عقیدے کے حامی تھے کہ اس کارگاہِ موت و حیات کا تعلق صرف زمانے کے تصرفات سے ہے۔ یہی زمانہ ہمیں زندہ رکھتا ہے اور اسی کی کروٹیں ہمیں موت سے ہمکنار کرتی ہیں اور پھر جب ہم اس زمانے کی اثراندازیوں کی بدولت موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں تو دوبارہ جی اُٹھنے کا امکان نہیں۔ اس لیے ہمیں اپنی شادمانیوں اور مسرتوں کا مرکز و محور اسی دنیوی زندگی کو ہی ٹھہرانا چاہیے، اور اخروی زندگی کی اُمیدیں موہوم ہیں۔ دنیا کی نشاط آفرینیوں سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھنا چاہیے جو بہر حال ہماری دسترس میں ہیں۔

دہریت اور مادیت کا موجودہ تصوّر بہت پُرانا ہے اور عرب کے غیر فلسفی، شعرا اور دانشور بھی نہ صرف اس سے آگاہ تھے بلکہ اس کے قائل بھی تھے۔ زندگی کے بارے میں قرآن اور تمام مقدس صحائف کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ فنا ہونے والی چیز نہیں۔ بلکہ یہ ایک رواں دواں حقیقت ہے جسے ابھی اور سنورنا اور آگے بڑھ کر وسیع تر میدانوں میں داخل ہونا ہے، اور اپنے مقصد اور غرض و غایت سے، یعنی تکمیل حیات کی چوٹی کو سر کرنا ہے، موت عارضی ہے اور یہ صرف جسم و بدن کی ترتیب و ساخت پر اثرانداز ہوتی ہے۔ جوہر حیات، انسانی تشخص اور نفس ذات پر نہیں کہ

یہ دائمی، ابدی اور متحرک ہے، جسے اپنی منزل ابھی پانا ہے۔ "دہر" بجائے خود کوئی چیز نہیں، یہ تو محض اس فعّال ازلیت کی کارفرمائیوں کا ایک پیمانہ ہے جو اس کائنات میں جاری وساری ہیں۔ اس فعال ازلیت کے اس خلاق کائنات اور اس عالم رنگ و بُو کے پروردگار کی یہ کارفرمائیاں کسی منزل پر رُک جائیں گی اور زندگی اگلی منزلوں میں داخل نہیں ہو پائے گی، اس پر کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ اسی بنا۔ پر اس نوع کی خیال آفرینیوں کو قرآن نے محض ظن، تخمین اور اٹکل سے تعبیر کیا ہے۔

دائمی موت کے تصوّر کو صرف اس صورت میں حق بجانب ٹھہرانا ممکن ہے جب کائنات کی آفرینش صرف قوانین فطرت کی مرہونِ منّت ہو۔ لیکن ایسی صورت میں ایک منظّم، شعوری زندگی اور مرتب و منظم عالم کیونکر وجود میں آسکتا ہے یعنی اندھی بہری قوتیں اور بے رحم قوانین اس دبستان عالم کی تخلیق پر کیونکر قادر ہوسکتے ہیں، جس کا ذرّہ ذرّہ شعور، حکمت اور دانش کا پرتو ہے اور اس کی شمیم آرائیوں پر دلالت کناں ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر زندگی کی نشاط آفرینیوں کو خدائے علیم وحکیم نے پیدا کیا ہے تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ زندگی اپنی منزل کو پائے بغیر اپنی تکمیل کیے بنا ختم ہو جائے اور مطلق آگے نہ بڑھے۔

مختصر لفظوں میں موت وحیات کا قصہ صرف اتنا ہی ہے کہ پہلے ہم ایک ایسے کرّے میں آباد تھے، جہاں تضادات، موانع اور عوائق کا بسیرا تھا۔ یہاں رہ کر اگر ہم نے ان تضادات پر قابو پا لیا اور اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی سیدھی راہ پر چلے تو موت کے بعد ہم ایک ایسے کرۂ حیات میں منتقل ہو جائیں گے جہاں یہ جھگڑے اور جھمیلے پائے نہیں جاتے۔ جہاں ہماری رُوح کو وہ آشیانہ ملے گا جس میں نہ صرف بے حد وحساب آسودگی اور راحت میسّر ہوگی بلکہ رُوح کی اُڑانیں رضائے الٰہی کی فضاؤں میں افق تا بہ افق بلند تر اور فائق تر ہوتی جائے گی۔ مزید برآں اس کو یہاں صحیح رفاقت ملے گی۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ

فِیْ عِبٰدِیْ ۙ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (الفجر: ۲۷-۳۰)

[اے اطمینان والی رُوح تو اپنے پروردگار کی طرف چل خوش ہوتی ہوئی اور خوش کرتی ہوئی، پھر میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں جا داخل ہو۔]

یُوں بھی عقیدۂ آخرت کو ماننے سے ذمہ داری، محاسبہ اور کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کا جذبہ اُبھرتا ہے اور زندگی نسبتاً صاف ستھری اور پاکیزہ ولطیف ہو جاتی ہے اور اُمید کے چراغ دل میں بُجھنے نہیں پاتے، اور انکارِ آخرت سے عیش و عشرت اور یاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

د ہ ق

دَهَقَ۔ قدح بھرنا۔ پانی کو گرانا۔

اَلدِّهَاقُ۔ لبالب بھرا ہوا کاسہ، چھلکتا ہوا پیالہ۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا ۙ وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ۙ وَّ كَاْسًا دِهَاقًا ؕ (النبا: ۳۲-۳۴)

[یعنی باغ ہیں اور انگور اور ہم عمر عورتیں اور لبالب جام ہے]۔

یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کریں گے وہ ان تمام لذتوں سے بہرہ مند ہوں گے جو ان کو دنیا میں حاصل ہیں۔ حسین و سرسبز باغ، انگور اور میوے اور جواں سال ہم عمر شائستہ بیویاں۔ لیکن یہ جنّت کا ایک مقام ہے، اس سے اعلیٰ، بلند تر اور فائق مقام رضائے الٰہی کا حصول ہے اور یہ شئے جنّت کی حسّی لذّات سے کہیں بڑھ کر ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ (توبہ: ۷۲)

[اور اللہ کی رضامندی سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے]

فہم و فکر کا ایک انداز یہ ہے کہ جس کو صوفیا نے اختیار کیا ہے۔ جنّت کسی مقام سے تعبیر نہیں، اس کا تعلق

دراصل احوال وسلوک رُوح سے ہے، وہاں اللہ کے اطاعت شعار بندے جس احوال مسرّت اور کوائف سرور سے متمتع ہوں گے، ان کو بجز رموز او رحسّی اصطلاحوں کے اس دنیا میں کسی اور طریق سے سمجھا نہیں جا سکتا کیونکہ وہاں ایک نیا تولد اور بالکل نئی زندگی ہوگی اور اللہ کے سوا کون جانتا ہے کہ انسان وہاں کن کن خوشیوں اور مسرّتوں سے دوچار ہوگا۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ج (السجدہ ۱۷:۵)

[سوکسی کو علم نہیں جو سامان آنکھوں کی ٹھنڈک کا اُن کے لیے خزانۂ غیب میں ہے]

دھم

الدُّھمۃ۔ تاریکی، سیاہی۔ وہ سبز رنگ جو اپنے کمال کو پہنچ کر قدرے سیاہی مائل ہو جائے۔

اِدْھَامَّتِ الرَّوضُ۔ باغ سرسبز و شاداب ہو گیا۔

دَھَمَہُ الاَمرُ۔ اسے اچانک ایک معاملے کا سامنا کرنا پڑا۔

دَھَّمَتِ النَّارُ القِدْرَ۔ آگ نے ہانڈی سیاہ کر دیا۔

اِدْھَمَّ الفرس۔ گھوڑا سیاہ رنگ کا ہو گیا۔

حدیقۃٌ مُدْھَامَّۃٌ۔ سرسبز باغ۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ج فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ لا مُدْهَآمَّتٰنِ ج

(رحمٰن: ۶۳-۶۴)

[اور ان باغوں میں کم درجے کے دو اور باغ ہیں سو تم دونوں پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ دونوں باغ گہرے سبز رنگ کے ہوں گے]۔

جنّت جسم و روح کے شاداب باغوں کی دنیا ہے، مسرّتوں اور شادمانیوں کی دنیا ہے۔ اس آیت میں ان باغوں کی مزید تشریح یہ ہے کہ یہ باغ اتنے شاداب اور سرسبز

ہوں گے کہ گویا حد کمال کو پہنچ گئے ہیں۔ عرب زیادہ گہرے سبز رنگ کو سیاہی سے تعبیر کرتے تھے۔ اسی بناء پر انھیں "مُدْھَامَّتَانِ" کہا گیا ہے۔ یعنی اس درجہ سبز کہ ان پر سیاہی کا گمان ہو۔ کو الف حقیقت کی لفظ "دھق" میں تشریح گزر چکی ہے۔

سورہ رحمٰن میں تثنیہ کی بار بار تکرار نے اس کی ہر آیت میں ایک طرح کی شعری نغمگی پیدا کر دی ہے جو بلاغت کی جان ہے۔ یعنی جنتان کے ساتھ شادابی کے لیے مُدْھَامَّتَانِ کا ایسا لفظ قرآن نے چنا جو سبزی کا اظہار بھی کرتا ہے اور وزن وسجع کے آہنگ کو بھی قائم رکھتا ہے۔

یہ پوری سورۃ شعری نثر کی بہترین آئینہ دار ہے۔

دھن

دَھَنَ ۔ تیل ملا ۔ دَھَنَ الْمَطَرُ الْاَرْضَ ۔ اتنی بارش ہوئی کہ زمین بھیگ گئی۔
اَدْھَنَ فِی الْاَمْرِ ۔ نفس معاملے میں مداہنت کی۔ تصنع کا اظہار کیا۔
نَاقَۃٌ دَھِیْنٌ ۔ وہ اونٹنی جو کم دودھ دے، ٹرخا دے۔
دَھَنَہٗ بِالْعَصَا ۔ لاٹھی سے اس کی خبر لی، اُسے لاٹھی سے پیٹا۔
دَاھَنَ ۔ ضمیر باطن کے خلاف بات کی۔
الدِّھَانُ ۔ سرخ چمڑا۔
اَلدَّھْنَاءُ ۔ بیابان۔
قرآن حکیم میں ہے :۔

وَشَجَرَۃً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَیْنَاءَ تَنْبُتُ بِالدُّھْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰکِلِیْنَ ○ (مؤمنون : ۲۰)

[اور ایک اور درخت بھی پیدا کیا جو طور سینا میں پیدا ہوتا ہے، وہ اُگتا ہے تیل لیے ہوئے اور کھانے والوں کے لیئے سالن لیے ہوئے]

یہاں زیتون کا درخت مقصود ہے جو تیل اور خوراک کا بیک وقت پیدا کرنے

والا ہے۔ اس سے قبل کی آیات میں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تذکرہ ہے۔ اس میں جو بات انسان کے ذہن نشین کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ وہ انعامات کی اس گوناگونی کو دیکھیں، اس منعم اور محسن کی طرف اپنی عنانِ فکر و توجہ کو موڑیں جس نے انسان کو زمین پر بسانے سے پہلے انسان کی زندگی کے تمام لوازم مہیا کیے۔ یہ کیا حماقت ہے کہ محسن ہستی کو چھوڑ کر تم دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاؤ، اُن کے سامنے جھکو، اور ان کی پوجا اور پرستش سے احسان فراموشی کا ثبوت دو۔

قرآن حکیم میں ہے:-

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ - (القلم: ۹)

[تو آپ تکذیب کرنے والوں کا کہنا نہ مانیے۔ یہ لوگ تو یہی چاہتے ہیں کہ آپ ڈھیلے پڑ جائیں تو یہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں]۔

سرکشانِ قریش نے جب دیکھا کہ اسلام کی روشنی پھیلتی چلی جا رہی ہے اور ہماری طاقت و قوت اور مخالفت کے شدید مظاہروں کے باوجود اس کے اثر و رسوخ کی رفتار میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوئی تو انہوں نے نرمی، چاپلوسی اور مکر کا دوسرا پینترا بدلا اور یہ پیش کش کی کہ کچھ آپ اپنے مسلک سے ہٹیں اور ہم کچھ اپنی مخالفت میں نرمی روا رکھیں گے۔ اس طرح گویا ہمارے مابین ایک طرح کی مفاہمت ہو جائے گی اور ہم دونوں اطمینان سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ ہر دور کے سرکشوں کی یہ چال اور تدبیر ہوتی ہے کہ ہم میں اور ہمارے مخالفین میں کسی طرح مصالحت ہو جائے۔ لیکن حق و باطل، سچ اور جھوٹ، نیکی اور بدی، توحید اور شرک میں بھلا کوئی نقطۂ اتصال ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں فریق اس پر جمع ہو جائیں۔ یہاں بظاہر حکم ہے کہ آپ ایسا نہ کیجیے لیکن یہ حکم دراصل خبر کے معنوں میں ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے کہ پیغمبر کو تو بہر حال اللہ کی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:-

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ (الحجر: ۹۴)
[آپ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے اُسے صاف سُنا دیجیے اور مشرکین کی پروانہ کیجیے]

دھی

دَھِیَ - چالاک و زیرک ہونا۔
رَجُلٌ دَاھِیَۃٌ - چالاک اور گھاگھ آدمی۔
اَلدَّاھِیَۃ - مصیبت، آفت، بپتا، کوئی اہم آفت یا امرِ عظیم جس سے اچانک انسان دوچار ہو۔
دَوَاھِی الزَّمَان - زمانے کے حوادث، تغیّرات۔

قرآن حکیم میں ہے:-
بَلِ السَّاعَۃُ مَوْعِدُھُمْ وَالسَّاعَۃُ اَدْھٰی وَاَمَرُّ ٥ (قمر: ۴۶)
[اور قیامت بڑی سخت اور ناگوار چیز ہے]
کفّارِ مکّہ سے تخاطب ہے کہ تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ تمھیں مسلمانوں کے مقابلے میں کامیابی ہوگی تو یہ تمھارا وہم ہے، پچھلی قوموں کو دیکھو، فرعون سے بڑھ کر کون طاقتور تھا، اُسے ہزیمت ہوئی اور اسرائیلی جیت گئے۔ تمھارا حشر بھی بعینہٖ یہی ہونے والا ہے، تمھیں عظیم شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس کے علاوہ اصل سزا تمھاری سرکشی کی جو تمھیں ملے گی، وہ تو قیامت کے روز ملے گی اور وہ دن تمھارے لیے انتہا درجے کی تلخیاں، اذیتیں اور تکلیفیں لیے ہوئے ہوگا۔ پھر اس کے بارے میں بھی تم نے سوچا ہے اِس دنیا کی شکست تو تم کسی نہ کسی طرح سہار لوگے، لیکن اس دن کی ہولناکیاں، تم کیونکر برداشت کرسکوگے، وہ دن تمھارے لیے بہت سخت، بہت ناگوار اور انتہائی اذیت ناک ہوگا، اس لیے کہ اس دن تمھاری بداعمالیاں کھُل کر تمھارے سامنے آجائیں گی تو تمھارا کوئی دیوتا، کوئی پروہت اور شفیع تمھارے کام نہیں آسکے گا۔

دور

دَارَ ۔ گھومنا، چکر کھانا، اُلٹنا پلٹنا۔

دَارَ حَوْلَہٗ ۔ اس کے گرد گھومے۔

دَارَ الْقَمَرُ ۔ چاند متغیر ہوا۔

دَارَتْ بِہٖ دَوَائِرُ الزَّمَانِ ۔ اس کو حوادث زمانہ نے گھیر لیا۔

دَارَ الْفَلَکُ فِیْ مَدَارِہٖ ۔ آسمان اپنے مدار میں گھوما۔

دَارٌ ۔ گھر، قبیلہ، مقام کہا جاتا ہے، مؤنث ہے۔

مَافِیْ بَنِیْ فُلَانٍ اَفْضَلُ مِنْ دُوْرِ قَوْمِکَ ۔ بنی فلاں میں کوئی بھی تمھارے قبیلے سے بہتر نہیں ہے۔

دَوَّرَ ۔ گھر بنانا۔

اِسْتَدَارَ ۔ گھوما۔

اَلدَّائِرَۃُ ۔ محیط، جو کسی چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہو، حلقہ، گھیرا، جمع کی صورت میں، زمانے کی گردشیں۔

دَیَّارٌ ۔ گھر کا مکین۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

وَاَوْرَثَکُمْ اَرْضَھُمْ وَ دِیَارَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ (احزاب: ۲۷)

[اور تمھیں مالک بنا دیا، اُن کی زمین کا، اُن کے گھروں کا اور اُن کے مال کا]

مراد یہودی ہیں۔ یعنی یہ دینِ حق کے اعجاز کا کرشمہ ہے۔ اللہ نے اس کی بدولت یہودیوں کے بڑے بڑے قلعوں کا مالک بنا دیا اور تمھیں اُن کے مقابلے میں کامرانی عطا کی۔ دِیار، لفظ دار کی جمع ہے، دار کا لفظ مقام کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ جیسے دار السلام، دار البوار، دار الآخرۃ وغیرہ۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

یَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ عَلَیْھِمْ دَآئِرَۃُ السَّوْءِ (توبہ: ۹۸)

[اور تمھارے لیے گردشوں کا منتظر رہتا ہے، بڑی گردش صرف انہی کے لیے ہے]

منافقین سے متعلق ہے کہ اگرچہ صلوٰۃ و زکوٰۃ پابندی سے ادا کرتے ہیں، تاہم محض دکھاوے کے طور پر دل میں مسلمانوں کے لیے بغض رکھتے ہیں اور یہ تمنّا رکھتے ہیں کہ کاش مسلمانوں پر گردش زمانہ سے کوئی مصیبت آن پڑے۔ فرمایا کہ تمھاری یہ آرزو پورے ہونے والی نہیں۔ بلکہ حصانت کا دائرہ یا گھیرا اور احاطہ تمھیں ہی اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :-

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا - (نوح : ۲۶)

[اے میرے پروردگار ! زمین پر کافروں میں سے ایک باشندہ بھی جیتا نہ چھوڑ]

حضرت نوحؑ نے جب طویل عمر تک قوم کو توحید کا پیغام سنایا اور وہ بجائے سُدھرنے کے روز بروز اور بگڑتی گئی، تو پھر اللہ کا قانون بقائے اصلح اور فنائے فاسد حرکت میں آیا اور اس قوم کو طوفان نے آگھیرا، اور یہ حرف غلط کی طرح ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ حضرت نوحؑ کو اس بددُعا سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اس قوم میں زندہ رہنے، حق کو قبول کرنے اور خدائے واحد کو پہچاننے کے لچھن باقی نہیں رہے اس لیے آئندہ نسلوں کی اصلاح کے لیے ان کا مٹ جانا ہی بہتر ہے تاکہ آئندہ جو انسان باقی رہیں وہ ان کے تعصّبات اور مشرکیہ توہمات سے محفوظ رہیں۔

یہاں یہ نقطہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ پیغمبر کا اللہ تعالیٰ سے اس نوعیت کا تعلق ہوتا ہے کہ فطرت اور پیغمبر میں دوئی اور بیگانگی نہیں رہتی۔ پیغمبر وہی کچھ چاہتا ہے جو فطرت چاہتی ہے اور فطرت کے قوانین چاہتے ہیں اس لیے پیغمبر کی دعا، بددعا، اس کے معجزات و خوارق عین قانون فطرت کے مطابق ہوتے ہیں۔ فطرت اور نبوت میں ایک طرح کا روحانی تطابق اور توافق ہمیشہ قائم رہتا ہے اور اسی روحانی توافق کی وجہ سے وہ چیزیں ظہور میں آتی ہیں جو بظاہر محال نظر آتی ہیں اسی لیے اس کی دُعا اور اس کی بددُعا عین اس وقت رونما ہوتی ہے جب خود فطرت کا قانون بقائے اصلح فنائے فاسد

حرکت پذیر ہوتا ہے۔

دول

اَلدَّوْلَۃُ ۔ مال و دولت کا مختلف ہاتھوں میں اُلٹ پلٹ کر پہنچنا کبھی کسی کے ہاتھ میں، کبھی کسی کے ہاتھ میں۔

اَلدُّوْلَۃ ۔ اقتدار کا اُلٹ پلٹ کر مختلف ہاتھوں میں پہنچنا۔

دَالَ ۔ ایک کیفیت سے دوسری کیفیت اختیار کرنا۔

دَالَتْ لَہٗ الدَّوْلَۃ ۔ دولت اس کے ہاتھوں سے نکل کر دوسروں کے ہاں پہنچ گئی۔

دَاوَلَ الاَیَّامَ ۔ دنوں کو اُلٹ پلٹ دیا۔

اَلدَّالَۃُ ۔ شہرت۔

اَلاِدالۃ ۔ غلبہ

تَدَاوَلُوا ۔ باری باری لیا، ہاتھوں ہاتھ لینا۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ج (آل عمران : ۱۴۰)

[ہم ان ایام کی اُلٹ پھیر تو لوگوں کے درمیان کرتے ہی رہتے ہیں]

مشرکین مکّہ سے خطاب ہے کہ تم جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی شکست سے اس درجہ شاداں و فرحاں کیوں ہو۔ کیا غزوہ بدر میں تمھیں شکست نہیں ہوئی۔ تاریخ کی اُلٹ پھیر اور فتح و شکست، معیارِ حق و صداقت نہیں۔ یہ تو قوموں میں ہوتا آیا ہے کہ آج ایک قوم کا طوطی بول رہا ہے، کل دوسری قوم فتح و نصرت کے پھریرے لہرا رہی ہے۔ دینِ حق کا معیار، یہ عارضی ردّ و بدل نہیں، بلکہ یہ ہے کہ کیا اس کا پیغام، اس کا دین، اس کا اسلوبِ حیات اور اس کے ایمانیات عقل و دانش کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں یا نہیں۔ یہ فتح و شکست عارضی کرشمے ہیں، بالآخر حق ہی کا بول بالا ہوگا،

حق ہی اُبھرے گا، پھیلے گا اور دائمی فتح سے ہمکنار رہو گا۔ چنانچہ ان مشرکین نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اسلام چار دانگ عالم میں فتح و نصرت کے پرچم لہراتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

د ی ن

اَلدَّیْنُ - قرض - جمع دُیُونٌ

دَانَ - مالک ہونا، غلام بنانا

دَانَ الرَّجُلُ - عزیز ہونا، ذلیل ہونا، دین و ملّت میں داخل ہونا۔

دَایَنَ - قرض کا معاملہ کرنا۔

تَدَایَنَ - ایک دوسرے سے قرض لینا۔

اَلدِّیَانَۃُ - اخلاص، دینداری۔

دَیَّانٌ - قاضی۔

دِینٌ - اطاعت، جزا، اسلوبِ حیات، شریعت، ملّت۔

قرآن حکیم میں ہے :-

اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ (البقرہ: ۲۸۲)

[اور جب اُدھار کا معاملہ کرو کسی مدّت معیّن کے لیے تو اُسے لکھ لیا کرو۔]

غرض یہ ہے کہ اُدھار کا معاملہ صاف اور متعین ہونا چاہیے اور ضبط تحریر میں لے آنا چاہیے تاکہ بعد میں جھگڑے نہ اُٹھ کھڑے ہوں۔

قرآن حکیم میں ہے :-

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ قف (آل عمران: ۱۹)

[یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے]

یعنی وہ اسلوبِ حیات جو روح و جسد اور دین و دُنیا کے تمام تقاضوں کی تکمیل کرنے والا ہے تو وہ اسلام ہی ہے، کوئی دوسرا انداز حیات نہیں۔

قرآن حکیم میں ہے :-

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (البقرۃ: ۲۵۹)

(دین میں زبردستی نہیں)۔

یہاں دین سے مراد دین اور اطاعتِ دین ہے۔ یعنی کسی شخص کو حق کی پیروی یا اختیار پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، حق اور گمراہی کے راستے جُدا جُدا ہیں اور دونوں واضح ہیں، جو چاہے اسلام لا کر اپنے لیے سعادت و برکت کو اپنے دامن میں سمیٹ لے اور جو چاہے کفر اور گمراہی کو اختیار کر کے اپنی عقبیٰ اور دُنیا دونوں کو تباہ کر لے۔

قرآن حکیم میں ہے :-

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ج (آل عمران: ۸۵)

[اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہو گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا]

علم اور روشنی کے چار دریچے ہیں :-

۱۔ مطالعہ فطرت

۲۔ مطالعہ تاریخ

۳۔ نفس کی پہنائیوں کا ادراک

۴۔ کتبِ مقدسہ یا سابق انبیاء کی تعلیمات۔

اسلام نے عرفان و ادراک کے ان چار دریچوں کو کھلا رکھا ہے، جہاں تک مطالعہ فطرت کا تعلق ہے قرآن حکیم میں اس کے بارے میں اس درجہ تاکید آئی ہے کہ کوئی آسمانی کتاب اس باب میں اس کی سہیم و شریک نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے بار بار نظر و فکر کی عنانِ توجہ کو اس طرف منعطف کیا ہے کہ زمین و آسمان، لیل و نہار اور کائنات کے ہر مظہر سے متعلق تدبیر و تفکر کو کام میں لاؤ۔ سوچو، غور کرو اور دیکھو کہ وہ کون قوانین ہیں جو ان کو ایک سلک میں منسلک کیے ہوئے ہیں، ان کا پیدا کرنے والا کون ہے اور کس حد تک ان کو نوعِ انسانی کی بہبود و فلاح کی خاطر بدلا اور تابع فرمان کیا جا سکتا ہے۔

قرآن نے بار بار اس امر پر بھی انسان کو آمادہ کیا ہے کہ وہ قوموں کے عروج و زوال

کے اسباب کا تجزیہ کرے اور دیکھے کہ ان کا اخلاق کن اخلاقی و رُوحانی اقدار پر مبنی ہے۔ بقا کا فلسفہ کیا ہے اور فنا کے اسباب کیا ہیں۔ قرآن نے تزکیہ نفس کے حدود کی بھی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کی اطاعت، محبّت اور تعلق سے دل معرفت و ادراک کے کن لامحدود خزائن پر مطلع ہوسکتا ہے۔ نیز کیونکر سطح بشری سے اُونچا اُٹھ کر ان آفاق کو چھو سکتا ہے جن کا عالم لاہوت سے قریبی رابطہ ہے۔

قرآن نے اس علم و دانش کی پہنائیوں کا بھی احاطہ کر رکھا ہے جس سے تمام انبیا، مصلحین اور راہنماؤں کو مختلف زمانوں میں نوازا گیا، اس میں کتب مقدّسہ اور صحائف انبیا کے علوم و معارف کا عطر اور نچوڑ اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ اس کو مان لینے کے بعد کسی اور کتاب کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

اِس کے علاوہ اسلام میں اور بھی اتنا کچھ ہے جو اُن تمام توقعات اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے کفایت کرتا ہے جو آئندہ ترقی یافتہ اور مہذب انسان سوچ سکتا ہے۔ اس میں عدل و انصاف کی تلقین ہے۔ مساوات و اخوتِ انسانی کا پیغام ہے۔ فرد و جماعت کی مشکلات کا حل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دُنیا کی سب سے بڑی سچائی، وجود باری کے انوار و تجلیات کے جذب و انعکاس کا طریق بھی اسلام ہی نے صحیح معنوں میں سُنایا اور سمجھایا ہے جو تصوّف و الٰہیات کی جان ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر اگر کوئی بدقسمت ایسے جامع الصفات دین کو چھوڑ کر کسی اور دین کو اپناتا ہے تو وہ نہ عند اللہ پذیرائی کے لائق ہوگا اور نہ آئندہ دنیائے انسانیت اسے ماننے پر آمادہ ہوگی۔ بشرطیکہ اسے معلوم ہو کہ اسلام کن کن صداقتوں اور سچائیوں کا حامل ہے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ

۲- کلب روڈ لاہور